"فضل الباری فی درس البخاری" مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات کا مجموعہ ہے۔ جسے ان کے تلمیذ خاص حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ نے جمع فرمایا... کتاب کی اہمیت اور افادیت کے لیے صاحب افادات کا اسم گرامی اور ان کی نسبت ہی کافی ہے۔

حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مدظلہم
مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

برصغیر میں بخاری شریف کے دروس مختلف ناموں سے شائع ہوئے ہیں، اسی سلسلے کی ایک کڑی زیر نظر کتاب عارف باللہ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب شروانی جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات وافاضات مسمّی بہ "فضل الباری فی دروس البخاری" ہے جسے حضرت مولانا حافظ قاری مفتی نصیر احمد صاحب اوریس پوری رحمۃ اللہ علیہ (سابق صدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد) نے مرتب کیا تھا اور صاحب درس ہی کے زمانہ میں شائع ہوئے تھے۔

اب جدید اشاعت کے لیے کچھ دوسرے علماء نے تخریج اور حواشی مفیدہ پر کام کیا ہے۔

مرشد العلماء حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب آدام اللہ فیوضہم
شیخ الحدیث وسابق صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات

بخاری شریف از ابتدا تا کتاب الایمان کا درس حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ سے متعلق ہوتا تھا، والد صاحب مرحوم نے باوجود حضرت مسیح الامتؒ سے تلمذ وتعلم کے، مفتاح العلوم جلال آباد میں مدرس ومفتی ہونے کے بعد باقاعدہ حضرت والاؒ کے درس میں شرکت کر کے آپ کے ۱۳۸۲ھ، ۱۳۸۳ھ کے دروس کے انضباط وترتیب کا کارنامہ انجام دیا، اولاً آپ درس کو ضبط کرتے پھر حضرت والا کے ملاحظہ سے گذارتے، اس طرح آپ نے دروسِ بخاری کو "فضل الباری" کے نام سے ترتیب دے کر غائبین اور مابعد کے لوگوں کے لیے کتابی شکل میں ایک یادگار تحفہ دیا۔

حضرت مولانا محمد کامل صاحب اوریس پوری مدت فیوضہم
(فرزند ارجمند حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحبؒ)



فضل الباری
فی
درس البخاری

جلد اوّل

افادات: مسیح الامت حضرت اقدس مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ
خلیفہ اجل حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

مرتب: مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ

تخریج وتعلیق زیر سرپرستی: حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم



ناشر

مدینہ اکیڈمی، ڈیوزبری، انگلینڈ
ادارہ فیض مسیح الامت بڑوت، باغپت، یوپی، الہند

اضافہ شدہ جدید ایڈیشن

فضل الباری
فی
درس البخاری

جلد اوّل

افادات
مسیح الامت حضرت اقدس مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ
خلیفۂ اجل حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

مرتّب
مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ
تلمیذ خاص حضرت مسیح الامتؒ و سابق استاذ حدیث و فقہ و صدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد

تخریج و تعلیق زیر سرپرستی
حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم
خلیفۂ مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادیؒ

ناشر

مدینہ اکیڈمی، ڈیوزبری، انگلینڈ
ادارہ فیض مسیح الامتؒ بڑوت، باغپت، یوپی، الہند

تفصیلات

کتاب کانام	:	**فضل الباري في درس البخاري جلد اول**
صاحب افادات	:	مسیح الامت حضرت اقدس مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ
مرتب	:	مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ

جدید ایڈیشن مع تخریج وتعلیق

زیر سرپرستی	:	حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم (باٹلی، انگلینڈ)
تخریج وتعلیق	:	مولانا عظیم الدین صاحب ارنالوی
معاونت ومراجعت	:	مولانا خلیل احمد قاضی صاحب (ڈیوزبری، انگلینڈ)
مساعی جمیلہ ونظر آخر	:	مولانا محمد کلیم نعمانی قاسمی (نواسۂ حضرت مفکر ملتؒ)
سن اشاعت جدید	:	۱۴۴۳ھ مطابق ۲۰۲۲ء
صفحات	:	

ملنے کے پتے

(۱) مدینہ اکیڈمی، ڈیوزبری، انگلینڈ

Madina Academy, Swindon Road, Dewsbury, West Yorkshire,
WF13 2PA, England
Tel: 00 44 7852 762 632 / Website: madinaacademy.org.uk

(۲) ادارہ فیض مسیح الامت، بڑوت باغپت، انڈیا

Tel: 0091 70789 18086

(۳) قاری عبد الحق دیوان صاحب لاجپور، ضلع: سورت، گجرات، انڈیا

Tel: 0091 73837 03789

دیوبند کے سبھی بڑے کتب خانے

فہرست مضامین

ابتدائیہ

دروسِ بخاری

کلمات عالیہ

امیر ملت نمونۂ اسلاف حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب زید مجدہم

مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

''فضل الباری فی درس البخاری''مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات کا مجموعہ ہے۔ جسے ان کے تلمیذ خاص حضرت مولانا مفتی نصیراحمد صاحب نوراللہ مرقدہ نے جمع فرمایا۔ اس وقت میرے پیش نظر اس کی دو جلدیں ہیں جلد اوّل ''**باب كيف كان بدأ الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم**'' کی چند احادیث کی تشریح پر مشتمل ہے۔اورجلدرابع میں بخاری شریف کی آخری حدیث کی تشریح سے متعلق تفصیلی گفتگو ہے۔ یہ واضح نہیں ہوسکا کہ درمیان کی دو (دوسری اور تیسری) جلدوں میں کہاں تک کے ابواب شامل کیے گئے ہیں۔

چاروں جلدیں حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں شایع ہوچکی تھیں۔ اب حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم کے تحشیہ وتعلیق کے ساتھ جدید ایڈیشن کی تیاری ہے۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کے لیے صاحب افادات کا اسم گرامی اوران کی نسبت ہی کافی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علمی خدمت کوقبول فرمائے اورحضرات علماء کرام اورطلبہ عزیز کواس سے کماحقہ استفادہ کی توفیق بخشے۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہٗ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۶/۱۱/۱۴۴۲ھ=۲۸/۶/۲۰۲۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فضل الباری فی درس البخاری

جدید ایڈیشن مع تخریج وتعلیق

تقدیم

حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم

خلیفہ حضرت مسیح الامت نور اللہ مرقدہ

حامداً و مصلیاً و مسلماً ! اما بعد.

مرشدنا مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالی نے بہت سی صفاتِ حمیدہ سے نوازا تھا، آپ معلم ومربی، محدث ومحقق، جامع المعقول والمنقول، عالم باعمل اورنمونۂ اسلاف تھے،علمی انہاک اورتدریسی زندگی کا یہ حال تھا کہ آپ نے میزان سے لے کر بخاری شریف تک درس نظامی کی اکثر کتابوں کا سالہا سال تک درس دیا ہے، چناں چہ ایک مرتبہ اپنے درس کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت والا نے خود ارشاد فرمایا کہ ”درس نظامی کی تمام ابتدائی کتابیں پڑھائی ہیں، ترجمۂ قرآن پاک پڑھایا ہے، ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ سوا تین ماہ میں ختم ہوئی تھی“، حضرت والاؒ علوم ظاہرہ کے ساتھ علوم باطنہ یعنی طریقت وتصوف میں بھی بلند مقام پر فائز تھے، چناں چہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ان گیارہ مخصوص خلفائے کرام میں آپ کا شمار تھا جنھیں دربارِتھانوی سے اعتماد وافتخار کی سند عطا ہوئی۔

بخاری شریف کے شروع کے ابواب اورآخری حدیث کا درس، آخر حیات تک حضرت والا مسیح الامتؒ سے متعلق رہا، یہ دروس جہاں علمی اعتبار سے نہایت جامع ومفصل اور بسیط ہیں، وہیں قلبی وروحانی اعتبار سے بھی نہایت گراں قدر جواہر کا

خزانہ ہیں، حضرت والاؒ کی ان درسی تقریروں کومرتب کرنے کی سعادت جس شخصیت کے حصہ میں آئی وہ آپؒ کے تربیت یافتہ تلمیذ، معتمد خاص اور آپؒ کے علمی وتصنیفی امور کے دست راست مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نوراللہ مرقدہ کی ذات گرامی ہے، آپ مفتاح العلوم جلال آباد میں استاذ حدیث وفقہ اور صدر مفتی کے منصب پر فائز تھے، رجال ساز استاذ، باکمال مصنف، جید قاری، بہترین عالم اور خانقاہِ مسیحیہ کے ممتاز مسترشدین میں سے تھے، آپ نے ان دروس کو بڑی جانفشانی وعرق ریزی سے نقل وضبط کر کے حضرت والا کے ملاحظہ سے گذار کر ''فضل الباری فی درس البخاری'' کے نام سے موسوم فرمایا اور آپ کی زندگی میں ہی یہ پانچ قسطوں (اور تقریباً ٦٠٠ چھ سوصفحات میں) مکتبہ فیض اشرف جلال آباد سے شائع ہوئے۔

''فضل الباری فی درس البخاری'' کے نام سے مطبوعہ یہ دروس عرصہ دراز سے نایاب ہیں، احقر کے دل میں خیال آیا کہ ان کوتحقیق وتخریج اور حواشی مفیدہ کے ساتھ دوبارہ شائع کرایا جائے، چناں چہ احقر نے طباعت ثانیہ کی اجازت کے لیے دہلی کی مسجد کے ایک امام محترم مولانا محمد مسلم صاحب قاسمی مدظلہ کو جلال آباد نبیرہ مسیح الامت حضرت مولانا خفی اللہ خاں صاحبؒ مہتمم جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد (المتوفی ۱۸ / ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ ۱۰ / جولائی ۲۰۲۰ء) کے پاس بھیجا، مولانا مرحوم نے بخوشی اجازت مرحمت فرمادی۔ (**تغمدالله بغفرانه**)

کام کے آغاز میں ہی اللہ رب العزت کے فضل، احادیث کی برکت اور حضرت مسیح الامتؒ کی دعاؤں کے طفیل میں رفقائے کار کی ایک جماعت میسر آ گئی، جس سے کام آسان ہو گیا، تفصیل اس کی یہ ہے:

(۱) سب سے اول مولانا خلیل احمد قاضی صاحب لاجپوری حفظہ اللہ مہتمم مدینہ اکیڈمی ڈیوزبری، انگلینڈ نے اس مبارک خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا مولانا موصوف نے از اول تا آخر مکمل جدو جہد اور جستجو جاری رکھی، قدم بہ قدم حرکت وفکر اور لگن کے ساتھ لگے رہے، حواشی مفیدہ اور دیگر تمام مراحل میں انہماک محبتِ قلبی اور علمی امور میں دل چسپی کا مظہر ہے، اگر مولانا موصوف کا ساتھ نہ ہوتا تو یہ کام

آسان نہ ہوتا، اللہ تعالی انھیں اپنی شایانِ شان اجر عظیم سے نوازے آمین۔

(۲) مطبوع کتاب (فضل الباری پر) تخریج وتعلیق کی ابتدا کے لیے دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث وفقہ حضرت مولانا منیر احمد عثمانی صاحب مدظلہ کے پاس بھیجی گئی، انھوں نے اپنے ایک ہونہار فاضل اور لائق شاگرد مولانا محمد شاہد قاسمی سیتاپوری مدظلہ سے اس پر قابل وقعت اور لائق ذکر خاصی محنت کا کام کرادیا، حضرت مولانا منیر احمد عثمانی صاحب کی تحریر اس طبات میں موجود ہے، اللہ تعالی ہر دو کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

(۳) فضل الباری کے مرتب حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحبؒ کے نواسے مولانا محمد کلیم نعمانی قاسمی صاحب مدظلہ سے رابطہ ہوا، سرِ دست محترم موصوف نے صاحب افادات اور حضرت مرتب کے سوانحی خاکے لکھ کر ارسال فرمائے، پھر انھوں نے بتایا کہ ہمارے پاس فضل الباری کی مطبوعہ پانچ اقساط کے علاوہ غیر مطبوع ایک جلد کا قلمی نسخہ بھی محفوظ ہے، یہ بات ہمارے لیے مسرت کا باعث بنی، غیر مطبوعہ یہ حصہ حضرت مرتب علیہ الرحمہ کے باریک قلم سے گھنے خط میں تھا، جو نصف صدی بیت جانے کی وجہ سے بوسیدگی کو پہنچ چکا تھا، لیکن مولانا محمد کلیم نعمانی صاحب مدظلہ نے ہماری طلب پر اس کو بڑی احتیاط کے ساتھ کمپوز کرایا اور پوری ہمت ومحنت اور باریک بینی کے ساتھ تصحیح کر کے ارسال فرمایا، علاوہ ازیں مولانا موصوف نے اپنے عمدہ تصنیفی ذوق کے مطابق طباعت تک تمام مراحل میں مساعی جمیلہ فرمائی، حوصلہ افزا اور لائق مسرت بات یہ رہی کہ انھیں کے توسط سے حضرت مرتب صاحب مرحوم کے فرزند ارجمند حضرت مولانا محمد کامل صاحب دامت برکاتہم ناظم اعلی ادارہ فیض مسیح الامت بڑوت، باغپت کی ’’فضل الباری‘‘ کے منظر پسِ منظر پر مشتمل ایک وقیع تحریر بھی ہمیں موصول ہوگئی۔ فجزاھم اللہ خیراً۔

(۴) اس کے بعد کمپوز شدہ مذکورہ جلد کی تخریج وتعلیق اور تمام جلدوں پر نظر تحقیق کی ذمہ داری مدرسہ مفتاح العلوم تراج گجرات کے استاذ حدیث مولانا عظیم الدین صاحب ارنالوی حفظہ اللہ نے قبول فرمائی، مولانا موصوف کو کتابوں پر اس

قسم کے کام کی مہارت اور اچھا تجربہ ہے، اس لیے یہ مرحلہ بھی بحسن وخوبی تکمیل کو پہنچا، اسی کے ساتھ مولانا موصوف نے کتاب ہذا کو بغرضِ ملاحظہ حضرت شیخ الحدیث استاذ مکرم مولانا مفتی احمد صاحب خان پوری مدظلہم کی خدمت میں پیش کیا، حضرت والا نے ملاحظہ کے بعد دعاؤں کے ساتھ جامع تقریظ تحریر فرمائی، اللہ تعالیٰ حضرت والا کی عمر میں صحت وعافیت کے ساتھ خوب برکت عطا فرمائے آمین۔ **فجزاھم اللہ خیرا کثیراً۔**

ہماری جستجو اور دلی آرزو تھی کے ''فضل الباری'' کے ان دروس کا کوئی ایسا عینی شاہد ومستفید تلمیذ مل جائے جسے صاحب افادات (حضرت مسیح الامتؒ) اور حضرت مرتب (حضرت مفتی نصیر احمد صاحبؒ) دونوں سے خصوصی ربط وقربت اور مناسبت رہی ہو، تا کہ وہ بھی ایک بار ذوق ومزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کام کو دیکھ لے، چناں چہ بنگلور سے حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خاں صاحب مہتمم جامعہ مسیح العلوم بنگلور سے رابطہ ہو گیا، حضرت مولانا نے اس کو ملاحظ فرما کر حوصلہ افزائی کے ساتھ جامع انداز میں ایک اہم اور تفصیلی تحریر بھی ارسال فرمائی۔ **فجزاہ اللہ اجراً جزیلاً۔**

یہاں ہم خلاصہ کے طور پر جدید ایڈیشن پر کیے گئے اس کام کی وضاحت پیش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو حسبِ ذیل ہے :

(۱) تمام احادیث کی تخریج کر دی گئی۔ (۲) آیاتِ قرآنیہ کے پارے اور سورتوں کا آیت نمبر درج کرنے کے ساتھ متعلقہ آیات کی تفسیر کا حوالہ بھی دے دیا گیا۔ (۳) کتاب میں مندرج تشریح کو عربی شروحات کے حوالے سے مزین کر دیا گیا (۴) اصولِ حدیث اور فقہی مباحث کو فنی اعتبار سے مدلل کر دیا گیا۔ (۵) ہر سبق میں بحیثیتِ متنِ بخاری شریف کی حدیث کا شمار نمبر لگا دیا گیا۔ (۶) عربی تعبیرات واشعار کی تخریج کر دی گئی (۷) درس میں مذکور شخصیات : محدثین عظام واکابرِ دیوبند ہر ایک کا اپنے اپنے مقامات پر جامع ومختصر تعارف حواشی مفیدہ میں شامل کر دیا گیا۔ (۸) طلبہ کی زبان فارسی سے قلتِ مناسبت کے پیشِ نظر فارسی اشعار کا ترجمہ کر دیا گیا۔

(۹) شروع کتاب میں صاحبِ افادات (حضرت مسیح الامتؒ) اورمرتب کتاب (حضرت مفکرملتؒ) کے سوانحی خاکے دیدئے گئے ہیں۔(۱۰) پہلے سے مطبوع شروع کے چارحصوں کو دوجلدوں میں کردیااورغیر مطبوعہ حصہ تیسری جلدمیں سمایاہے، جب کہ ’’تقریرختم بخاری‘‘ کی آخری جلدحسبِ سابق الگ رکھی گئی ہے۔(۱۱) کتاب میں پہلے سے موجود حاشیہ کو باقی رکھتے ہوئے قوسین میں مرتب کتاب کے اشارے کے لیے ’’نصیراحمدغفرلہ‘‘ لکھ دیا گیا۔(۱۲) کتاب ہٰذا کواصحاب علم وفن کے ملاحظات سے گذارکران کی تقریظات وتحریرات سے مزین کردیا گیا۔(۱۳) کتاب کوکمپیوٹرائزکراکے اچھی سیٹنگ اورعمدہ طباعت سے ظاہری حسن وجمال میں اضافہ اور سلیقہ مندی کے ساتھ معیاری کام کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

ان تمام امور کی انجام دہی کے بعد کتاب کواغلاط وخامیوں سے پاک کرنے کی مساعی میں محترم مولانا خلیل احمد قاضی صاحب حفظہ اللہ اورمولانا محمدکلیم نعمانی قاسمی صاحب حفظہ اللہ نے بھرپورتوجہ فرمائی،حتی المقدورہردوحضرات نے پروف ریڈنگ ،سیٹنگ اورمعیاری طباعت کے لیے مساعی جمیلہ فرمائیں،اس طرح انتھک محنتوں اور بسیارکوششوں کے بعد کتاب قابلِ قدر ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے،تاہم پھربھی اغلاط کے رہ جانے کا امکان ہے خطا سے کلیۃً برأت نہیں ، اس لیے اگر قارئین وناظرین خامی وغلطی دیکھیں تو ہدفِ ملامت کے بجائے براہِ راست مطلع فرمائیں پرمشکور ہوں گے۔

اخیر میں ہم رفقائے کار کی جماعت کے تشکر وامتنان کے ساتھ تمام اصحاب تقاریظ اورسبھی محبین ومعاونین کے بصمیم قلب ممنون ہیں ، اللہ تعالی سبھی حضرات کو موفق للخیر فرمائے ،اجرعظیم سے نوازے۔ آمین یا رب العالمین۔

عبدالرؤف لاجپوری باٹلی،انگلینڈ

۶ / ربیع الاول ۱۴۴۲ھ/ ۲۱ / نومبر ۲۰۲۰ء

بہ روز ہفتہ

تقریب اشاعتِ ثانیہ

حضرت مولانا محمد کامل صاحب ادریس پوری مدت فیوضہم
(فرزندارجمند حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحبؒ)

حامدا ومصليا ومسلما أما بعد ـ قال النبي ﷺ نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فوَعَاهَا فَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا

ترجمہ : نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا :اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو روشن کرے جس نے میری بات سنی، اس کو یادرکھا، پھر جس طرح اس نے بات کوسنا ،اسی طرح دوسروں تک پہنچایا۔(مسند احمد ۲۷: ۳۰۱/،رقم الحدیث ۱۶۷۳۸)

اس وقت مخدوم ومکرم والد ماجد حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نوراللہ مرقدہ سابق استاذ حدیث وفقہ وصدرمفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد کی مرتب کردہ کتاب :"**فضل الباري في درس البخاري**" کی تقریبِ اشاعت ثانیہ ہے، یہ کتاب مسیح الامت حضرت الاستاذ مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمہ اللہ کی درسی تقریروں کا مجموعہ ہے، حضرت والا کا درس بڑی آن بان اورنرالی شان کا حامل ہوتا تھا، ان ہی کی برکت سے حضرت والد صاحب مرحوم کوبھی احادیث شریفہ سے غیر معمولی شغف اور بے پناہ تعلق تھا؛ چناں چہ آپ نے مفتاح العلوم جلال آباد میں فن حدیث کی متعدد کتابوں (طحاوی شریف، ابن ماجہ،شمائل ترمذی ،موطائین اورمشکوٰۃ شریف وغیرہ) کاایک طویل زمانےتک درس دیا۔

حضرت والد ماجد نوراللہ مرقدہ اپنے استاذ ومربی حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کے تصنیفی وتالیفی کاموں میں دست راست کی حیثیت رکھتے تھے،ان کی صلاحیت کو چار چاند لگانے میں ان کے استاذ خاص حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ

علیہ کی توجہات کا کمال تھا، چناں چہ حضرت والد صاحب کی سند فراغت پر جو الفاظ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب نے تحریر فرمائے، وہ اس کا بیّن ثبوت ہے، فارغین کی اسناد پر عموماً یہ الفاظ لکھے جاتے ہیں: ''ولہ مناسبة بالعلوم تامة''؛ مگر استاذ محترم کی جوہر شناس نظر نے اپنے شاگرد میں اس سے بڑھ کر جو قابلیت دیکھی، وہ اس کو ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکے، چناں چہ ان الفاظ کے بعد حضرت والد صاحب کی سند پر مزید یہ الفاظ رقم فرمائے: **''وهو يقدر على التصنيف و التأليف و التحشية على الكتب''**۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور	کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

پھر حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کے زیر سایہ طویل زمانے تک علمی وعملی خدمات نے جو پختگی اور مضبوطی پیدا کی، وہ ظاہر و باہر ہے، چناں چہ دربارِ مسیحی کے حاضر باش اہل علم حضرات پر یہ بات مخفی نہیں کہ حضرت والد صاحب حضرت جلال آبادیؒ کی خانقاہ میں عمومی وخصوصی مجالس میں حضرت مسیح الامتؒ کے دائیں بائیں ایک خاص قدر ومنزلت کے ساتھ رہتے تھے۔

بخاری شریف از ابتدا تا کتاب الایمان کا درس حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ سے متعلق ہوتا تھا، والد صاحب مرحوم نے باوجود حضرت مسیح الامتؒ سے تلمذ و تعلم کے، مفتاح العلوم جلال آباد میں مدرس ومفتی ہونے کے بعد باقاعدہ حضرت والاؒ کے درس میں شرکت کر کے آپ کے ۱۳۸۲ھ، ۱۳۸۳ھ کے دروس کے انضباط وترتیب کا کارنامہ انجام دیا، اولاً آپ درس کو ضبط کرتے پھر حضرت والا کے ملاحظہ سے گذارتے، اس طرح آپ نے دروسِ بخاری کو ''فضل الباری'' کے نام سے ترتیب دے کر غائبین اور مابعد کے لوگوں کے لیے کتابی شکل میں ایک یادگار تحفہ دیا۔

''فضل الباری فی درس البخاری'' کی بالترتیب چار جلدیں اور آخری

حدیث شریف کے درس پر مشتمل ایک جلد 'تقریر ختم بخاری' کے عنوان سے اسی زمانے سے مطبوع ومقبول تھیں، اس کے علاوہ ہمارے پاس حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کے علمی خزانہ میں مزید ایک جلد کا قلمی مسودہ بھی محفوظ تھا (گرچہ ہمارا خود بھی حضرت والد صاحب مرحوم کی علمی باقیات کو منظر عام پر لانے کا سلسلہ جاری ہے۔)
تاہم اس مسرت آمیز خبر سے کہ فاضل جلیل محترم مولانا خلیل احمد قاضی صاحب حفظہ اللہ (اور ان کے رفقا) اپنے استاذ گرامی حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری (مقیم حال باٹلی انگلینڈ) کی زیر سرپرستی کتاب ہذا کو تخریج وتعلیق، اور جدید طباعت کے ساتھ منظر عام پر لا رہے ہیں، ہم نے (خواہر زادہ مولوی محمد کلیم نعمانی قاسمی حفظہ اللہ کی مساعی جمیلہ کے باعث) ان کی طلب وفرمائش پر اپنے پاس محفوظ وہ قلمی مسودہ بھی ان کے حوالہ کر دیا، باری تعالی سے قوی امید ہے کہ اب یہ مکمل مجموعہ مزید مفید اور نافع ہوگا، ان شاء اللہ تعالی۔

محترم مولانا خلیل احمد قاضی کی فرمائش پر بندہ نے یہ چند سطور سپردِ قرطاس کر دیں، دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس مجموعہ کو قبولیت تامہ سے نوازے، صاحبِ درس اور مرتب علیہما الرحمہ کو غریق رحمت فرمائے اور اس اہم کام میں حصہ لینے والے سبھی حضرات کو موفق للخیر فرمائے، آمین۔ فقط

(حضرت مولانا) محمد کامل عفی عنہ ادریس پوری (مدت فیوضہم)
خادم تعلیمات: ادارہ فیض مسیح الامت بڑوت باغپت یوپی ہند
۱۱ر محرم الحرام ۱۴۴۲ھ مطابق ۳۱ر اگست ۲۰۲۰ء بروز دوشنبہ

تقریظ

فخر ہند، مرشد العلماء حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب آدام اللہ فیوضہم
خلیفۂ اجل فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ
و شیخ الحدیث و سابق صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نحمده و نصلی علی رسوله الكريم

کتب حدیث میں بخاری شریف کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ اظہر من الشّمس ہے، یہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی حسنِ نیت کا نتیجہ تھا کہ جامع صحیح اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی حیاتِ مبارکہ ہی میں اس کو نوّے ہزار آدمیوں نے آپؒ سے بلاواسطہ سنا، جن میں سب سے آخری شاگردِ رشید شیخ فربری رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور آج کل ان کی روایت ہی علوِّ اسناد کی وجہ سے شائع و مشہور ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے وصال (۲۴۶ھ) کے بعد بخاری شریف سے متعلق شروح، تعلیقات وغیرہ کی شکل میں جو کچھ کام ہوا اور متعدِّد حیثیت سے اہل علم نے عربی، اردو، فارسی اور دیگر زبانوں میں اس پر اپنے اپنے جوہروں اور صلاحیتوں کا استعمال کیا، وہ ان گنت ہیں۔

برِّصغیر میں بخاری شریف کے دروس مختلف ناموں سے شائع ہوئے ہیں، اسی سلسلے کی ایک کڑی زیر نظر کتاب عارف باللہ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب شروانی جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات وافاضات مسمّٰی بہ ”فضل الباری فی دروس البخاری“ ہے جسے حضرت مولانا حافظ قاری مفتی نصیر احمد

صاحب ادریس پوری رحمۃ اللہ علیہ (سابق صدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد) نے مرتب کیا تھا اور صاحب درس ہی کے زمانہ میں شائع ہوئے تھے۔

اب جدید اشاعت کے لیے کچھ دوسرے علماء نے تخریج اور حواشئ مفیدہ پر کام کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر لکھا ہے: زیر سرپرستی: حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو دوبارہ منصۂ شہود پر لانے میں مولانا موصوف کا بھی دخل ہے۔

احادیث مبارکہ کے ساتھ اشتغال رکھنے والوں کے متعلق بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالی اس بندے کو تروتازہ رکھے (یعنی اس کی قدر ومنزلت بڑھائے اور دین ودنیا میں اس کو بہت زیادہ خوش وخرم رکھے) جس نے میری بات (حدیث) سنی اور پھر یاد کیا اور ہمیشہ یاد رکھا اور پھر اس کو جس طرح سنا تھا، اسی طرح لفظ بہ لفظ دوسرے لوگوں تک پورا پورا پہنچایا (یعنی الفاظِ حدیث کی بھی روایت کی اور اس کے معنی ومراد اور مطالب بھی بتائے اور سمجھائے) پس بعض حامل فقہ فقیہ نہیں ہوتے اور بعض حامل فقہ اس شخص تک پہنچا دیتے ہیں جو اس سے بڑا فقیہ ہے۔ (مشکوۃ شریف، ترجمہ از مظاہر حق)

اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: جو شخص میری امت کے لیے ان کے دینی امور میں چالیس حدیثیں محفوظ رکے گا، حق تعالی شانہ اس کو قیامت میں عالم اٹھائے گا اور مَیں اس کے لیے سفارشی اور گواہ بنوں گا۔ علقمی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ : محفوظ کرنا شئے کے منضبط کرنے اور ضائع ہونے سے حفاظت کا نام ہے، چاہے بغیر لکھے برزبان یاد کرلے یا لکھ کر محفوظ کرلے، اگرچہ یاد نہ ہو۔ پس اگر کوئی شخص کتاب میں لکھ کر دوسروں تک پہنچاوے، وہ بھی حدیث کی بشارت میں داخل ہوگا۔ مناویؒ کہتے ہیں کہ: میری امت پر محفوظ کرلینے سے مراد ان کی طرف نقل کرنا ہے سند کے

حوالے کے ساتھ۔اور بعض نے کہا کہ: مسلمانوں تک پہنچانا ہے، اگرچہ وہ برزبان یاد نہ ہو، نہ ان کے معنی معلوم ہوں۔اسی طرح چالیس حدیثیں بھی عام ہیں کہ سب صحیح ہوں یا حسن یا معمولی درجے کی ضعیف جن پر فضائل میں عمل جائز ہو۔اللہ اکبر! اسلام میں بھی کیا کیا سہولتیں ہیں اور تعجب کی بات ہے کہ علماء نے بھی کس قدر باریکیاں نکالی ہیں۔(فضائل اعمال، فضائل قرآن)

اس سے معلوم ہوا کہ احادیث کے اسباق ضبط کرنے، احادیث کی نشرواشاعت کرنے، کسی بھی جہت سے احادیث مبارکہ پر کام کرنے والوں کو یہ فضیلت ان شاء اللہ حاصل ہوجائے گی۔امید ہے کہ حضرت مسیح الامتؒ کے یہ درسی افادات وافاضات نہ صرف طلبہ بلکہ صحیح بخاری شریف کے اساتذہ کے لیے بھی ایک بہترین رہنما ثابت ہوں گے۔

دل سے دعا کرتا ہوں کہ جن حضرات نے کتاب ''فضل الباری فی دروس البخاری'' میں دامے، درمے، سخنے حصہ لیا ہے، اللہ تعالی ان تمام حضرات کی مساعئ جمیلہ کو بے حد شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اس مبارک کاوش کو حضرت مسیح الامتؒ کی بلندئ درجات کا ذریعہ اوراس کی نشرواشاعت میں حصہ لینے والوں کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔آمین۔

أملاء العبد (سیدناومولانا) أحمدعفی عنه خانپوری
(زادهم الله علما وعملا وفضلا وصحة)
۱۹/ذی الحجة الحرام ۱۴۴۱ھ

تقریظ

فقیہ العصر، محدثِ کبیر، عارف باللہ
حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم ومدت فیوضہم
(بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم بنگلور)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدُ للہ رَبّ العَالَمِین، والصَّلاۃُ وَالسَّلامُ عَلٰی أشْرفِ الأنْبِیَاء والمُرْسَلِین وعَلَی آلِهِ و صَحْبِهِ أجْمَعِین، ومَنْ تَبِعَهَمْ بإحْسَانٍ في كُلِّ زَمَانٍ و مَكَانٍ إلٰی يَوْم الدِّين، أمّا بَعْدُ:

اس وقت میرے پیش نظر کتاب **"فضل الباری فی درس البخاری"** کے جدید اور تخریج شدہ نسخے کا مسودہ ہے جو حضرت استاذی ومرشدی مسیح الامت مولانا شاہ مسیح اللہ خان صاحب —نور اللہ مرقدہ— خلیفۂ جلیل حضرت حکیم الامت مجدد الملت تھانوی —رحمۃ اللہ علیہ— کے درسی افادات کا نفیس مجموعہ ہے، جس کو اولاً میرے شفیق استاذ حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب —علیہ الرحمۃ— (شاگردِ رشید حضرت مسیح الامتؒ، وخلیفۃ حضرت مفتی مظفر حسین صاحبؒ وسابق صدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم، جلال آباد) نے حضرت صاحب افادات ہی کی زندگی میں مرتب کیا تھا اور حضرت کی نظر ثانی کے بعد وہ اسی زمانے میں "مکتبہ فیض اشرف، جلال آباد" سے باہتمام حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب (داماد حضرت مسیح الامتؒ

و مالک مکتبہ) پانچ جلدوں میں شائع ہوا تھا، اور اب اسی کو جدید انداز پر کمپیوٹرائز کروا کر اور اس کی احادیث کی تخریج اور بعض مفید حواشی کے ساتھ حضرت مسیح الامتؒ کے خلیفہ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب لاجپوری — حفظہ اللہ تعالی — مقیم باٹلی، برطانیہ، کی سرپرستی ونگرانی میں مرتب کیا گیا ہے اور یہی اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

حضرت مسیح الامتؒ کی ذات اقدس ان ذواتِ قدسیہ وانفاسِ زکیہ میں سے ہے، جن کو لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالی چن لیتا ہے اور جن کے قلوب نورِ نبوت سے منور ہوتے ہیں، جن سے علم ومعرفت کے چشمے پھوٹتے ہیں اور بے شمار لوگوں کو ان سے علمی وروحانی فیض پہنچتا ہے۔ چنانچہ آپ کی ذاتِ اقدس سے ایک طرف علم تصوف وسلوک کی سبیلیں ہموار ہوئیں، طریقت ومعرفت کی نہریں جاری ہوئیں، اس سلسلے کے حقائق ومعارف، اسرار ودقائق واضح ہوئے اور بے شمار گم گشتۂ راہ لوگوں کو ہدایت ملی اور ہزاروں انسانوں کی زندگی صلاح وفلاح سے ہم کنار ہوئی تو دوسری جانب حقائق دین کی حفاظت وصیانت، علوم شریعت کی ترویج واشاعت، قرآنِ کریم کی تفسیر وتفہیم، احادیث نبویہ کی ایضاح وتشریح اور فقہ وفتاوی کی تحقیق وتوضیح کا کام بھی لیا گیا اور تشنگانِ علوم ومعارف کو سیرابی کا موقعہ ملا ؛حتی کہ تشنگانِ علوم شریعت اور متلاشیانِ طریق معرفت اس چشمۂ صافی سے سیرابی کے لیے نہ صرف ملک سے، بلکہ اطرافِ عالم سے کشاں کشاں چلے آتے تھے اور اپنی علمی پیاس بجھا کر اور باطنی غذا پا کر فیض یاب وسیراب ہو کر جاتے تھے۔

الغرض آپ کی ذات والا صفات ایک جانب علوم شریعت میں گہرائی و گیرائی، ان میں بصیرت ومہارت اور ان کے حقائق ومعارف کی غواصی وشناوری کے حوالے سے ایک بے مثال شخصیت ہے تو دوسری جانب راہِ طریقت و معرفت میں بھی آپ کا نام نامی واسم گرامی نمایاں حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔

گویا آپ اس شعر کے مصداق تھے :

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق	ہر ہوسناکے نہ داند جام وسنداں باختن

آپ کے درسی افادات میں بھی یہ دونوں چیزیں باہم ملی جلی نظر آتی ہیں اور ایک طالب کوان سے جہاں اپنی علمی پیاس بجھانے اور حقائق ومعارف کی ایک دنیا سے واقف ہونے، قرآن وحدیث کے حیرت انگیز اسرار ورموز سے اپنے دل کو تسکین پہنچانے کا موقعہ ملتا ہے، وہیں ایک سچے سالک کو اپنی باطنی اصلاح کی جانب توجہ دینے، فکرآخرت کو اپنا شیوہ بنانے، محرمات ومعاصی سے اجتناب کو اپنی زندگی کا لازمہ قرار دینے اور صحبت اہل اللہ کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرنے کی توفیق بھی نصیب ہوتی ہے، نیز اخلاقِ حمیدہ واوصافِ محمودہ : توحید واخلاص ،تعلق مع اللہ، محبت وخشیت، انابت و اطاعت، خشوع وخضوع ،شکر وصبر، تسلیم ورضا، اعتماد وتوکل علی اللہ، تواضع وعاجزی جیسی چیزوں کو سمجھنے وسیکھنے اور برتنے کا سلیقہ حاصل ہوتا ہے اور اخلاقِ رذیلہ وصفات قبیحہ : ریا وسمعہ، عجب وتکبر، ناشکری وبے صبری، حب مال وحب جاہ، حرص وطمع، حقد وکینہ، حسد وجلن، غصہ وطیش کی برائی و مذمت اور ان کو دور کرنے کے لیے طریقے وسبیلیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

عام طور پر اہل علم کے دروس میں ان دونوں باتوں کا اجتماع خال خال ہی نظر آتا ہے، لیکن مرشدی واستاذی حضرت والاؒ کے دروس کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہاں علم وعرفان اور شریعت وطریقت کا ایک حسین سنگم نظر آتا ہے۔

استاذِ محترم، مرتبِ دروس حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب — علیہ الرحمۃ — ان دروس کے ”مقدمے“ میں اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ :

”آپ کا بخاری کا درس نرالی شان کا ہوتا ہے، جس میں دل کا درد بھی ہوتا ہے اور علم کی شان بھی، آئندہ عمل کی ترغیب بھی ہوتی ہے اور حال کا محاسبہ بھی، جس میں اربابِ علم نفیس علمی بحثوں کو غنیمت جان کر ان علمی

جواہر پاروں سے اپنے دامن بھرتے ہیں تو اہل دل اپنے درد کی باتیں پا کر مسرور ہوتے ہیں ، طالبانِ اصلاح نفس کی بیماریوں کا علاج اور اوصافِ حمیدہ و اخلاقِ رذیلہ کا بیان سن کر دا روئے دل پاتے ہیں ۔‘‘

احقر کو یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا ، وہ یہ کہ احقر جب جامعہ مفتاح العلوم میں زیر تعلیم تھا ، اس وقت حضرت مسیح الامتؒ نے درس کا مستقل سلسلہ تو منقطع فرما دیا تھا ، ہاں ! سال کے شروع و اخیر میں دورۂ حدیث کے طلبہ کو ایک ایک سبق پڑھاتے تھے اور خاص طور پر آپ کا بخاری کی آخری حدیث کا سبق ضرور ہوتا تھا ۔ اور الحمد للہ ! ہمیں بھی حضرت والاؒ نے یہ آخری سبق پڑھایا تھا اور اس وقت طبیعت کی ناسازی کے باوجود ساڑھے پانچ گھنٹے درس دیا تھا ، اسی سال کے درمیان میں ہم چند ساتھیوں کو شوق دامن گیر ہوا کہ حضرت والا سے مزید کچھ اسباق پڑھانے کی گزارش کی جائے ، لہٰذا ہم چند ساتھی حضرتؒ کی خدمت میں تمنائے دل لے کر حاضر ہوئے اور اپنا مدعیٰ پیش کیا ۔ حضرت والاؒ نے اس وقت جو فرمایا تھا ، وہ مجھے خوب یاد ہے ، آپ نے فرمایا کہ :

اچھا !! مجھ سے مزید اسباق پڑھنا چاہتے ہو ، مگر مجھ سے تم لوگ کیا پڑھو گے ؟ تم لوگ تو عالمانہ پڑھنا چاہتے ہو اور میں تو فقیرانہ پڑھاتا ہوں ۔‘‘

اس میں اسی جانب اشارہ ہے کہ عام مدرسین تو صرف علمی ابحاث و تحقیقات کی جانب اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور اسی پر اپنی ساری توانائیاں صرف کر ڈالتے ہیں اور حضرت والاؒ کے یہاں اس کے ساتھ ساتھ فقیری کے اسرار و حقائق بھی زیر بحث آتے تھے ، وہ ’’ فقیری ‘‘ جس کو لوگوں نے فقیر و حقیر سمجھ کر اس سے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی ہے اور جب احادیث کی کتابوں میں یہ سلوک و معرفت کی بحثیں آتی ہیں ، خوف و خشیت کا ذکر ہوتا ہے ، فکر آخرت کا عنوان سامنے آتا ہے ، محبت الٰہی کا بیان ہوتا ہے ، صفاتِ محمودہ و اخلاقِ حمیدہ کی تعریف و اہمیت کا بیان

آتا ہے اور صفاتِ قبیحہ واخلاقِ دنیہ کی مذمت و برائی سامنے آتی ہے تو ان سب امور کو یوں لپیٹ دیا جاتا ہے، گویا کہ یہ ابحاث کوئی قابل توجہ ولائق التفات ہی نہیں، اس کے برعکس رفع یدین، آمین بالسر والجہر، فاتحہ خلف الامام جیسی بحثوں پر اچھا خاصا وقت بھی لگایا جاتا ہے اور زور بھی پورا صرف کیا جاتا ہے۔

الغرض حضرت والا کا درس ہر پہلو کو جامع ہوتا تھا اور اسی وجہ سے پڑھنے والوں پر علمیت کے ساتھ ساتھ تقوی وطہارت کا رنگ بھی چڑھ جاتا تھا، جو کہ علم سے مقصود بالذات چیز ہے اور اسی کے لیے سارا نظام وسلسلہ جاری کیا جاتا ہے۔

حضرت والا — رحمۃ اللہ علیہ — کے ان درسی افادات کی زیر نظر جدید ترتیب حضرت کے خلیفہ حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری — دامت فیوضہم — کی سرپرستی ونگرانی میں متعدد حضرات کی محنتوں اور عرق ریزیوں کا ثمرہ ونتیجہ ہے، جو آج ہمارے سامنے ایک خوب صورت وحسین گل دستے کی شکل میں موجود ہے اور اس میں ان حضرات نے ماشاء اللہ متعدد امور کا لحاظ واہتمام فرمایا ہے:

(۱) پوری کتاب کو ازسرنو کمپیوٹر سے کتابت کرا کر اس کے ظاہری حسن کو بھی دوبالا کر دیا گیا ہے۔

(۲) احادیث کی تخریج کا اہتمام کر کے اس کے باطنی جمال کو مزید نکھار دیا ہے۔

(۳) احادیث کے علاوہ جہاں فنی موضوعات پر کلام ہے، اس کو بھی متعلقہ کتابوں سے مدلل کیا گیا ہے۔

(۴) کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ آیا ہے، ان کا مختصر وجامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔

(۵) بعض جگہ علمی موضوعات پر مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ان امور کی وجہ سے کتاب کی افادیت دوبالا ہوگئی اور لوگوں کے لیے اس

سے استفادے وانتفاع میں بھی سہولت ہوگئی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نفیس کتاب واقعی اس بات کی مستحق تھی کہ اس کی علمی خدمت کی جائے اور اس کی افادیت و نافعیت کو بڑھادیا جائے؛ تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس سے مستفید و منتفع ہوں اور اس احقر کو بھی اس کا خیال آتا تھا کہ میں اس پر تخریج وتحقیق کا کام انجام دوں مگر مصروفیات کی وجہ سے مجھے اس کام کا موقعہ نہیں مل سکا اور الحمد للہ! حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب کی توجہات نے اپنے متعلقین و منسلکین کے تعاون سے اس اہم علمی خدمت و حدیثی کاوش کو سرانجام دے کر جہاں ایک جانب اپنے حسنات میں ایک لازوال اضافہ کرلیا، وہیں دوسری جانب امت مسلمہ بالخصوص، اہل علم حضرات پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے؛ اس لیے یہ حضرات تمام امت کی جانب سے عموماً اور اہل علم طبقے کی جانب سے خصوصاً شکریہ کے مستحق ہیں۔

میں ان سب حضرات کی خدمات میں درجہ بہ درجہ مبارک بادی کا تحفہ پیش کرتا ہوں، جنھوں نے اس علمی کاوش و خدمت کو انجام دیا ہے اور خاص طور پر حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب — زید مجدہم — کی خدمت میں ہدیہ مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ان کی اس علمی کاوش و خدمت کو شرفِ قبولیت سے نوازیں اور ان کو اجر جزیل سے مالامال فرمائیں اور ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں اور امت کو اس سے استفادے کی توفیق عطا فرمائیں۔ فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

خادم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

۲۱/صفر المظفر، ۱۴۴۲ھ ۹/اکتوبر، ۲۰۲۰ء

ضرورت کا احساس اور مستحسن قدم

حضرت مولانا محمد وصی اللہ خان صاحب (آرزو میاں) مدظلہ
ناظم جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد شاملی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرے مشفق ومربی تایا ابا مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب علیہ الرحمۃ کو اللہ ربُّ العزت نے مختلف علوم ومعارف سے نوازا تھا، تصوف وسلوک کے آپ امام تھے، تعلیم وتربیت اور رجال سازی میں مہارت تامہ تھی، علوم آلیہ وعالیہ کی تدریس پر یدِ طولیٰ حاصل تھا، علوم عالیہ میں فنّ حدیث سے ایک خاص شغف تھا، جس کا سلسلہ آخر حیات تک جاری وساری رہا، بالخصوص ختم بخاری کا درس تو بڑی شان بان کے ساتھ ہوا کرتا تھا، آج بھی اس کے نقوش ان کے تلامذہ کے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

پیش نظر کتاب ''فضل الباری فی درس البخاری'' آپ کے ان دروسِ بخاری (از ابتدا تا کتاب الایمان مع ختم بخاری شریف) کا مجموعہ ہے جو جامعہ میں آپ سے متعلق رہے، ان کو میرے محسن واستاذ مکرم مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ (سابق استاذ حدیث وفقہ وصدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد شاملی) نے بڑی جد وجہد اور جفا کشی سے نقل وضبط کر کے مرتب فرمایا ہے، حضرت الاستاذ نے خیال فرمایا کہ حضرت والا کے ان نرالے

دروس سے جیسے حاضرین وسامعین لطف اندوز ہورہے ہیں، اسی طرح غائبین اور مابعد کے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے رہیں، استاذِ محترم حضرت مسیح الامتؒ کے قریبی اور خاص معتمدین میں سے تھے، حضرت والاؒ کے علمی وقلمی اکثر امور استاذ محترم ہی انجام دیا کرتے تھے، آپ کا تدین وتفقہ اور تصلب فی الدین مثالی تھا، افراد سازی آپ کا خاص وصف تھا، آپ کی تصنیفی صلاحیت پر آپ کے استاذ خاص، سابق ناظم تعلیمات جامعہ مفتاح العلوم حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ نے وقیع شہادت سے نوازا تھا، پھر حضرت مسیح الامتؒ کی صحبت نے ذوق تھانوی سے مشرف فرما کر مزید جلا بخشی، چناں چہ آپ نے ''فضل الباری'' کی ترتیب میں مکمل طور پر وہی ذوق ومزاج ملحوظ رکھا ہے، بلاشبہ یہ ایک بڑا کارنامہ ہے، جو آپ کے لیے صدقۂ جاریہ بھی ہے۔

فضل الباری کی طباعت کو تقریباً نصف صدی گزر گئی ہے اور اس وقت یہ نایاب بھی ہو چکی، ضرورت تھی کہ اس کے مشمولات کو حوالہ جات اور تخریج وتعلیق سے آراستہ کر کے عصری انداز کی طباعت کے ساتھ شائع کرایا جائے، تشکر وامتنان کی مستحق ہیں حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب لاجپوری مدظلہ کی شخصیت کہ جس نے اس ضرورت کا احساس کر کے کام کا بیڑا اٹھایا، مولانا دامت برکاتہم سے میں بذات خود واقف ہوں، آپ مسیح الامت کے دولت کدہ سے مشرف اور فیض یافتہ مجاز وخلیفہ ہیں، آپ ملک برطانیہ میں حضرت مسیح الامت کے علوم ومعارف کے فیضان دینی وعلمی کی اشاعت میں مصروف ومنہمک ہیں، اللہم زد فزد۔

حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب کے قدم اٹھاتے ہی توفیق ایزدی شامل حال ہوئی اور رفقائے کار کی ایک جماعت مل گئی، جس نے اس کام کو خوب سے خوب تر بنانے میں جہد مسلسل اور محنتیں صرف کیں، رفقائے کار کی اس جماعت (مولانا خلیل احمد قاضی صاحب لاجپوری، مولانا محمد کلیم نعمانی نواسۂ گرامی حضرت

مفکر ملتؒ، مولانا عظیم الدین صاحب تراج گجرات) کا یہ کام (جس کی مکمل تفصیل حضرت مولانا نے اپنے مقدمے میں بڑی جامعیت کے ساتھ رقم فرمائی ہے) حوصلہ افزا، قابل تحسین اور لائق مبارک باد ہے، خاص طور پر مسرت پر یں اضافہ کا باعث ہے کہ نوجوان فاضل عزیز گرامی مولانا محمد کلیم نعمانی حفظہ اللہ کی مساعی جمیلہ سے فضل الباری کا غیر مطبوعہ حصہ بھی اس میں شامل ہو گیا، جس سے اس کی افادیت میں یقیناً مزید اضافہ ہوگا ان شاء اللہ۔

فضل الباری کے اس جدید ایڈیشن کو مدینہ اکیڈمی ڈیوز بری برطانیہ اور ادارہ فیض مسیح الامت بڑوت باغپت سے شائع کیا جا رہا ہے، دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس کو مقبولیت تامہ عطا فرمائے، اس کام کی خدمت کو حضرت مولانا زید مجدہ اور رفقائے کار و سبھی محبین و معاونین کے لیے ذریعۂ نجاتِ آخرت بنائے، سبھی حضرات کو موفق للخیر فرمائے۔ آمین۔

احقر محمد وصی اللہ عفی عنہ (آرزو میاں)
مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد
۹ / ذی قعدہ ۱۴۴۲ھ/
۲۱ / جون ۲۰۲۱ء بروز دوشنبہ

(حافظ و قاری) محمد ولی اللہ (صاحب)
مہتمم جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد

پیر طریقت رہبر شریعت مسیح الامت

حضرت اقدس مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ کے جوہری دروس

(مولانا) منیر الدین احمد عثمانی نقشبندی
استاذ تفسیر دار العلوم دیوبند

”**فضل الباری فی درس البخاری**“ اس شخصیت کے درس بخاری کا مجموعہ ہے، جس سے ہزاروں گم گشتہ راہ کو راہ ملتی تھی، جس کے سایۂ عاطفت میں پریشان حال لوگوں کو عافیت نصیب ہوتی تھی، جس سے ہزاروں گنہگار لوگوں کو گناہ کی مصیبت سے خلاصی میسر آتی تھی، معصیت میں ڈوبے لوگوں کو معصیت سے نجات حاصل ہوتی تھی، زنا کاری اور بدکاری سے اپنی زندگی کو تباہ کرنے والے لوگوں کو صیانت وحفاظت ملتی تھی، چوری اور ڈکیتی کی عادت سے پریشان بندے کو حضرت کی توجہ خصوصی سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل ہوجاتی تھی، خلاصہ یہ کہ اس شخصیت سے انسانیت نصیب ہوتی تھی، وہ شخصیت گرامی مرتبت مسیح الملت حضرت اقدس مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادیؒ کی ہے، جس کے وجود مسعود سے شریعت وطریقت کی بھینی بھینی خوشبو پھوٹتی تھی، شریعت وطریقت کی بہار آفریں فضا تھی، پژمردہ دلوں کے لیے تسکین کا سامان تھا، جلال آباد روحانی مریضوں کا شفا خانہ تھا، کتنے مریض آتے اور اس شفا خانے سے شفایاب ہوکر رخصت ہوتے، ہزاروں تشنگانِ طریقت اس شخصیت کے در سے سیرابی حاصل کرتے اور راہ

سلوک کے بھوکوں کو غذا ملتی تھی، اس شخصیت کا درس خصوصی اوصاف کے حامل ہوتا تھا، جس سے ہر جہت کے لوگوں کو استفادہ کا خوب موقع فراہم ہوتا تھا، درسی اوقات میں ہر چہار سمت سے مستفدین مقام درس کی طرف کھینچے چلے آتے اور اپنی اپنی جگہ لے کر بیٹھ جاتے، مجمع میں سناٹا طاری ہوجاتا، ہر شخص سانس روکے گوش برآواز ہوجاتا کہ مبادا کوئی لفظ دل وکان میں پڑنے سے قبل صحرا کے دوش پر اُڑ جائے'' ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ '' کا سماں بندھ جاتا۔ ہر لفظ ہیرے جواہرات سے گراں، آتش فروزاں سے زیادہ پُرشوز، درد وکرب سے لبریز درّ یتیم سے زیادہ صاف ستھرا، تخت وطاؤس سے زیادہ قیمتی، اخلاص وفا سے دھلا ہوا، احتساب وللّٰہیت سے تاباں، خونِ جگر سے رنگین، ایمان ویقین کی شادابی اور تازگی سے بھرپور، بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ دل کی بے چینی اور کرب وسوز الفاظ و عبارات کے جامہ میں تبدیل ہورہا ہے اور اخلاص وفا کا بے پایاں جذبہ لشکر جرار بن کر کفر وشرک کے اڈوں پر فطرت سے بغاوت وسرکشی کے مراکز، خدا سے دشمنی اوراس کے احکام کے خلاف ورزی کی کمین گاہوں پر حملہ آور ہونے جارہا ہے۔

اس گوہر بار اور ثمر آور دروس کی اشاعت اس ذات گرامی کی نصیب میں آئی ہے جو مسیح الملت کے درِ اقدس سے مستفیض، جوہری دروس سے کشید کِنندہ، شریعت وطریقت کا جامع، احتساب وللّٰہیت کا نیر تاباں، اخلاص و وفا کا پیکر، مضطرب دلوں کے درد کا درماں، بھوکوں کی غذا کا آسامان، پیاسوں کا ساقی، ضرورت مندوں کی حاجت برآری کا ماوے وملجا، ایک دنیا کی امید برآری کا مرکز، آرزوں کی پوری ہونے کا محور، مسکینوں کا مسکن، یتیموں کا والی، فاقہ کشوں اور محنت کشوں کی تکمیل ضرورت کے سمندر، ضعیفوں اور کمزوروں کا مامن، رافت ورحمت کا مرکز، صوفی باصفا عارف باللہ حضرت اقدس مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری، قاسمی کی حسین ذات ہے، جو ملک برطانیہ کی زینت ہیں، درِ مسیح الملت کے ماہِ

درخشاں ہیں،قوم وملت کے لیے مسیحا ہیں،شب زندہ دار ہیں، آہِ نیم شبی کے حامل ہیں، سحر خیزی کے قائل ہیں، دردِدل کے ساتھ متصف ہیں، قلب صافی سے متصل ہیں، معرفت باری کی نعمت سے لطف اندوز ہیں، خدا بیزار سرزمین پر اللہ رب العزت کی معرفت کی روشنی بکھیرتے ہیں، خلق خدا کو خدا سے جوڑتے ہیں، انسانیت سکن ماحول میں انسانیت کا درس دیتے ہیں، اخلاق باختہ لوگوں میں اخلاقیات سکھاتے ہیں،عزت دریدہ معاشرہ میں عزت پانے کا ہنر بتلاتے ہیں، الفت ومحبت کے بھوکے سماج میں انسیت کا بیج بوتے ہیں،اور بیمار سماج کوتندرستی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ اتصاف انسانیت کے ساتھ انگلینڈ کے چپے چپے میں مواعظ دردِمحبت سناتے ہیں،جس میں سوز دروں کی کرب وبے چینی ہوتی ہے، وہ اس کے آرزومند ہیں کہ پوری زمین میں خلق خدا، بندۂ خدا بن جائیں، بندگی خدا میں لگ جائیں اور کوئی بندگی سے منحرف نہ رہے، حقیقی معنی میں حیوانیت سے نکل کر آدمی بن جائیں، بندگی خدا میں لگ جائیں۔ راہِ سلوک کے راہی کی رہبری کرتے ہیں، بیمارزدہ روح کا علاج تجویز کرتے ہیں، الغرض ہمہ اوصاف متصف شخصیت نے اپنے پیر طریقت کے قیمتی دروس کوافادہ عام کے لیے امت کے سامنے پیش کرنے کی ہمت کی ہے، تحقیق وتفتیش کے زیور سے آراستہ کرکے قبولیت کی دہلیز پر رکھ چھوڑا ہے۔ فجز اکم اللہ خیر الجزاء

حضرت والا کی زیر سرپرستی ”فضل الباری في درس البخاري“ کے اس جدید ایڈیشن کومنظر عام پرلانے میں (کتابت وتخریج ،حواشی وتصحیح اورطباعت وتزیین کے تمام مراحل میں) کئی حضرات کی حرکت وفکر اورمحنت ومساعی کارفرما رہیں جس کی تفصیل آپ ”مقدمۂ کتاب“ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اللہ رب العزت تمام حضرات کی جہود وکاوش کو قبول فرما کر صدقۂ جاریہ بنائے ،آمین۔

اس عاجز نے گرامی مرتبت حضرت اقدس مولانا عبدالرؤف صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے ناقابل تنسیخ حکم تحریر سے تحریر کے ذریعہ سعادت حاصل کی ہے، نہ کے تائید وتوثیق، اللہ رب العزت پوری امت مسلمہ کو فضل الباری سے استفادہ کی توفیق بخشے، مسیح الامت نوراللہ مرقدہ کے بابرکت کلمات سے خیرالامم کو متبرک فرمائے، علماء امت کو حضرت کے گوہربار کلام سے طلب گوہر کی ہمت ارزانی نصیب فرمائے، اخذ نکات کی توفیق دے، فوائد آمیز کلام سے استفادہ کا ہنر دے، ثمر آور کلام سے حصول ثمرات کا علم دے، جوہری دروس سے جوہر کشید کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے، آمین یا رب العامین ۔

اظہارمسرت

حضرت مولانامظاہرالحق صاحب مدنی مدظلہ

بانی جمعیۃ البرّ والرحمۃ/ شیخ الحدیث دارالعلوم محمدیہ گدرپور، اتراکھنڈ، انڈیا
خلیفۂ محی السنہ حضرت اقدس مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدلله رب العالمين، والصلاة و السلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله و أصحابه وأزواجه و أهل بيته أجمعين، أما بعد!

اسلامی علوم کا سرچشمہ اور بنیاد قرآنِ مقدس ہے اور پھر اسی کی تبیین وتشریح احادیثِ مبارکہ ہیں، اگر احادیثِ مبارکہ کو ایک طرف کردیں تو حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوجائے گا، اسی لیے مسلمانوں نے ابتدائے اسلام ہی سے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ احادیثِ مبارکہ کی طرف بھی خاص توجہ مبذول کی۔ چناں چہ بخاری شریف کی تصنیف کے پسِ منظر کے تعلق سے یہ بات مذکور ہے کہ حضرت اسحاق بن راہویہؒ کی مجلس میں — جس میں امام بخاریؒ بھی موجود تھے — یہ بات کہی اور بڑے سوز کے ساتھ کہی کہ کاش تم میں سے کوئی شخص ایسی کتاب لکھے جس میں اختصار کے ساتھ نبی ﷺ حدیثوں کو جمع کیا گیا ہو، کیوں کہ اب حدیثیں بہت ہوگئی ہیں اور ان کی سندیں پھیل چکی ہیں، اس لیے صحیح، جامع اور مختصر مجموعہ کی ضرورت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ لوگ احادیثِ مبارکہ کی طرف خصوصی توجہ رکھتے تھے، اور پھر احادیث کی جو خدمت امام بخاریؒ (جن کا اصل نام محمد، کنیت ابوعبداللہ اور لقب امیرالمؤمنین فی الحدیث ہے) نے انجام دی وہ اپنی جگہ پر بے مثال ہے۔

بخاری شریف کی تصنیف کے بعد اس کے تراجم اور شروحات کے ذریعہ بھی

بڑے بڑے علماء نے احادیث کی خدمت کو اپنا شعار بنایا اور حضور ﷺ حیات طیبہ کو کمال دیانت و احتیاط سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور پوری عقیدت و اخلاص کے ساتھ بے لوث خدمت انجام دی۔خدام حدیث کے اس زمرے میں ایک وقیع نام محدث جلیل مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ خلیفۂ اجل حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا بھی ہے۔حضرت موصوفؒ کو حق پروردگار نے توضیح و بیان کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، مشکل سے مشکل مسئلہ کو نہایت آسان طریقہ سے ذہن نشین فرمادیتے۔ بندہ کو حضرتؒ سے باضابطہ پڑھنے کا شرف تو حاصل نہ ہوسکا؛ مگر دارالعلوم میں رہتے ہوئے معمول کے ساتھ حضرتؒ کی خدمت میں حاضری دیتا تھا اور برابر حضرتؒ کی مجلس میں شریک رہتا تھا۔شعبان اور رمضان کی چھٹیوں میں حضرتؒ کی خدمت میں رہ کر بہت قریب سے حضرتؒ کو دیکھنے کا موقع ملا اور بخاری شریف کے آخری درس میں بھی شرکت میسر ہوئی، حضرتؒ کا اندازِ بیاں نہایت سادہ اور پرلطف ہوتا تھا،مجلس میں جتنی دیر تشریف فرما رہتے دینی علوم کے دریا بہاتے اور صلاح وتقوی کے موتی بکھیرتے رہتے۔حضرت ہردوئیؒ سے انسلاک سے پہلے بندہ حضرتؒ سے ہی بیعت تھا اور استقلال کے ساتھ حضرتؒ کی خدمت میں رہا ہے۔

حضرتؒ کی مجلس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ حاضرین مختلف سوالات لے کر آتے تھے اور حضرتؒ سوال کیے بغیر ہی ان کا جواب دے دیتے، کبھی دعا فرماتے اور لوگ حضرتؒ سے اپنی حاجتیں بیان کرنا چاہتے تو حضرت خاموش کردیتے اور پھر دعا میں خود ہی اس کی حاجت کا ذکر کرکے دعا فرمادیتے۔حضرتؒ کی زندگی — جو ایک نمونہ تھی — اب حضرتؒ کے افادات منظر عام پر آتے ہیں جو یقیناً آپ کی مجالس ہی کی طرح نورانیت سے بھرپور ہیں۔

زیر نظر کتاب (جدید ایڈیشن) کی بہت سی خصوصیات ہیں جو حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری (جو حضرت مسیح الامتؒ کے مشن پر کام کر رہے ہیں اور ماشاء اللہ متبع سنت ہونے کے ساتھ ساتھ امت کی اصلاح کا فریضہ بخوبی انجام دے رہے ہیں اور حضرت مسیح الامتؒ کی خلافت کا بھر پور حق ادا کرتے ہوئے مسترشدین و منسلکین کی علمی و روحانی پیاس کو سیرابی فراہم کر رہے ہیں) نے مقدمۂ کتاب میں تحریر فرمائی ہیں، ان کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں ؛ مگر ایک خصوصیت جو بندہ نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ اس کتاب میں جس شخصیت کے افادات قلم بند کیے گئے ہیں وہ بھی یگانۂ روزگار تھی، جس نے پوری زندگی لوگوں کی اصلاح وتربیت کرتے ہوئے گزار دی اور سنت نبوی ہمیشہ جس کا شعار رہا اور اس کے مرتب حضرت مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ بھی ماشاء اللہ صلاح وتقوی سے لبریز تھے۔

اب اس کی جدید طباعت مع تخریجات حضرت مولانا خلیل احمد قاضی صاحب (باٹلی، انگلینڈ) اور ان کے رفقا کی جماعت نے حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری کی زیر سرپرستی بڑی عرق ریزی اور لگن کے ساتھ انجام دی ہے، اللہ تعالی ان کی کاوش کو قبول فرما کر دارین میں بہترین بدلہ عطا فرمائے، آمین۔

اللہ زیر نظر کتاب کو قبولیت عامہ عطا فرمائے اور اس کی اشاعت میں جن لوگوں نے جان و مال سے محنت کی ہے اللہ سب کی محنتوں کو قبول فرما کر ذریعۂ نجات بنائے، آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

العبد مظاہر الحق مدنی

تأثرات

مولانا عظیم الدین صاحب ارنالوی
(استاذ الحدیث مدرسہ مفتاح العلوم تراج، ضلع سورت، گجرات)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمده و نصلي على رسوله الكريم، أما بعد:

کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کا شوق حقیر کو اول سے رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کا ذوق وسلیقہ اب تک پیدا نہ ہوسکا، اللہ تعالی یہ ذوق وسلیقہ بھی پیدا فرمادے، آمین۔

کچھ ماہ قبل حضرت مولانا خلیل احمد قاضی صاحب مدظلہ بانی ومہتمم مدینہ اکیڈمی، ڈیوزبری، برطانیہ وخلیفۂ شیخ الحدیث حضرت مولانا یوسف متالا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بذریعۂ ٹیلی فون بندے سے کہا کہ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب نوراللہ مرقدہ کے بخاری کے دروس جو عرصۂ دراز پہلے "فضل الباری فی دروس البخاری" کے نام سے چھپ چکے تھے۔ اس وقت حضرت مسیح الامتؒ کے خلیفۂ حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری — دامت برکاتہم — مقیم باٹلی، برطانیہ، اس کی جدید اشاعت کے متمنی وخواہاں ہیں اور عرصہ ہوا، اس کی کمپوزنگ بھی کرواچکے ہیں لیکن اس میں کچھ تکنیکی خامیاں معلوم پڑ رہی ہیں جس کی وجہ سے حضرت کو اطمینان نہیں ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر نظرِ ثانی کرلیں۔

چوں کہ مشہور زمانہ عالمی وبا کے چلتے لوک ڈاون ہو چکا تھا اور مدارس بھی بند ہو چکے تھے، اس لیے بندہ بھی تقریباً فارغ تھا۔ حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت اس

حقیر کو کبھی نصیب نہیں ہوئی، البتہ آپ کے فضائل ومناقب بہت سنے تھے اور آپ کی مطبوعہ مجالس سے کسی زمانہ میں استفادہ بھی کر چکا تھا اور عام علماء کی طرح حضرتؒ کی محبت بندے کے دل میں موجود تھی، حضرتؒ کے درسی افادات سے استفادہ کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا؛ اس لیے ”اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں“ کے مصداق بندے نے اس پیش کش کو فوراً منظور کر لیا بلکہ دونوں ہاتھوں سے لپک لیا اور الحمدللہ! کام بھی شروع کر دیا۔

نظرِ ثانی کے دوران بندے کو حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ علیہ کی تبحر علمی کا ادراک ہوتا گیا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، نحو، صرف، بلاغت، منطق، فلسفہ، تصوف، معاشیات، سماجیات، وہ کون سا فن ہے جو حضرتؒ کے ان دروسِ بخاری میں بندے کی نظر سے نہ گذرا ہو!، ان دروس کا مطالعہ کرتے ہوئے بندے کو تعجب ہوتا تھا کہ حضرتؒ درس سے پہلے کتنی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوں گے!۔ ظاہر ہے کہ فنونِ عدیدہ پر کامل دست رس کے بغیر ایسا درس ناممکن ہے۔

نظرِ ثانی کے دوران احادیث کی شرح سے متعلق حضرتؒ کی بہت سی باتیں حافظؒ کی فتح، علامہ عینیؒ کی عمدہ، علامہ کرمانیؒ کی الکواکب، علامہ قسطلانیؒ کی ارشاد الساری، علامہ کشمیریؒ کی فیض الباری اور بخاری کی شروحات سے ہٹ کر ملا علی قاریؒ کی مرقات، علامہ طیبیؒ کی الکاشف، علامہ عراقیؒ کی طرح التثریب، علامہ زرقانیؒ کی شرح الموطا، علامہ نوویؒ کی المنہاج، علامہ ابن رجب حنبلیؒ کی جامع العلوم والحکم، علامہ خطابیؒ کی معالم السنن، علامہ مناویؒ کی فیض القدیر، امام غزالیؒ کی احیاء وغیرہ۔ اسی طرح تفسیر کی کتابوں میں سے امام قرطبیؒ کی الجامع لاحکام القرآن، امام رازیؒ کی مفاتیح الغیب، امام بغویؒ کی معالم التنزیل، علامہ آلوسیؒ کی روح المعانی اور علامہ اسماعیل حقیؒ کی روح البیان وغیرہ۔ کتب فقہ میں علامہ ابن نجیمؒ کی بحر، علامہ کاسانیؒ کی بدائع، علامہ شامیؒ کی رد اور علامہ شرنبلالیؒ کی نورالایضاح

وغیرہ اوراس کے علاوہ نحو، صرف، بلاغت، منطق وغیرہ کتابوں میں مل گئیں لیکن ایسی بہت سی باتیں اور عجیب وغریب نکات بھی تھے جن کی تلاش کے لیے دسیوں کتابوں کی ورق گردانی کی لیکن کہیں ان کا سراغ نہ مل سکا۔

ممکن ہے کہ اس کو اس حقیر کی کم مائیگی اور قلت جستجو یا سستی وکاہلی پر محمول کیا جائے اور یہ کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں ہے کہ یہ حقیر تو لوگوں کی سمجھ سے بھی زیادہ کم علم اور کاہل وسست ہے لیکن اتنی ساری کتابوں میں تلاش کے باوجود ان نکات پر عدم ظفر یابی نے اس حقیر کو تو اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ یہ علمی نکات وہ چیز ہے جس کو کبھی ہم نے علم وہبی اور لدنی کے نام سے پڑھا تھا، جو اللہ تعالی اپنے محبوب بندوں کو ان کے تقوی وطہارت، زہد وقناعت، اعتماد وتوکل اور تواضع وانکساری جیسے عظیم اخلاق اور بلند اوصاف کے سبب سے نوازتے ہیں اور حضرت مسیح الامتؒ میں ایسے سینکڑوں اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ عالیہ کے وجود کا کون انکار کرسکتا ہے؟۔

ایسی عظیم علمی شرح اور عجیب وغریب نکات پر مشتمل دروس پر نظرِ ثانی کرتے کرتے اس وقت حد سے زیادہ تکلیف دہ محرومی کا احساس ہوا، جب اس کا سلسلہ "بَابٌ:الزَّكَاةُ مِنَ الإِسْلَامِ" پر پہنچ کر منتہی ہو گیا یعنی ابھی تو بخاری شریف کا کتاب الایمان بھی ختم نہیں ہو پایا تھا کہ حضرتؒ کے دروسِ بخاری ہی ختم ہو گئے۔ اس حقیر نے اس سلسلے میں تحقیق کی کہ کہیں سے باقی دروس مل سکتے ہیں یا نہیں تو پتہ چلا کہ حضرت مسیح الامتؒ تو بس یہیں تک بخاری شریف پڑھاتے تھے، اب سوائے ہاتھ ملنے کے اور کیا ہوسکتا تھا۔

لیکن اس دوران حضرت مولانا خلیل صاحب مذکور نے بتایا کہ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب دامت برکاتہم کے پاس حضرت مسیح الامتؒ کے شمائل ترمذی کے پہلے سبق کا آڈیو کیسٹ ہے اور حضرت چاہتے ہیں کہ اس کو کمپوز کیا جائے۔

بندے نے حامی بھرلی۔اس سبق کے بالکل شروع میں حضرت مسیح الامتؒ فرماتے ہیں کہ وہ بخاری شریف کی کتنی مقدار پڑھاتے تھے،ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''بخاری شریف توالحمدللہ! کئی دفعہ پڑھائی ہےلیکن مخصوص مخصوص جگہیں پڑھائی ہیں، بداءتِ وحی کی کیفیت کاباب پورا، کتاب الایمان پورا، کتاب الاضحیہ پوری، کتاب التفسیر پوری، کتاب الجہاد پورا، کتاب المغازی پوری پھر بخاری شریف کا آخری سبق پڑھایاہے۔''

توحضرت مسیح الامتؒ بخاری شریف کی اتنی کتابیں پڑھاتے تھےلیکن ہمارے پاس کتاب الایمان کےبھی پورےدروس نہیں ہیں۔اللہ تعالی ایسے حضرات کودارین میں بہتر سے بہتر بدلہ عطافرمائے جن کے پاس باقی کتاب کے دروس ہوں اورہمیں وہ دروس عطا کریں؛ تاکہ یہ عظیم علمی سرمایہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔اہل علم حضرات اس شرح سےاستفادہ کرکےخوداندازہ لگالیں گےکہ باقی دروس کی حفاظت سےغفلت نے ان کااورامت کاکس قدرنقصان کیاہے۔

اس شرح کے مطالعہ سےقاری پر یہ بات بھی واضح ہوگی کہ مدرسہ صرف تعلیم گاہ نہیں ہے بلکہ تربیت گاہ بھی ہے۔چنانچہ اس شرح میں قاری جہاں حضرت مسیح الامتؒ کی علمی موشگافیوں،فنی نکات،فقہی مقالات اورتصوف کی باریکیوں کانظارہ کرے گا، وہیں اسے حضرت کے دل میں طلبہ کی ہمدردی،آپ کے دل میں ان کی تربیت کی تڑپ، کڑھن اوراس کے نتیجے میں طلبہ کو کیے جانے والے دردمند خطاب اورنصیحت کے تازیانوں کادیداربھی ہوگایعنی یہ دروس محض شرحِ بخاری کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ معلمین ومدرسین کودرس وتدریس کاسلیقہ وطریقہ بھی سکھاتے ہیں۔

اللہ تعالی حضرت مسیح الامتؒ کوغریق رحمت فرمائیں، ان کے درجات بے حد بلند فرمائیں، ان کے خلیفۃ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب دامت برکاتہم کو اس عظیم شرح کو منظرِ عام پر لانے کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے، ان کی عمر میں صحت و عافیت کے ساتھ برکت عطا فرمائے، ان سے دین کے مزید کام لیں، اس شرح کو منظرِ عام پر لانے میں ادنیٰ سی سعی کرنے والے کو بھی اللہ تعالی بہترین بدلہ عطا فرمائے اور پوری امت کو اس شرح سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

عظیم الدین ارنالوی غفرلہ
استاذ مدرسہ مفتاح العلوم تراج، ضلع سورت، گجرات، ہند
مؤرخہ ۱۳: رجمادی الاخری ۱۴۴۲ھ
مطابق ۲۹: ردیسمبر ۲۰۲۰ء

مختصر سوانحی خاکہ صاحب درس

مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ

خلیفۂ اجل حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

ملت اسلامیہ کے جن عظیم المرتبت اولیاء اللہ، مصلحین وکاملین علماء نے امت کی روحانی، اخلاقی اور عملی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، لاکھوں تشنگانِ علوم نبوت وسلوک معرفت کو سیراب کیا، ان میں ایک عبقری شخصیت ولی کامل مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کی بھی ہے، جو اپنی گوناں گوں خصوصیات، کارہائے نمایاں اور فیض بے بہا کی وجہ سے تاریخ میں روشن ومنور رہیں گے، آپ اپنے خلوص وللّٰہیت، صلاح وتقویٰ، مردم شناسی ورجال سازی کی وجہ سے آج بھی زندہ ہیں؛ چناں چہ آپ کے پیغامات وارشادات زمان ومکان کی حدود کو عبور کرکے آنے والی نسلوں کے لیے منارہ نور ثابت ہورہے ہیں۔

از ولادت تا فراغت:

حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کا تعلق علی گڈھ کے مشہور شروانی خاندان سے تھا، ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں اپنے وطن سرائے برلہ ضلع علی گڈھ میں پیدا ہوئے، خاندان میں انگریزی تعلیم کا چرچہ وغلبہ ہونے کی وجہ سے انگریزی اسکول میں داخلہ کرادیا گیا، درجہ ششم تک سرکاری اسکول میں پڑھے؛ لیکن چوں کہ بچپن ہی سے طبیعت دین کی طرف راغب تھی، نمازوں کی پابندی، اذکار ونوافل کا دھیان اور دینی تعلیم حاصل کرنے کا شوق دامن گیر تھا؛ اس لیے سرکاری اسکول سے بددل ہوکر

عصری تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا، والد صاحب نے مجبور ہو کر دینی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی؛ چناں چہ آپ نے قرآن پاک قاری عبداللہ شاہ صاحب رحمہ اللہ سے پڑھا، علی گڈھ ہی میں آپ نے میاں جی عبدالرحمن صاحب مرحوم سے فارسی کی تعلیم حاصل کی، درسِ نظامی کی کتابیں شرح جامی تک اپنے وطن برلہ میں حضرت مولانا حکیم محفوظ علی صاحب دیوبندی رحمہ اللہ سے اور جلالین شریف حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب لکھنوی رحمہ اللہ سے پڑھی۔

اعلی تعلیم کے لیے ۱۳۴۸ھ میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور ۱۳۴۹ھ میں دورہ حدیث پڑھ کر درسِ نظامی سے فراغت پائی، دارالعلوم دیوبند میں آپ نے بخاری شریف شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب رحمہ اللہ سے اور دوسری کتابیں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی رحمہ اللہ، جامع معقول ومنقول حضرت مولانا رسول خاں صاحب رحمہ اللہ، امام المنطق والفلسفہ حضرت علامہ ابرہیم صاحب بلیاوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا مرتضی حسن صاحب چاندپوری رحمہ اللہ سے پڑھیں، فراغت کے بعد دو سال علوم وفنون کی تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند میں قیام پذیر رہے، اور مختلف اساتذہ سے قاضی مبارک، میر زاھد، شرح التشریح، شرح چغمینی، سبع شداد وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

بیعتِ سلوک:

طالب علمی ہی کے زمانے میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ سے بیعت کا شرف حاصل ہوا، تھانہ بھون آمد ورفت کا سلسلہ شروع کیا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے جن تلامذہ ومریدین کو مجاہدہ کی بھٹی میں تپا کر کندن بنایا تھا، ان میں آپ کا نامِ نامی بھی نمایاں نظر آتا ہے، تھوڑے ہی عرصہ میں تصوف وسلوک کی وادی میں قلب وذہن کو مصفّٰی پا کر ۱۳۵۱ھ میں

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے خلافت واجازتِ بیعت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو آپ سے فطری انسیت ومحبت تھی، تعلقِ اعتماد تھا، چناں چہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے جن گیارہ مخصوص خلفاء کے نام ایک اعلان میں تحریر فرمائے تھے، اس میں لکھا تھا : ''اپنے چند مجازین کے نام لکھتا ہوں کہ جن کے طرزِ تعلیم پر مجھے اعتماد ہے، ان میں سے جس سے چاہیں اپنی تربیت متعلق کرلیں''، ان گیارہ مخصوصین میں آپ کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔

تدریس واہتمام:

۱۳۵۷ھ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے انھیں جلال آباد کے مدرسہ مفتاح العلوم میں مدرس بنا کر بھیجدیا، یہ مدرسہ اس وقت ایک مکتب کی شکل میں منّی والی مسجد میں چلتا تھا، حضرت والا کی شبانہ روز جدوجہد اور مخلصانہ طرزِ عمل اور خاص وعام میں قبولیت کی وجہ سے چند ہی سالوں میں اس کا شمار ہندوستان کے بڑے مدارس میں ہونے لگا، مدرسہ کے بانی وسرپرست حضرت تھانوی رحمہ اللہ ہی تھے، حضرتؒ کی چشم وآبرو پر مرمٹنے والا یہ خلیفۂ صادق اپنے شیخ ومرشد کے حکم پر جلال آباد آیا، اور ایسا آیا کہ یہیں کا ہوکر رہ گیا، اسی لیے علی گڈھ (آبائی وطن) کی بہ نسبت جلال آباد سے ہی زیادہ شہرت وشناخت ہوئی۔

آپ نے اسی مدرسہ سے درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرمایا، درس نظامی کی چھوٹی بڑی تقریبا تمام کتابیں زیر درس رہیں، اس کے علاوہ مدرسہ کا انتظام وانصرام بھی آپ ہی کے سپرد تھا، چناں چہ آپ کی جہدِ مسلسل اور سعی بلیغ سے مدرسہ اور مسجد کی عظیم الشان اور دیدہ زیب عمارتیں تعمیر ہوئیں، آپ نے منصب اہتمام سے اپنی زندگی کی حسین بہاریں (مکمل چالیس سال) اس کی آب یاری میں صرف فرمائیں، اس کے بعد اپنے اکلوتے فرزند ارجمند حضرت بھائی جان (مولانا صفی اللہ خان صاحب) مرحوم کو مدرسہ کی باگ ڈور سپرد فرمائی، اپنا تعلق صرف صدر مہتمم کی حیثیت رکھا، تقوے کا یہ عالم تھا کہ اِس زمانے میں تنخواہ کا سلسلہ بالکلیہ منقطع

کر دیا تھا، عمر کے اس نہائی دور میں تدریس میں صرف بخاری شریف کا مشغلہ رہ گیا تھا جو کہ آخر حیات تقریبا پندرہ سال تک جاری رہا۔

بیعت وارشاد اور خانقاہی فیضان:

درس وتدریس کے ساتھ اپنے شیخ ومرشد حضرت تھانوی کے طرز پر بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی جاری فرمایا، تقریبا ۵٦ / سال کے طویل عرضے میں ہزاروں اور لاکھوں تشنگانِ سلوک وتصوف نے اس سر چشمہ ہدایت سے اپنی پیاس بجھائی، خانقاہ امدادیہ کے طرز پر جلال آباد میں ایک خانقاہ قائم کی، جو ہندو بیرونِ ہند کے سالکینِ معرفت کے ذکر سے معمور رہا کرتی تھی، حضرت والا تمام سالکین کی بذات خودنگرانی فرمایا کرتے تھے، اور سالک کے روحانی مرض کے لیے نسخہ شفا بھی تجویز کرتے، اصلاحی خطوط وکاپیوں کا باقاعدہ ایک سلسلہ رہتا، آپ کے یہاں جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ ایک عام مجلس ہوتی تھی، جس میں مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ کے علاوہ گردونواح کے مریدین کا بڑا مجمع ہوتا تھا، جس میں آپ ازخود اپنے مرشد حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات ومواعظ پڑھ کر سناتے، اپنے شیخ کی احسانی تعلیمات کو عام کرتے، جب کہ خاص مجلس عصر بعد خانقاہ میں ہوتی تھی یہ سلسلہ اخیر عمر میں یہیں منحصر ہو کر رہ گیا تھا۔

تصوف وسلوک میں یہ مقام حاصل تھا کہ خود آپ کے جلیل القدر استاذ گرامی حضرت مفتی سعید احمد صاحب لکھنوی رحمہ اللہ نے بھی حضرت تھانوی کی وفات کے بعد اپنے اس شاگرد کے ہاتھ پر بیعت کی، اس کے علاوہ ایک کثیر تعداد ملکی وغیر ملکی طالبین رشد وہدایت کی ایسی ہے کہ جو آپ کے حلقہ ارادت سے وابستہ رہی، جنہوں نے آپ کی تعلیم وتربیت سے فیض یاب کر عالم کو فائدہ پہنچایا اور افادہ کا یہ سلسلہ واسطہ بلاواسطہ تاحال جاری وساری ہے۔

تصنیف وتالیف:

حضرت والا نہ صرف یہ کہ صاحب قلم تھے؛ بلکہ اس میدان کے رہنما اور قلم کو راہِ اعتدال کی سمت دینے والے بھی تھے، مختلف موضوعات پر آپ کی متعدد کتابیں منصۂ شہود پر آئی، جن میں " شریعت وتصوف " نہایت اہمیت کی حامل کتاب ہے، جس میں آپ نے عقلا ونقلا ثابت کیا کہ شریعت وتصوف دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں؛ بلکہ دونوں باہم مربوط ہیں، اس کے علاوہ درجنوں مواعظ وملفوظات اور مجالس کے حصے بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے، جو اپنے وقت میں مقبول عام وخاص ہوئے، اسی طرح ایک علمی یادگار بخاری شریف کی درسی تقریروں کا مجموعہ " فضل الباری فی درس البخاری " بھی آپ کی باقیات علمیہ میں سے ہے، جس کو آپ کے ایک تلمیذ رشید اور معتمد خاص مولانا مفتی نصیر احمد صاحب رحمہ اللہ نے پانچ جلدوں میں مرتب فرمایا، جو اب جدید ایڈیشن کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

چند مشہور تلامذہ:

آپ ایک باکمال مرشد ومنتظم ہونے کے ساتھ کامیاب استاذ اور رجال ساز مربی ومصلح بھی تھے، چناں چہ آپ کے دست نگر سے تیار ہونے والے مردانِ باکمال کی ایک طویل فہرست ہے، جنہوں نے چہار دانگ عالم میں آپ کا فیض پھیلایا۔ ہم چند کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:

(۱) شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب لوہاروی ثم الکراچوی مہتمم جامعہ فاروقیہ وصدر وفاق المدارس العربیہ کراچی پاکستان

(۲) حضرت علامہ رفیق احمد صاحب بھیسانوی شیخ الحدیث جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد

(۳) مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ سابق صدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد

(۴) حضرت مولانا محمد یاسین صاحب شیخ الحدیث مفتاح العلوم جلال آباد

(۵) حضرت مولانا عقیل الرحمن صاحب زید مجدہم حال شیخ الحدیث مفتاح العلوم جلال آباد

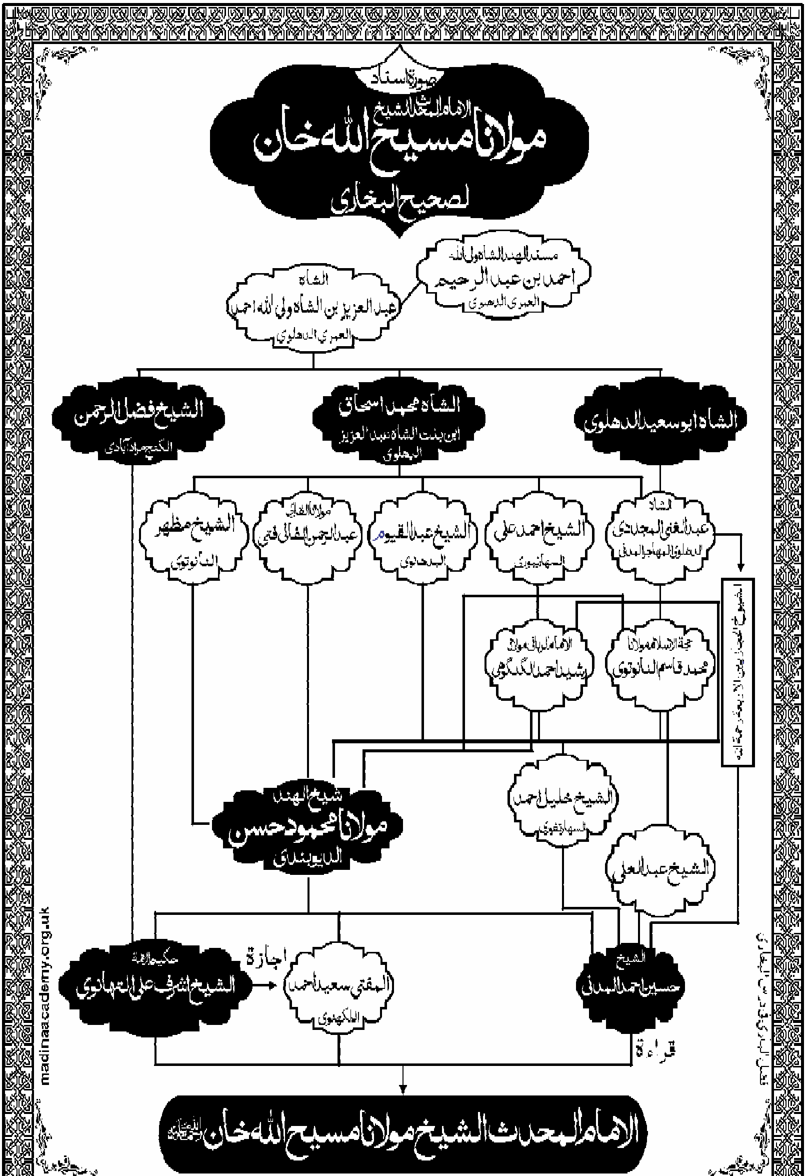
(۶) حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب میواتی، مفتی اعظم میوات۔

(۷) حضرت مولانا مفتی مہربان علی صاحب بڑوتی رحمہ اللہ ناظم تعلیمات جامعہ امداد الاسلام ہرسولی۔

وفات حسرت آیات:

مفتاح العلوم جلال آباد کے منصب اہتمام اور خانقاہ اشرفیہ (مسیحیہ) کی مسند سے علم وعمل اور آفتابِ رشد وہدایت کی روشنی پھیلا کر طالبین وسالکین کا یہ مسیحا ۸۳ / برس کی عمر میں ۱۷ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ، ۱۳ / نومبر ۱۹۹۲ء کو جلال آباد کے افق پر ہمیشہ ہمیش کے لیے غروب ہوگیا، یہیں "مفتاح الجنۃ" نامی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی، اور اپنے استاذ حضرت مفتی سعید احمد صاحب لکھنوی رحمہ اللہ کے بغل میں آسودہ خواب ہوئے۔

(مستفاد: حیاتِ مسیح الامت از مفتی رشید احمد صاحب میواتی رحمہ اللہ)


صورة اسناد
الامام المحدث الشيخ
مولانا مسيح الله خان
لصحيح البخاری
مسند الهند الشاه ولی الله
احمد بن عبد الرحيم
العمری الدهلوی
الشاه
عبد العزيز بن الشاه ولی الله احمد
العمری الدهلوی
الشيخ فضل الرحمن
الگنج مراد آبادی
الشاه محمد اسحاق
ابن بنت الشاه عبد العزيز
الدهلوی
الشاه ابو سعيد الدهلوی
الشيخ مظهر
النانوتوی
مولانا القاضی
عبد الرحمن الپانی پتی
الشيخ عبد القيوم
البدهانوی
الشيخ احمد علی
السهارنپوری
الشاه
عبد الغنی المجددی
الدهلوی المهاجر المدنی
الامام الربانی مولانا
رشيد احمد الگنگوهی
حجة الاسلام مولانا
محمد قاسم النانوتوی
شيخ الهند
مولانا محمود حسن
الديوبندی
الشيخ خليل احمد
السهارنفوری
الشيخ عبد العلی
حكيم الامة
الشيخ اشرف علی التهانوی
اجازة
المفتی سعيد احمد
اللكهنوی
الشيخ
حسين احمد المدنی
قراءة
الامام المحدث الشيخ مولانا مسيح الله خان
madinaacademy.org.uk

مختصر حالات مرتبِ کتاب

مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ

سابق استاذ حدیث وفقہ وصدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد

باِسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

ماضی قریب میں مغربی یوپی کے جن علماء وصلحاء کی علمی وفقہی، فکری وعملی اور اصلاحی وتبلیغی مساعی جمیلہ نے یہاں کے تاریک ماحول کو دینی وعلمی فضا میں تبدیل کیا، علاقہ کا علاقہ جن کے فیض سے روشن ومنور ہوا اور ایک بڑا خطہ جن کی دینی خدمات سے آج بھی مستفید ہو رہا ہے، ان میں مفکر ملت فقیہِ وقت استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت علم وعمل، زہد وتقویٰ اور فکر وعمل میں یکساں تھی، آپ کو قرآن وحدیث، تفسیر وفقہ، تجوید وقرأت میں غیر معمولی امتیاز وتفوق حاصل تھا، رجال سازی، اصلاح وتربیت اور دینی وتبلیغی جدوجہد میں اللہ تعالیٰ نے منفرد مقام عطا کیا تھا، یہاں آپ کے تعارف کا احاطہ کرنا ایک دشوار امر ہے؛ تاہم مختصراً تذکرہ پیش خدمت ہے۔

ولادت، تعلیم وتربیت:

آپ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں ضلع میرٹھ (حال ضلع باغپت) قصبہ بڑوت، گاؤں ادریس پور کے ایک عام اور متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے، والد ماجد کا نام علی جان بن رحمت علی تھا، آپ نے اپنی محنت اور شوق ولگن سے تعلیم حاصل کی، ۷، ۸ / سال کی عمر میں پرائمری اسکول میں داخل ہوئے، تایا ابا صوفی

عمر جان نے آپ کی ''بسم اللہ'' کرائی، اس کے بعد حفظ قرآن کے لیے گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر قصبہ بڑوت کی ''مرکزی مسجد پھونس والی'' میں داخلہ لیا۔

آپ نے اپنی فطری محنت اور خداداد ذہانت کی بدولت ۱۱ / ماہ کی قلیل مدت میں حفظ قرآن کی تکمیل کی، فراغتِ حفظ کے بعد کچھ عرصہ عصری تعلیم سے وابستہ رہ کر ۱۳۶۷ھ میں مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد میں داخل ہوئے، یہاں آپ کو ناظم جامعہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب لوہاروی رحمہ اللہ کی خاص تربیت اورنگرانی ملی، استاذ محترم کی خاص توجہ اورآپ کی رات دن کی جدو جہد کا یہ اثر ہوا کہ ساڑھے تین سال کی قلیل مدت میں درس نظامی اور مختلف علوم وفنون سے ۱۳۷۰ھ میں فراغت پالی، چند سال کے تدریسی وقفہ کے بعد تجوید وقرآت اور افتاء کے لیے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا، صدر القراء حضرت مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحب پرتاب گڑھی رحمہ اللہ سے تجوید وقرآت کی تعلیم حاصل کی، اورفقیہ زمن حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوری رحمہ اللہ سے خصوصی نظام کے تحت رسم المفتی وغیرہ کے علاوہ فتاوی کی تمرین ومشق میں درک حاصل کیا۔

تدریسی خدمات:

درسِ نظامی سے فراغت کے بعد اپنے گاؤں ادریس پور میں مکتبی نظام کا آغاز کیااور مکاتبِ اسلامیہ کے لیے بہترین قابلِ تقلید نظامِ تعلیم پیش کر کے دکھایا، اس کے بعد بزرگ اساتذہ کی جوہر شناس نگاہوں نے آپ کا انتخاب آپ کے مادر علمی مفتاح العلوم جلال آباد کے لیے فرمالیا، ابھی دوسال ہی ہوے تھے کہ استاذ خاص حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر دارالعلوم الاسلامیہ سندھ پاکستان چلے گئے، وہاں درجات عربیہ کی تدریسی خدمات انجام دیں؛ لیکن ایک سال بعد واپس مفتاح العلوم جلال آباد آگیے، اور مستقل دل جمعی سے ۳۵ / سال تک تدریسی خدمات انجام دی، جس میں از ابتدا تا انتہا علوم وفنون

کی مختلف کتابیں پڑھائیں، علمِ حدیث وعلمِ فقہ آپ کی توجہات کے خاص مرکز تھے، فن حدیث میں ترمذی شریف، ابن ماجہ، شمائل، طحاوی شریف، موطأین اور مشکوٰۃ شریف جیسی اہم کتابیں زیر درس رہیں، فن فقہ میں بالخصوص ہدایہ جیسی معرکۃ الآرا کتاب مسلسل آپ سے متعلق رہی، آپ درس ہدایہ میں پیچیدہ اور مشکل مسائل کی گتھیاں چٹکیوں میں سلجھادیا کرتے تھے، زبان عربی پر بھی گہری دسترس تھی، عبارت میں وارد ہونے والا اشکال واعتراض ترجمہ سے ہی رفع کردیتے، ہرفن پر حاوی ہوکر کلام کرتے، افہام وتفہیم پر خاص توجہ مرکوز رہتی تھی، چنانچہ یہ بات مسلم رہی کہ آپ کا درس بے حد مقبول تھا۔

فقہی خدمات:

علمی حلقوں میں مسندِ افتاء ایک اہم ترین منصب سمجھا جاتا ہے، مفتاح العلوم جلال آباد میں جبالِ علم وطبقۂ اساتذہ کے ہوتے ہوئے فتویٰ نویسی باتفاق رائے آپ کے سپرد ہوئی، مسندِ افتاء پر آپ نے اپنے آپ کو کبھی مستقل خیال نہ کیا، چناں چہ فتویٰ نویسی میں کئی سال تک یہ معمول رہا کہ پہلے مسودہ بنا کر اپنے شیخ ومرشد مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب علیہ الرحمہ کو ملاحظہ سے گزار کر حضرت والا کے دستخط کراتے، پھر حضرت والا کے زبانی سندِ اعتماد واجازت پر اپنے دستخط شروع کیے، آپ کی علمی وفقہی مہارت وصلاحیت پر حضرت جیؒ کو کلی اعتماد تھا، جس کا متعدد مرتبہ اظہار بھی فرماتے تھے۔

۱۳۹۶ھ میں جلال آباد میں شعبہ تکمیل افتاء کا قیام عمل میں آیا تو اس شعبہ کی تمام ذمہ داریاں اور تمام کتب کی تدریس وتمرین بھی آپ ہی سے متعلق ہوئیں، المختصر! آپ ایک طویل عرصہ تک منصبِ افتاء کی صدارت پر فائز رہے، عرف عام سے گہری واقفیت اور مسائل کے جزئیات پر بصیرت تھی، آپ کے فتاویٰ تصلب فی الدین کا مظہر ہوتے تھے، وقت کے اکابر علماء ومفتیان کرام (بالخصوص

دارالعلوم دیوبند، مظاہرعلوم سہارنپور کے ارباب افتاء) کوبھی اعتماد تھا، چناں چہ آپ نے ''رسالہ الجمعۃ'' نامی ایک طویل فتویٰ مرتب فرمایا تو اس پر صدر مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں تصویب فرمائی: ''**التحقیق انیق وصاحب التخریج نجیح**'' اس کے علاوہ متعدد علماء وفقہاء کے اعتراف واعتماد کی ایک طویل تفصیل ہے، ۷/ جلدوں پر مشتمل آپ کے فتاوی کا مجموعہ ''فتاوی مفتاح العلوم المعروف بہ فتاوی نصیریہ'' تادم تحریر طباعت واشاعت کے مرحلہ میں ہے، فتاویٰ کا یہ مکمل ذخیرہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا محمد کامل صاحب مدظلہ ناظم اعلیٰ ادارہ فیض مسیح الامت بڑوت کی مساعی جمیلہ سے تخریج وتعلیق کے ساتھ منظر عام پر آرہا ہے ان شاء اللہ۔

تحریک قیامِ مدارس ومکاتب:

تدریسی مصروفیات کیساتھ جس چیز کوآپ نے سب سے زیادہ محسوس کیا وہ قوم وملت کی بے دینی اور جہالت وضلالت تھی، دینی تڑپ اورفکر ولگن دامن گیرہوئی، اسی جذبہ صادق اور اور اصلاح معاشرہ کی لیے آپ نے ''**انجمن اتحاد وترقی**'' کی صدارت قبول فرمائی۔

قوم وملت کوزیورِتعلیم سے آراستہ کرنے اوران کی دینی تعلیم وتربیت کی غرض سے جہالت وناخواندگی کے ماحول میں علمِ دین کی شمع جلاکر '' انجمن تعلیم وترقی'' کی بنیاد ڈالی، اس کے تحت اپنے تلامذہ وعلماء کوشامل فرما کر قریہ قریہ اور بستی بستی مدارس ومکاتب کے قیام کواپنا مشن بنایا۔

اس تحریکی میدان میں آپ کواُجڈ دیہات کے ضدی لوگوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، بے تکی اور تلخ باتیں سننی پڑی، کڑوی کسیلی باتوں کے باوجود آپ صبر وہمت کے کوہِ گراں بنے رہے، جس پر اللہ نے کامیابی سے نوازا۔

آپ کی سچی لگن اور جدو جہد ہی کا نتیجہ تھا کہ اس خطہ میں تین درجن سے بھی زائد مدارس ومکاتب قائم ہوئے، جن میں سے متعدد مدارس آج بھی بڑے پیمانے پر علمی ودینی خدمات انجام دے رہے ہیں، مدرسہ عربیہ امدادالاسلام ہرسولی، مدرسہ عربیہ امدادالعلوم کھیالی، مدرسہ بلاس پور اور مدرسہ اشاعت الاسلام رٹھوڑہ وغیرہ آپ ہی کے قائم کردہ ہیں، جو بلاشبہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ بنے ہوئے ہیں۔

بیعت واجازت:

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو تصوف وسلوک سے طبعی مناسبت تھی، آپ کی بود و باش اور شب وروز کے معمولات متصوفانہ تھے، درسی تقریروں میں بھی سلوک کے نکات ایک خاص انداز سے بیان فرماتے، آپ زمانۂ طالب علمی ہی میں مسیح الامت حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ سے بیعت ہو گئے تھے، اور ایسے وابستہ ہوے کہ پھر تاحیات کسی دوسری جگہ کا خیال بھی نہ آیا، اصلاحی خطوط وکاپیاں لکھنے کا مستقل معمول رہا، حضرت والا سے روحانی طور پر استفادہ واستفاضہ کرتے رہے، اسی لیے حضرت والا کے ممتاز خوشہ چینوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے، اپنے مرشد کی احسانی تعلیم وتربیت، ایمانی حرارت اور نفس گرم کی صحبتوں کا اثر تھا کہ جب آپ سلوک کے موضوع پر گفتگو فرماتے تو صاف محسوس ہوتا کہ معارف مسیح الامت کے امین ہی نہیں؛ بلکہ محقق بھی ہیں، ہر سوال کے جواب میں آپ ایسی بات فرماتے کہ جس سے سلوک کے کسی نہ کسی امر کی طرف اشارہ ہو جاتا۔

حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ کے وصال کے بعد آپ نے فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ ناظم اعلیٰ مظاہر علوم سہارنپور کی طرف رجوع فرمایا، حضرت والا نے اصلاحی کاپیاں دیکھنے کے تھوڑے سے وقفہ بعد ہی اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا۔

تصنیف وتالیف:

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو منجانب اللہ تصنیف وتالیف کا ملکہ عطا ہوا تھا، اس ذوق کی عکاسی درس نظامی کی سندِ فراغت پہ وہ شہادت ہے جسے آپ کے استاذ خاص حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمہ اللہ نے سند پہ رقم کرایا تھا، شہادت ملاحظہ فرمائیں: **وله مناسبة بالعلوم تامة يقدر بها على التدريس والتاليف والتحشية والافادة بابلغ وجه بعونه تعالیٰ وحسن توفيقه۔**

آپ کی زندگی ہمہ جہت مصروفیت کی حامل تھی، تدریسی سلسلہ، مدارس و مکاتب کے قیام کے لیے تحریکی خدمات اور منصب افتاء کی مستقل ذمہ داریوں کے باوجود ١٥ / تصانیف ورسائل آپ کے قلم سے معرض وجود میں آئے۔

آپ کا سب سے بڑا تالیفی کارنامہ علم حدیث میں " **فضل الباری فی درس البخاری**" کی جمع وترتیب ہے، جسے آپ نے شبانہ روز جدوجہد، جانفشانی وعرق ریزی سے صاحبِ درس حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ کے ذوق ومزاج کا خیال رکھتے ہوئے ٥ / جلدوں میں مرتب فرمایا، اس کے علاوہ رسالہ الجمعۃ، اکابر کا فتویٰ، خواب کی تعبیر کیا ہے، جدید تعلیم نے مسلمانوں کو کیا دیا، اور فتاوی وغیرہ کا مطبوعہ وغیر مطبوعہ ایک بڑا قلمی ذخیرہ چھوڑا۔

آپ کی تحریرات علمی تحقیقات کا مظہر، تبحر علمی اور وسعتِ مطالعہ کی غماز ہیں، تالیفی منہج میں اکابر علمائے دیوبند بالخصوص حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے پیروکار تھے، ملاحظہ کرنے سے یہی بات واضح ہوتی ہے۔

امتیازات وکمالات:

اللہ رب العزت نے آپ کو بے شمار خوبیوں اور اوصاف وکمالات سے نوازا تھا، تجوید وقرأت کے آپ ماہر تھے، آپ کی خوش گلوئی مفتاح العلوم جلال آباد میں معروف تھی، اذان پڑھنے کی بات ہو یا نماز پڑھانے کی سعادت، آپ بخوشی انجام دیدیا کرتے تھے، آپ ایک خاص لہجہ میں کلام پاک پڑھتے تھے، آپ کی

اقتدا میں نماز ادا کرنے والا یہ محسوس کیے بغیر نہ رہتا کہ ایک عاشق صادق نماز پڑھا رہاہے، اہل اللہ بالخصوص حضرت مسیح الامت کو بھی نماز میں ایک سکون ولطف ملتا تھا، بسا اوقات اپنے متعلقین سے فرماتے کہ ’’ نماز ایسی پڑھایا کرو جیسی مفتی نصیر پڑھاتے ہیں‘‘۔

انسان سازی کا خاص ملکہ تھا،آپ کی زیر تربیت رہنے والے دیہات کے طلبہ صحیح عقل وفہم کے مالک بن جاتے تھے،منکر پر نکیر کا خاص وصف آپ کی طبیعت میں شامل تھا،غیر شرعی امور کے صدور پر خاموشی یا چشم پوشی آپ کے لیے مشکل ہوجاتی،عزیمت پر عمل کرتے ہوے روک وٹوک اور مناسب تنبیہ فرماتے، جس میں حق گوئی،بے باکی،روشن دماغی اور حاضر جوابی بھی کارفرما ہوتی تھی۔

آپ کے امتیازات میں پرکشش اور جاذب نظر تحریر بھی ایک نمایاں وصف ہے، آپ کا خط نستعلیق اور مثالی تھا، تحریر دیکھ کر قاری کا جی خوش ہوجاتا،علاوہ ازیں اتباعِ سنت اور تواضع وسادگی میں آپ کی شخصیت جامعہ اپنی مثال آپ تھی،آپ کے ایک تلمیذ رشید مفتی محمد طیب صاحب رٹولوی رقم طراز ہیں :

> ’’خلاصہ کے طور پر اتنا ضرور عرض ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو بیک وقت عظیم مفتی،خوش الحان قاری،بہترین خطاط،راہِ طریقت کا شناور،تربیت ورجال سازی کا ماہر،قومی وملی احساس کا حامل، عابد وزاہد، اردو وعربی کا بہترین ادیب، بے مثال مدرس ومحقق،سچا عاشق رسول اور عاشق خدا بھی ہو کم ہی پیدا ہوتے ہیں،اگرچہ ہمارے علم میں تو جب سے ہم نے ہوش وخرد کے ناخن لیے ہیں آج تک بھی نہیں ہے‘‘

وفات:

آپ نے اخیر عمر میں بڑی جد وجہد اور محنت ومشقت سے بڑے منصوبے اور

بلند عزائم کے ساتھ بڑوت میں ایک مدرسہ قائم کیا، حضرت جلال آبادی کی نسبت پر ''ادارہ فیض مسیح الامت'' نام تجویز فرمایا، مرشد ثانی فقیہ الاسلام حضرت سہارن پوریؒ سے سنگِ بنیاد رکھوایا، مدرسہ ہذا اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھا کہ داعی اجل کا پروانہ آ گیا، ۲۱ /محرم الحرام ۱۴۲۰ھ، مطابق ۸ /مئی ۱۹۹۹ء بہ روز ہفتہ ایک بجے مالک حقیقی سے جا ملے، مدرسہ ہذا کے وسیع صحن میں عشا کے بعد تدفین عمل میں آئی۔

(ماخوذ از : تذکرۂ نصیر۔ مرتب : مولانا محمد کلیم نعمانی صاحب حفظہ اللہ)

مختصر تعارف :

حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم

(خلیفہ حضرت مسیح الامت نوراللہ مرقدہ)

ولادت وتعلیم:

آپ نے ۲۴ /صفر ۱۳۷۰ھ مطابق ۵ / دسمبر ۱۹۵۰ء کو ہندوستان صوبہ گجرات (ضلع سورت) قصبہ لاج پور ایک علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں، آپ کے والد بزرگ وار ایک متدین عالم اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب مجددی رحمہ اللہ کے خلفائے اجل میں سے تھے، دادا جان حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ بھی صاحبِ تصنیف ایک جید عالم دین تھے، المختصر آپ کا تعلق ایک علمی خانوادہ سے ہے۔

آپ نے اپنے وطن لاجپور ہی مدرسہ اسلامیہ میں دینی تعلیم کی ابتدا کی، اسی کے ساتھ گجراتی اسکول سے بھی وابستہ ہوئے، فارسی وعربی تعلیم کے لیے والد محترم نے فلاح دارین ترکیسر ضلع سورت کا انتخاب کیا، یہاں حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی رحمہ اللہ اور حضرت مفتی محیی الدین صاحب بڑودوی رحمہ اللہ وغیرہ سے دوسال کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے ضلع کے ایک دوسرے ادارے جامعہ حسینیہ راندیر میں داخل ہوئے، یہاں حضرت مولانا ہاشم صاحب بخاری رحمہ اللہ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا اسلام الحق صاحب سے ایک سال عربی کی کتب پڑھنے کے بعد صوبہ کی مشہور دینی درس گاہ جامعہ اسلامیہ

تعلیم الدین ڈابھیل کے لیے رخ کیا، جہاں سے ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۹۷۲ء میں درس نظامی کی تکمیل کی، یہاں آپ کے اساتذہ میں بالخصوص شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی رحمہ اللہ، مفتی محمد اسماعیل صاحب کچھولوی زید مجدھم اور مفتیٔ گجرات حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خان پوری دامت برکاتہم وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

فراغت کے بعد علوم ظاہری میں مزید جلا واستفادے کے لیے ام المدارس دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا، یہاں ایک سالہ قیام کے دوران کبار علمائے وقت بالخصوص حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ سے علوم وفنون کی تشنگی دور کی۔

بیعت واصلاحی تعلق:

آپ علوم ظاہری سے فراغت کے بعد علوم عرفانی اور تعلیمات احسانیہ کی طرف متوجہ ہوئے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، راہِ سلوک کی ابھی کچھ منزلیں ہی طے ہوئی تھیں کہ حضرت شیخ الحدیث جوارِ رحمت میں چلے گئے، اس کے بعد راہ سلوک کے اس مسافر نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفۂ اجل مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب علیہ الرحمہ کی طرف رجوع فرمایا، اور تھوڑے ہی عرصے میں آپ اجازت وخلافت سے شرف یاب ہوئے۔

دینی وتربیتی خدمات:

۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء میں آپ نے ہندوستان سے برطانیہ کا رخ کیا اور بریڈ فورڈ شہر کی مسجد قبا میں نائب امام مقرر ہوئے، چند مہینہ بعد بریڈ فورڈ سے شہر باٹلی منتقل ہوے اور جامع مسجد میں بحیثیت امام وخطیب دینی خدمات انجام دینی شروع فرمائی، یہاں اس مسجد میں ۴۳/ سال تک ملت کے نونہالوں اور نوجوانوں

کی تعلیم وتربیت میں مصروف عمل رہے، درسیات کی مختلف کتابیں پڑھائیں اور اس دوران پانچ سو سے بھی زائد طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا، طلبہ کی اس تعداد میں بہت سے عالم وفاضل ہوکر اپنے مقامات پر دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ فی الحال اسی مسجد کے زیر اہتمام ''مدرسہ تعلیم الدین'' میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، حدیث کی مشہور کتاب شمائل ترمذی اور امام بخاری رحمہ اللہ کی تالیف الادب المفرد آپ کے زیر درس ہے، ان کتب کا درس ایک خاص شان اور اہتمام سے ہوتا ہے، الادب المفرد کے درس کے افتتاح کے موقع پر آپ کے استاذ گرامی مفتیٔ گجرات حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خان پوری دامت برکاتہم کا دعائیہ پیغام بھی موصول ہوا، حضرت والا نے حدیث کے ثمرات وبرکات سے مالا مال ہونے اور بارگاہ ایزدی میں قبولیت کی دعا سے سرفراز فرمایا، حدیث کے ان دروس میں طلبہ وعلماء کے علاوہ قرب وجوار سے عوام بھی شریک ہوتی ہے، اس طرح ایک بڑا حلقہ آپ کے علوم وحکمت سے فیض یاب ہورہا ہے۔

تلقین وارشاد:

١٤٣١ھ مطابق ٢٠١٠ء سے آپ نے امامت وخطابت کی سبک دوشی کے بعد بالخصوص تلقین وارشاد کی طرف توجہ مرکوز فرمائی، اصلاحی بیانات اور مجالس کا سلسلہ شروع ہوا، متعلقین وسالکین کا رجوع ہوا، روزمرہ مقبولیت میں اضافہ کی وجہ سے یومیہ معمولات کے علاوہ رمضان المبارک کی خاص مجالس اور اصلاحی بیانات کو دنیا بھر میں نشر کیا جانے لگا، جس کو بحمد اللہ ہزاروں کی تعداد میں سنا جارہا ہے۔

اللهم زد فزد۔

سلسلۂ افادات:

حضرت الاستاذ کے مواعظ کی ایک ضخیم جلد بنام ''فیضان عبد الرؤف'' طبع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے، اس کے علاوہ بعض مواعظ کا انگریزی زبان میں ترجمہ

ہوکر مختلف رسائل میں شائع ہو چکا، آپ کے علوم وفنون سے تالیفات کا جو خزینہ پذیرائی حاصل کر چکا اس کی فہرست یہ ہے۔

(۱) عبادت واخلاق کی اہم باتیں مع رسالہ روشنی کے منارے (۲) فضائل سلام اور اس کی حکمتیں (۳) آسان حج وعمرہ (۴) عمل مختصر اور ثواب زیادہ (۵) الادعیۃ النافعۃ (۶) صوم وسلام مع فضائل مکہ مدینہ (۷) فضل الباری فی درس البخاری، ہم دست یہ کتاب پہلے سے مطبوع تھی، اس پر تخریج وتعلیق کا یہ کام آپ ہی کی زیر سر پرستی انجام کو پہنچا۔

اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کا سایہ عاطفت دراز فرمائے اور علوم الہیہ ورحمت ربانیہ کے پھیلنے کا ذریعہ بنائے، آمین فقط

(از خلیل احمد قاضی عفا اللہ عنہ)

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ
سابق استاذ حدیث وفقہ وصدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد شاملی

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات جامع جمیع کمالات جو نور السمٰوات والارض ہے، وہاں سے نور وہدیٰ کے انوارات بذریعۂ وحی جو سراجاً منیراً آقائے دوجہاں تاج دارِ مدینہ ﷺ کے قلبِ منور پر نازل ہوئے، وہ انوار امت کے ان انفاسِ قدسیہ کے قلوب مزکّیٰ پر منعکس ہوتے ہیں جو اپنی غایت صفا وجلائے باطن کی وجہ سے غایتِ قرب کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں، اسی طرح اس نورِ نبوت سے کتنے ہی اہلِ دل کے قلوب جگمگاتے رہے اور جگمگاتے رہیں گے۔

جو انوار بذریعۂ وحی قلبِ نبوی پر نازل ہوئے، ان میں وحئ متلو کو قرآن اور غیر متلو کو حدیث کہا جاتا ہے، یہ وحئ غیر متلو فی الحقیقت وحئ متلو قرآنِ پاک ہی کا بیان ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ [النحل: ۴۴]۔

اس فنِ حدیث کی شرافت، عظمت وجلالتِ شان اس کے موضوع ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا موضوع نبئ کریم ﷺ کی ذاتِ پاک بہ حیثیت رسول ہونے کے ہے، اور آپ کے اقوال، افعال واحوال کو اس میں بیان کیا جاتا ہے، اس کی غرض سعادت دارین حاصل کرنا ہے۔

ہر فن کچھ خاص اوصاف وکمالات کو چاہتا ہے، تب کہیں اس میں درک حاصل ہوتا ہے، اور کوئی صاحبِ فن بنتا ہے، پھر جیسا فن اسی کے مناسب وہ اپنے

طالب میں اوصاف کو چاہتا ہے، اسی اصول کے مطابق علمِ حدیث جس کا موضوع ذاتِ نبوی ہے، اس کا مقتضی ہے کہ اس کا بھی صاحبِ فن وہی ہوگا، جو عاشقِ رسول ہوگا، اور اپنے جمیع اقوال، افعال واحوال میں کامل متبعِ سنتِ نبوی ہوگا، وہی اس فن کا رازداں ہوگا، رمز شناس ہوگا، محرمِ راز ہوگا اور صاحبِ درک ہوگا۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک تو کسی فن کی وہ تعبیرات ہوتی ہیں، جن میں مدوّن کر کے وہ فن پیش کیا جاتا ہے اور ایک فن کی کنہ اور حقیقت ہوتی ہے، جسے ان تعبیرات کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے، اصل صاحبِ فن وہی ہوتا ہے جس کو ان تعبیرات سے گذر کر اصل حقیقتِ فن کا درک حاصل ہو جاتا ہے اور یہ ایک عام تجربہ کی بات ہے، ایک ایسا شخص جو نہایت فہیم و ذکی ہو، اور اس کو اپنے آقا کے ساتھ کمالِ محبت و اطاعت کا تعلق ہو اور ان اوصاف کی وجہ سے آقا کے ہاں اس کو کمالِ قرب کا مرتبہ حاصل ہو، ایسا شخص اپنے آقا کے کلام کے منشا و مقصود کو بالکل ٹھیک، صحیح صحیح سمجھ جائے گا، آقا کے اشارے، کنائے بھی اس کے لیے مثلِ تصریحات کے ہوں گے، وہ تعبیر سے پہلے کلام کا منشا، موقع اور محل دیکھے گا، اور کامل طریق پر آقا کی مرضی کو بجالائے گا، برخلاف اس کے جس کو آقا سے قرب حاصل نہیں، اس نے صرف آقا کے احکام و فرامین کی کتابیں پڑھی ہیں، وہ تعبیرات ہی میں الجھ کر رہ جائے گا، جگہ جگہ اس کو احکام میں تعارض نظر آئے گا، جس سے فرار کی خاطر وہ ایسی راہ اختیار کرے گا جو آقا کے منشا کے بالکل خلاف ہوگی۔

الحاصل علم حدیث کے صاحبِ فن کا بھی یہ طغرائے امتیاز ہے کہ وہ عاشق ومتبعِ رسول ہو، تب اس کے قلب پر انوارِ نبوت کا انعکاس ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ علمائے ربانیین اہل اللہ وصوفیائے محققین کو کبھی بھی تعبیرات میں تضاد نظر نہیں آتا، ہر حکم کا محمل انھیں صاف نظر آتا ہے، چوں کہ جس نورِ بصیرت سے وہ نصوص کو دیکھتے ہیں، وہ انوارِ نبوت ہی کا عکس اور پرتو ہوتے ہیں، اسی کو اتَّقُوا فِرَاسَةَ

الْمُؤْمِنِ، فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ (١) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ علم حدیث ایسا فن ہے جو سارے ہی علومِ دینیہ کی اصل ہے، یہ قرآن کی تفسیر بھی ہے اور فقہ کی اصل بھی ہے اور تصوف کا ماخذ بھی۔

لہٰذا وہی رجال اس فن کے صاحبِ درک ہوتے ہیں، جو ان تمام فنون میں مہارت رکھتے ہوں، چوں کہ یہ فن اس درجہ مہتم بالشان ہے؛ اس لیے اس فن میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں، اللہ تعالیٰ ان تمام خادمانِ حدیث کو جمیع امتِ مسلمہ کی جانب سے جزائے خیر نصیب فرمائے اور ان کی قبروں کو نور سے منور فرمائے، اس فن میں بخاری شریف کو اللہ تعالیٰ نے ایک امتیازی شان نصیب فرمائی ہے اور رسولِ اکرم ﷺ نے رویائے صالحہ میں اس کو اپنی کتاب فرمایا، نیز پوری امت نے صحیح بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کیا (٢)، بلایا اور مصائب کے وقت اس کو ختم کر کے اللہ رب العزت سے دعائیں مانگنے کا دستور بھی سلف سے چلا آیا ہے (٣)۔

یہ تفصیل تو آپ ان شاء اللہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں پڑھیں گے کہ انھوں نے کس خلوص وللّٰہیت، عشقِ رسول ومحبتِ خداوندی سے سرشار ہو کر اپنی اس صحیح بخاری کو تالیف فرمایا تھا، جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے یہ مقبولیت نصیب فرمائی، میرا منشا صرف یہ بیان کرنا ہے کہ بخاری شریف کے درس کو بھی دوسری کتبِ حدیث کے درس پر وہی فوقیت اور امتیاز رہا ہے، جو صحیح بخاری کو دوسری کتبِ حدیث پر رہا ہے، امت کے نہ معلوم کتنے علمائے محققین نے اس کی

---

(١) سنن الترمذی، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رضی الله تعالی عنه، بَابٌ: وَمِنْ سُورَةِ الحِجْرِ، رقم الحديث: ٣١٢٧.

(٢) المقدمة للإمام النووی من شرح صحيح مسلم ص ١۴.

(٣) ہدی الساری مقدمۃ فتح الباری: ص.١٦:

شروحات لکھی ہیں، جن کی صحیح تعداد بھی سوائے اللہ رب العزت کے کسی کے علم میں نہیں ہے اور اس کے اصحابِ درس وہ مشائخ شریعت وطریقت، صاحبِ نسبت اہلِ دل رہے ہیں، جن کے قلوب انوارِ نبوت سے منور اور روحِ بوئے محمدی سے معطر رہی ہے، انھیں انفاسِ قدسیہ میں آقائی واستاذی، زبدۃ العارفین، عمدۃ الکاملین حضرت مسیح الامت جناب مولانا مسیح اللہ خاں صاحب شیروانی جلال آبادی دامت برکاتہم (۱) کی ذاتِ ستودہ صفات بھی ہے۔

آپ کا بخاری شریف کا درس نرالی شان کا ہوتا ہے، جس میں دل کا درد بھی ہوتا ہے اور علم کی شان بھی، آئندہ عمل کی ترغیب بھی ہوتی ہے اور حال کا محاسبہ بھی، جس میں اربابِ علم نفیس علمی بحثوں کو غنیمت جان کر ان علمی جواہر پاروں سے اپنے دامن بھرتے ہیں تو اہل دل اپنے درد کی باتیں پاکر مسرور ہوتے ہیں، طالبانِ اصلاح نفس کی بیماریوں کا علاج اور اوصافِ حمیدہ واخلاقِ رذیلہ کا بیان سُن کر دوائے دل پاتے ہیں؛ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ حضرت والا دامت برکاتہم کے درس کی تقاریر کو ضبط کیا جائے اور اس طرح بہ قاعدۂ **اَلْعِلْمُ صَيْدٌ وَالْكِتَابَةُ قَيْدُهُ** (۲) ، ان علمی جواہر پاروں کو، ان دردِ دل کی باتوں کو، ان شریعت وطریقت کے رموز کو، ان دوائے دل کے نسخوں کو، ان مربیانہ نصائح کو قلم بند کر کے محفوظ کردوں؛ تاکہ حاضرین وغائبین سب ان سے مستفیض ہوں، اور حسبِ ارشادِ نبوی **اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ** (۳) میرے لیے بھی ذریعۂ نجات بن جائے۔

گو ان تقاریر کے ضبط کرنے میں، میں نے اپنی سی سعی خوب کی ہے؛ مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے مِن وعَن ان تقاریر کو ضبط کردیا ہے، نہ جانے کہاں

(۱) حضرت ۱۷/جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۲/نومبر ۱۹۹۲ء بہ روز جمعرات بعد عشاء وفات پاگئے تھے۔
(۲) دیوان الإمام الشافعی ص/ ۸۷، دار المعارف دیوبند.
(۳) سنن الترمذی، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ تعالی عنہ، بَابُ مَا جَاءَ الدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ، رقم الحدیث: ۲۶۷۰.

کہاں مجھ سے ان کے ضبط کرنے میں سہو ونسیان ہوا ہو؛ لہٰذا اہل علم کی خدمت میں گذارش ہے کہ اگر کہیں غلطی دیکھیں تو اُسے مرتب کی خطا سمجھیں، حضرت والا رحمہ اللہ کی ذات اس سے بَری ہے، یہ ایک طریق ہے کہ کسی کتاب یا درس کی کچھ خصوصیات کو ذکر کیا جاتا ہے؛ تا کہ ان حضرات کے سامنے جنھیں اس درس میں شرکت کا موقع نہیں ملا، ایک تعارفی خاکہ آجائے؛ اس لیے ارادہ کررہا ہوں کہ حضرتِ والا رحمہ اللہ کے درس کی بہت سی خصوصیات میں سے بہ طورِ تعارف چند خصوصیات ذکر کردوں؛ مگر قلم لرزتا ہے کہ کس عنوان سے ان خوبیوں کو جمع کروں جن کا ضبط کرلینا میرے احاطۂ قلم سے باہر ہے۔

مگر پھر بھی حسبِ قاعدۂ مَا لَا یُدْرَكُ كُلُّهُ لَا یُتْرَكُ كُلُّهُ (۱) حضرتِ والا کے درس کی چند خصوصیات ذکر کرنے کے سعادت حاصل کررہا ہوں؛ تا کہ اپنا نام بھی ان علمی جواہر پاروں کے قدردانوں میں ہوجائے۔

خصوصیات درس بخاری

(۱) آپ کا طرزِ بیان نہایت تحقیقی ہوتا ہے، اکثر مواقع پر ہر لفظ کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق بیان فرمانے کے بعد ان دونوں معنی کی مطابقت کو ظاہر فرماتے ہیں۔

(۲) اولاً جملہ مباحث کو بالاجمال انوکھے انداز میں حصری طور پر شمار کراتے ہیں اور پھر بالتفصیل ان کو بیان فرماتے ہیں جس سے ساری بحثیں طلبہ کے سامنے آئینہ ہوجاتی ہیں، اور تفصیل بعد الاجمال کے نہج سے مضامین اوقع فی النفس ہوجاتے ہیں۔

(۱) أقول هذا من قواعد فقهاء الشافعية كقولهم :الميسور لا يسقط بالمعسور إلخ (حَاشِيةُ الشِّهَابِ عَلَى تفْسيرِ البَيضَاوِي، الْمُسَمَّاة :عِنَايةُ القَاضِي و كِفَايةُ الرَّاضِي عَلَى تفْسيرِ البَيضَاوي، ج۳ص ۱۸۵ ،تحت قوله تعالى:وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاء)

(۳) نظائر وامثلہ کے ذریعہ پیچیدہ مسئلے کو بھی ایسے دل نشیں پیرایے میں ذکر فرماتے ہیں کہ مشکل سے مشکل مسئلہ بھی سہل ہوجاتا ہے۔

(۴) بخاری شریف ہمارے درس نظامی کے منتہی طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے؛ لہٰذا اس کتاب کو کتاب العلم کے ساتھ ساتھ معرفت کے طور پر پڑھاتے ہیں، بیان میں ایسی شفقت اور دل سوزی ہوتی ہے، جس سے وہ باتیں طلبہ کے دل میں اترتی چلی جاتی ہیں، علمِ ظاہر کے ساتھ ساتھ اصلاحِ باطن کی طرف خاص طور پر متوجہ فرماتے ہیں، جس سے علم کی وہ عین حقیقت ظاہر ہوتی چلی جاتی ہے، جس کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لَيْسَ الْعِلْمُ مِنْ كَثْرَةِ الْحَدِيثِ، وَلَكِنَّ الْعِلْمَ مِنَ الْخَشْيَةِ (۱) کے اندر بیان فرمایا ہے، اور اسی خشیت کو اللہ تعالیٰ نے ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَٰٓؤُا ﴾ [فاطر: ۲۸] میں لازمۂ علم قرار دیا ہے، نیز جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ (۲) کہ تعلیم وتعلم کا مقصد تحصیلِ مکارم اخلاق ہے، جس کی خانقاہوں میں مشائخ کے یہاں تکمیل ہوتی ہے، اور تصوف کی یہی غایت ہے، اسی سے احکامِ ظاہرہ میں استقامت آتی ہے۔

(۵) جس مقام پر بھی جو بات نصیحت کی ہوتی ہے، اُسے طلباء کے سامنے بڑے اہتمام سے بیان فرماتے ہیں اور اس طرح نہایت محبت اور ہم دردی کے ساتھ طلبۂ علم حدیث کے قلب میں محبت ومعرفت، عظمت وخشیتِ الٰہی کو جاگزیں فرماتے ہیں، جس سے علمِ نافع کے ساتھ عملِ صالح کی طرف رغبت ہوتی ہے اور معصیت سے نفرت ہوتی ہے۔

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی ۷۸/۵ رقم الحدیث: ۸۵۳۴، ط: داراحیاء التراث العربی بیروت.

(۲) السنن الکبری للبیهقی، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، بَابُ: بَيَانُ مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ وَمَعَالِيهَا الَّتِي مَنْ كَانَ مُتَخَلِّقًا بِهَا كَانَ مِنْ أَهْلِ الْمُرُوءَةِ، رقم الحدیث: ۲۰۷۸۲.

(۶) حل مافی الکتاب کے ساتھ ساتھ احادیث کا انسان کے مختلف احوال پر پوری طرح انطباق بھی فرماتے رہتے ہیں؛ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (۱) رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ علومِ آلیہ (صرف، نحو ،منطق وغیرہ) میں تو حل مافی الکتاب پر اکتفا ہو، اور علومِ مقصودہ تفسیر وحدیث وفقہ وغیرہ میں انطباقات بھی ضروری ہیں۔

(۷) اکثر مسائل کو دلائلِ نقلیہ کے ساتھ ساتھ دلائلِ عقلیہ منطقیہ کے ساتھ اس طرح مدلّل فرماتے ہیں کہ ترتیبِ مقدمات سے نتیجہ خود بہ خود نکل آتا ہے، جس سے حقیقت بالکل منکشف ہوتی چلی جاتی ہے۔

(۸) آپ کی تقریر نہایت جامع مانع ہوتی ہے، جس کا ہر لفظ جچا تُلا ہوتا ہے؛ اسی لیے آپ کی تقریر کا ہر لفظ بڑی توجہ اور غور وفکر کے ساتھ سننا پڑتا ہے، دورانِ تقریر اکثر اشکالات انھیں الفاظ کی حدود وقیود کے ساتھ دفع دخل مقدر کے طور پر رفع فرماتے رہتے ہیں، جس سے صاحبِ فکر وبصیرت کے ذہن سے اشکال خود بہ خود رفع ہوجاتا ہے۔

(۱) حکیم الامت، مجدد الملت، عارف باللہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ۔ وقت کے محدث، فقیہ النفس، بے مثال مفسر، بے نمون عالم، بے نظیر مناظر محقق ومدقق تھے، آپ ۵/ربیع الاول ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں یوپی (الہند) کے معروف علاقہ تھانہ بھون میں پیدا ہوئے، ہندوستان بلکہ عالمِ اسلام کی عظیم درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ جیسے جلیل القدر علماء وفضلاء سے علوم اسلامیہ کی تحصیل کی، بعد از فراغت کئی سالوں تک کانپور میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں پھر اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مشورے سے تھانہ بھون آکر ان کی خانقاہ کو آباد فرمایا اور تادمِ حیات اسی خانقاہ سے منسلک رہ کر دین وملت کی جو خدمت انجام دی وہ محتاجِ بیاں نہیں ہے، آپ کے اصلاحی مواعظ وملفوظات متعدد جلدوں میں آج بھی مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں اور سینکڑوں کتابیں اس کے علاوہ ہیں جو تحقیق وتدقیق کا اعلی نمونہ ہیں، ان تصنیفات میں قرآن کی تفسیر بیان القرآن، امداد الفتاوی، بہشتی زیور، بوادر النوادر، اصلاح الرسوم وغیرہ کتابیں معروف ومشہور ہیں۔ ۱۶/رجب المرجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء کو بمقام تھانہ بھون وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔

(۹) اختلافی مسائل میں ائمہ کے اختلاف کو مع ان کے دلائل کے ذکر فرماتے ہیں اور پھر نہایت شرح وبسط کے ساتھ احناف کے مسلک کو مدلّل طور پر ثابت فرماتے ہیں ، اور اس میں ائمۂ عظام واسلافِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم أجمعین کے ادب کو نہایت درجہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ ایہام بھی خلافِ ادب کا نہ ہونے پائے۔

(۱۰) جہاں متعدد نصوص میں بہ ظاہر تعارض ہوتا ہے، وہاں جمع وتطبیق کی ایسی صورتیں بیان فرماتے ہیں کہ اسی سے ہر حکم کا محمل اپنی جگہ صاف ظاہر ہوتا ہے اور نصوص میں کسی قسم کا تعارض نظر نہیں آتا۔

(۱۱) آپ کا درس جامع ہوتا ہے جس میں علمی بحثیں بھی ہوتی ہیں، آج کل کی جدید معاشرت کے نیے مسائل بھی، سلف کے واقعات بھی اور تصوف کے رُموز بھی، خصوصاً آپ کے بیان میں حکیم الامت قدس سرہ کے علوم کا اس درجہ استحضار ہے کہ گویا ساری سنی ہوئی باتیں نوکِ زبان ہیں، جس کو آپ باقاعدہ اپنے سماع کے ساتھ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے حضرتِ والا سے یہ سنا ہے۔

یہ ہیں آپ کے درس کی چند خصوصیات جنھیں مختصراً عرض کیا گیا ہے، آخر میں خداوند قدوس کی بارگاہ میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان علوم سے مستفیض فرمائے ، ہمارے ظاہر وباطن کو اپنی مرضی کے مطابق فرمادے، اور رہتی دنیا تک ان علوم کے چشمۂ فیض سے مومنین کے قلوب کو سرسبز وشاداب فرماتا رہے۔ وھو ولی التوفیق۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

آمین یارب العالمین

نصیر احمد غفرلہ

خادم الحدیث والافتاء

جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد

مقدمہ

ہر علم وفن کو سمجھنے اور اس کے مقاصد کو بصیرت کے ساتھ پہنچاننے کے لیے کچھ امور سے واقفیت ضروری ہوتی ہے، ایسی چیزوں کو مبادئ فن کہتے ہیں اور اس مضمون اور کلام کو جو ان مبادی پر مشتمل ہوتا ہے، مقدمہ کہتے ہیں، پس یہاں علم حدیث کے مبادی پیش کیے جاتے ہیں، جو تین چیزیں ہیں: تعریفِ علمِ حدیث، موضوعِ علمِ حدیث، غرضِ علمِ حدیث۔

تعریفِ علمِ حدیث: وہ علم ہے جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل، حال وسیرت اور تقریر کو جانا جائے (۱)، بعض کے نزدیک قول وفعل وتقریرِ صحابہ وتابعینؒ بھی حدیث میں داخل ہیں (۲)۔

موضوع: علمِ حدیث کا موضوع حدیث کی سند اور الفاظ ہیں اور بعض نے کہا کہ علمِ حدیث کا موضوع ذاتِ رسول ﷺ رسول ہونے کی حیثیت سے ہے (۳)۔

غرض: علم حدیث کی غرض سعادتِ دارین حاصل کرنا ہے (۴)۔

اہمیتِ حدیث اور حجیتِ حدیث

یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ بادشاہ تک ہر شخص کی رسائی بہ راہِ راست نہیں ہوتی اور ہر شخص شاہی کلام کا بہ راہِ راست، بلا واسطہ مخاطب نہیں ہوا کرتا؛ بلکہ کسی اخص الخواص ہی کو بادشاہ اپنے کلام کا مخاطبِ اولین بنایا کرتا ہے، اس سے تخاطب بالذات اور بلا واسطہ ہوتا ہے، اور بقیہ تمام ملک کے باشندے اس کے

---

(۱) مقدمة عمدة القاری ۱/۱/۴.

(۲) المقدمة الشیخ الدهلوی ص/۳.

(۳) فتح المغیث شرح النیة السیوطی فی الحدیث ص/۱۳ .

(۴) البخاری بشرح الکرمانی ۱/۲ ۱ ط :إحیاء التراث العربی بیروت .

واسطے اور ذریعے سے شاہی کلام اور اس کے احکام سے واقفیت اور شناسائی حاصل کیا کرتے ہیں۔

چوں کہ یہ اخص الخواص ہستی مزاجِ شاہی اور اندازِ کلام ومنشائے کلام جاننے اور سمجھنے میں پوری بصیرت اور کمالِ درک پر فائز ہوتی ہے، اس کے علاوہ تمام رعایا اس مرتبے سے قاصر رہنے کے سبب اس واسطے کے محتاج ہوتے ہیں؛ اس لیے حسبِ درجہ وہ تشریح وتوضیح کے محتاج ہوتے ہیں، پس اصل کلامِ شاہی کے لیے کمالِ فہم اور تمامِ درک کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، یہ صرف اسی ذاتِ خاص کی شان مخصوص ہوتی ہے؛ اس لیے یہ ذاتِ گرامی سلطانی فرامین وقوانین کے مطالب ومعانی، تبیین وتفصیل کے ساتھ دوسروں تک پہنچاتی اور ان کو بہرہ اندوز بناتی ہے۔

جب مجازی بادشاہوں اور ظاہری حکومت ومملکت کے حاکموں کا یہ دأبِ شاہی اور جلالِ سلطانی ہے تو شہنشاہِ حقیقی اور احکم الحاکمین اور سلطان السلاطین کے کمال وجلال کا لامحالہ بہ طریقِ اولیٰ یہ حال ہوگا کہ ہر شخص نہ اس کے ساتھ ہم کلامی سے مشرف ہو سکے اور نہ بہ راہِ راست اس کے کلام کا فہم وادراک کر سکے؛ اس لیے اولین تخاطب اس ذاتِ عالی صفات سے ہوا، جو اولین وآخرین کا سردار اور علمی وعملی کمالات کا محیطِ اعظم تھا اور اس کلامِ شاہی کی تبلیغ وتبیین کا آپ ہی کی ذاتِ گرامی کو واسطہ بنایا۔

چوں کہ آپ کا ذوقِ فہم نہایت درنہایت اونچا تھا، کلامِ حق تعالیٰ وتقدس کو پورے مطالب ومعانی کے ساتھ اور منشائے حق کو پوری شناسائی کے ساتھ سمجھتے تھے، اسی واسطے آپ کے بیان کو حق تعالیٰ نے اپنا بیان اور وحی فرمایا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝٣ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝٤ [النجم]، لہٰذا آپ نے بھی نہایت اطمینان کے

ساتھ أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ، وَمِثْلَهُ مَعَهُ(۱) ارشاد فرمایا، حق تعالیٰ کی بارگاہِ سلطانی سے آپ کو معلمِ کتاب اور معلمِ حکمت کے القاب عطا ہوئے؛ اس لیے آپ کے احکام اور فرامین کی اطاعت کو شہنشاہِ حقیقی نے اپنی اطاعت فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء: ۸۰] اور مثل اپنی اطاعت کے رسول ﷺ کی اطاعت کو بھی فرض فرمادیا، اور بالعموم آپ کے اقوال وافعال میں آپ کی اتباع ضروری فرمادی: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۝﴾ [الحشر: ۷] پس یہ بات کالشّمس فی نصف النہار ظاہر وباہر ہوگئی کہ رسول ﷺ کے قول وفعل اور حال وتقریر کا نام حدیث ہے، ہرگز ہرگز اس سے بے نیازی نہیں ہوسکتی، اور حدیث کے بغیر اطاعتِ خداوندی ایک خام خیالی اور وہم پرستی ہے، جو کہ محض باطل ہے۔ ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید	کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید(۲)

نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ فہمِ قرآن بدونِ احادیث ناممکن اور امرِ محال ہے، پس ثابت ہوگیا کہ قرآنِ پاک حجت اور دلیل اولین ہے تو دوسرے درجے پر حدیث ہے، جیسے قرآن سے استغناء نہیں ہوسکتا، اسی طرح حدیث سے بھی مفر نہیں۔

اب علم حدیث کی تعریف میں جو الفاظ آئے ہیں، ان کی تشریح کی جاتی ہے۔

الفاظ مصطلحہ فن حدیث

قول وفعل کے معنی معلوم ومشہور اور ظاہر ہیں۔

سیرت سے مراد خصائل آں حضرت ﷺ اور بیانِ صورت وشکل آں حضرت

(۱) سنن أبی داود، عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِي كَرِبَ رضی اللہ تعالی عنه، بَابٌ فِي لُزُومِ السُّنَّةِ، رقم الحدیث: ۴۶۰۴.

(۲) جس کسی نے پیغمبر ﷺ کے خلاف راستہ اختیار کیا ہرگز منزل مقصود پر نہ پہونچے گا۔

ﷺ ہے۔

حال : جیسے کہ دندان مبارک جنگ احد میں شہید ہوا، وغیرہ۔

تقریر: کسی صحابی نے آں حضرت ﷺ کے روبرو ایک کام کیا یا کلام کیا اور آں حضرت ﷺ نے اس پر سکوت فرمایا، نہ اثبات فرمایا، نہ انکار فرمایا۔ (تقریر صرف حضور اکرم ﷺ کی حجت ہے اور کسی کی تقریر حجت نہیں ۔)

متن: الفاظِ حدیث کو متن کہتے ہیں۔(یعنی جہاں پر سند کا سلسلہ ختم ہوجائے (۱)

سند : رواتِ حدیث کے سلسلے کو سند اور اسناد کہتے ہیں (۲)

حدیث: کو خبر بھی کہتے ہیں (۳)

حدیث کی دو قسم خبر متواتر، خبر واحد

خبر متواتر: وہ حدیث ہے جس کے روایت کرنے والے ہر زمانے میں اس قدر کثیر ہوں کہ ان سب کے جھوٹ پر متفق ہوجانے کو عقل سلیم محال سمجھے (۴)۔

خبر واحد: وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر زمانے میں اس قدر کثیر نہ ہوں (۵)۔

---

(۱) وَالْمَتْنُ هُوَ غَايَةُ مَا يَنْتَهِي إِلَيْهِ الْإِسْنَادُ مِنْ الْكَلَامِ.(نزهة النظر فى توضيح نخبة الفكر ص ٦)

(۲) السَّنَد طَرِيق الحَدِيث وَهُوَ رِجَاله الَّذين رَوَوْهُ, والإسناد بِمَعْنَاهُ وَقد يجيىء بِمَعْنى ذكر السَّنَد والحكاية عَن طَرِيق الْمَتْنِ. (مقدمة شيخ عبدالحق ص ۳، نزهة النظر فى توضيح نخبة الفكر ص ٦)

(۳) الخَبَرُ عِنْدَ عُلَمَاءِ الْفَنِّ مُرَادِفٌ لِلْحَدِيثِ ۔(نزهة النظر ص ۵)

(۴) المتواتر وهوالذى رواه قوم لايحصىٰ عددهم ، ولايتوهم توافقهم على الكذب۔(ظفر الأمانى بشرح المختصر السعد الشريف الجرجانى فى مصطلح الحديث ، ص ۳۲)

(۵) وهومالم يبلغ عددرواته عددالتواتر فى قرن من القرون ويسمىٰ بخبرالواحد(ظفرالأمانى ص ۳۲)

خبر واحد کی مختلف اعتبارات سے پانچ تقسیمات

خبر واحد کی مختلف اعتبار سے پانچ تقسیمات تھیں:

اول منتہیٰ (آخرِ سند) کے اعتبار سے، دوم عددِ رواۃ کے اعتبار سے، سوم صفات رواۃ کے اعتبار سے، چہارم سقوط وعدمِ سقوطِ راوی کے اعتبار سے، پنجم صیغِ ادا کے اعتبار سے۔

تقسیم اول یعنی منتہیٰ کے اعتبار سے خبر واحد کی تین قسمیں ہیں: (۱) مرفوع (۲) موقوف (۳) مقطوع۔

مرفوع: وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل وتقریر کا ذکر ہو(۱)۔

موقوف: وہ حدیث ہے جس میں صحابی کے قول وفعل یا تقریر کا ذکر ہو(۲)۔

مقطوع: وہ حدیث ہے جس میں تابعی کے قول وفعل یا تقریر کا ذکر ہو(۳)۔

خبر واحد کی دوسری تقسیم

دوسرے اعتبار سے یعنی عددِ رُواۃ کے اعتبار سے بھی خبر واحد کی تین قسمیں ہیں: (۱) خبر مشہور (۲) خبر عزیز (۳) خبر غریب۔

خبر مشہور: وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر زمانہ میں تین سے کم نہ ہوں (۴)۔

خبر عزیز: وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر زمانہ میں دو سے کم نہ ہوں (۵)۔

(۱) فمَا انُتهى إلَى النَبِي ﷺ يُقَال لَهُ الْمَرْفُوع. (مقدمة شيخ عبدالحق ص ۱)

(۲) وَمَا انُتهى إلَى الصَّحَابِيّ يُقَال لَهُ الْمَوْقُوف كَمَا يُقَال قَالَ أَو فعل أَو قرر ابْن عَبَّاس أَو عَن ابْن عَبَّاس مَوْقُوفاً أَو مَوْقُوف على ابْن عَبَّاس. (مقدمة شيخ عبدالحق ص ۱)

(۳) وَمَا انُتهى إلَى التَّابِعِيّ يُقَال لَهُ الْمَقْطُوع. (ايضاً)

(۴) المشهور: ما لَهُ طرقٌ محصورةٌ بأكثرَ مِن اثْنَيْنِ، وهُو المَشْهورُ عندَ المُحَدِّثينَ. (نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر، ص ۱۹۸)

(۵) العَزِيز: وهُو أَنْ لا يَروِيَه أَقلُّ مِن اثْنَيْنِ عنِ اثْنَيْنِ. (نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر، ص ۱۹۹)

خبرغریب : وہ حدیث ہے جس کا راوی کسی زمانہ میں ایک ہی ہو(۱)۔

خبر واحد کی تیسری تقسیم

تیسرے اعتبار سے (یعنی راویوں کی صفات کے اعتبار سے) خبر واحد کی ۱۶/ اقسام ہیں: (۱) صحیح لذاتہ (۲) حسن لذاتہ (۳) ضعیف (۴) صحیح لغیرہ (۵) حسن لغیرہ (۶) موضوع (۷) متروک (۸) شاذ (۹) محفوظ (۱۰) منکر (۱۱) معروف (۱۲) معلل (۱۳) مضطرب (۱۴) مقلوب (۱۵) مصحف (۱۶) مدرج۔

صحیح لذاتہ : وہ حدیث جس کے کل راوی عادل (۲) ، کامل الضبط (۳) ہوں، اوراس کی سند متصل ہو، معلل وشاذ ہونے سے محفوظ ہو (۴)۔

حسن لذاتہ : وہ حدیث ہے جس کے راوی میں صرف ضبط ناقص ہو، باقی سب شرائط صحیح لذاتہ کے اس میں موجود ہوں (۵)۔

ضعیف : وہ حدیث ہے جس کے راوی پر حدیث نبوی میں جھوٹ بولنے کا

---

(۱) الغريب :وهُو ما يتفرَّ د بِروايَتِهِ شخصٌ واحِدٌ في أيِّ موضعٍ وَقَعَ التفردُ بِهِ مِنَ السَّنَدِ. (نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر، ص ۲۰۰)

(۲) عادل وہ راوی ہے جو صاحب تقویٰ ہو، کبائر جھوٹ وغیرہ سے بری ہو یا توبہ کرلی ہو، صغائر پر دوام نہ ہو اور جملہ اسباب فسق سے سالم ہو، صاحب مروت ہو، یعنی ایسے کام نہ کرے جو لوگوں کے نزدیک ہلکے ہوں، جیسے ننگے سر بازار میں جانا، یا بازار میں گوشہ میں بیٹھ کر پیشاب کرنا یا راستہ چلتے ہوئے کوئی چیز کھانا۔

(۳) کامل الضبط یہ ہے کہ ہوشیار رہو، تاکہ الفاظِ حدیث یادرکھے، غفلت نہ کرے، نہ بھولے، نہ شک کرے، نہ سننے کے وقت، نہ بیان کرنے کے وقت۔

(۴) نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر، ص ۷۸.

(۵) نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر، ص ۱۳۰.

طعن موجود ہو۔

صحیح لغیر ہ: وہ حدیث حسن لذاتہ ہے جس کی سندیں متعدد ہوں (۱)۔

حسن لغیر ہ : وہ ضعیف حدیث جس کی سندیں متعدد ہوں (۲)۔

موضوع : وہ حدیث ہے جس کے راوی پر حدیث نبوی میں جھوٹ بولنے کا طعن موجود ہو (۳)۔

متروک : وہ حدیث ہے جس کا راوی متہم بالکذب ہو، یا وہ روایت قواعدِ معلومہ فی الدین کے خلاف ہو (۴)۔

شاذ : وہ حدیث ہے جس کا راوی خود ثقہ ہو؛ مگر ایک ایسی جماعت کی مخالفت کرتا ہو جو اس سے زیادہ ثقہ ہیں (۵)۔

محفوظ : وہ حدیث ہے جو حدیث شاذ کے مقابل ہو (۶)۔

منکر : وہ حدیث ہے جس کا راوی باوجود ضعیف ہونے کے جماعت ثقات کی مخالف روایت کرے (۷)۔

(۱) وَإِن كَانَ فِيهِ نوع قُصُور وَوجد مَا يجْبر ذَلِك الْقُصُور من كَثْرَة الطّرق فَهُوَ الصَّحِيح لغيره.(مقدمة شيخ عبدالحق ص ۵۹)

(۲) والضعيف إن تعدد طرقه وانجبر ضعفه يُسمى حسنا لغيره(مقدمة شيخ عبدالحق ص ۵۹)

(۳) هُو الطَّعْنُ بكَذِبِ الرَّاوي في الحَديثِ النبويِّ- هو المَوضوعُ.(نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر، ص ۷۸.)

(۴) نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر، ص ۷۸،مقدمة شيخ عبدالحق ص ۶۴.

(۵) مقدمة شيخ عبدالحق ص ۵۳.

(۶) مقدمة شيخ عبدالحق ص۵۳،شرح نخبة الفكر للملاعلى قارىؒ ص ۳۳۸.

(۷) قَالَ السخاوي :فالمنكر مَا رَوَاهُ الضَّعِيف مُخَالفا.(شرح نخبة الفكر للملاعلى قارىؒ ص ۳۳۸)

معروف: وہ حدیث ہے جو منکر کے مقابل ہو(۱)۔

معلل: وہ حدیث ہے جس کی سند میں کوئی ایسی علتِ خفیہ ہو، جو صحتِ حدیث میں نقصان دیتی ہے، ماہرِ فن ہی اس کو جان سکتا ہے(۲)۔

مضطرب: وہ حدیث ہے جس کی سند یا متن میں ایسا اختلاف واقع ہو کہ اس میں ترجیح یا تطبیق نہ ہو سکے(۳)۔

مقلوب: وہ حدیث ہے جس میں بھول سے سند یا متن میں تقدیم وتاخیر واقع ہوگئی ہو، یا بھول کر ایک کی جگہ دوسرا راوی رکھا گیا ہو(۴)۔

مصحف: وہ حدیث ہے جس میں باوجود صورتِ خطی باقی رہنے کے نقطوں وحرکتوں وسکونوں کے تغیر کی وجہ سے تلفظ میں غلطی واقع ہو جائے(۵)۔

مدرج: وہ حدیث ہے جس میں راوی کسی جگہ اپنا یا کسی دوسرے کا کلام درج کردے، مثلاً صحابی کا یا تابعی(۶) کا۔

خبر واحد کی چوتھی تقسیم

چوتھے اعتبار یعنی سقوط وعدمِ سقوطِ راوی کے اعتبار سے خبر واحد کی سات

(۱) مقدمة شيخ عبدالحق ص ۵۴.
(۲) مقدمة شيخ عبدالحق ص ۵۵.
(۳) ألفية السيوطي في علم الحديث، ص ۳۵.
(۴) یہ تعریف ان الفاظ کے ساتھ مجھے کہیں مل نہ سکی، علامہ سیوطیؒ نے اس کی تعریف یہ بیان کی ہے .اَلْقَلْبُ فِي الْمَتْنِ وَفِي الإِسْنَادِ قَرْ ... إِمَّا بِإِبْدَالِ الَّذِي بِهِ اشْتَهَرْ .وَاحِد نَظِيرِهِ لِيُغْرِبَا ...أَوْ جَعْلِ إِسْنَادِ حَدِيثٍ اجْتَبَى. لآخَرٍ، وَعَكْسُهُ، إِغْرَابًا، أَوْ ... مُمْتَحِنًا، كَأَهْلِ بَغْدَادَ، حَكَوْا إلخ (ألفية السيوطي في علم الحديث، ص ۳۶)
(۵) نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر، ص ۱۱۸.
(۶) (مقدمة شيخ عبدالحق ص ۵۰)

قسمیں ہیں :(۱) متصل (۲) مسند (۳) منقطع (۴) معلق (۵) معضل (۶) مرسل (۷) مدلس۔

متصل : وہ حدیث ہے کہ اس کی سند میں (کوئی راوی ساقط نہ ہو) راوی پورے مذکور رہوں (۱)۔

مسند : وہ حدیث ہے کہ اس کی سند رسول اللہ ﷺ تک متصل ہو(۲)۔

منقطع : وہ حدیث ہے کہ اس کی سند متصل نہ ہو؛ بلکہ کہیں سے راوی ساقط ہو۔

معلق : وہ حدیث ہے جس کی سند کے شروع سے ایک یا کثیر راوی ساقط ہوں۔

معضل : وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان سے کوئی راوی ساقط ہو یا ایک سے زائد مسلسل کئی راوی حذف ہوں۔

مرسل : وہ حدیث ہے جس کی سند کے آخر سے کوئی راوی حذف ہو۔

مدلس : وہ حدیث ہے جس کے راوی کی عادت ہو کہ وہ اپنے شیخ یا شیخ کے شیخ کا نام چھپا لیتا ہو(۳)۔

---

(۱) نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر، ص ۷۰

(۲) الْمُسْنَد :ما رواهُ المحدِّث عن شيخٍ يَظْهر سماعُهُ منهُ، وكذا شيخه عن شيخه، متصِلاً إِلى صحابيٍ إِلى رسولِ اللهِ ﷺ (نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر، ص ۱۴۶).

(۳) مقدمہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ان چاروں (منقطع، معلق، مرسل، مدلس) کی ان تعریفات کو بیان فرمایا ہے: وَإِن سقط وَاحِد أَو أَكثر فَالْحَدِيث مُنْقَطع وَهَذَا السُّقُوط انْقِطَاع،... والسقوط إِمَّا أَن يكون من أول السَّنَد وَيُسمى مُعَلّقا وَهَذَا الْإِسْقَاط تَعْلِيقا والساقط قديكون وَاحِدًا وَقد يكون أَكثر...، وَإِن كَانَ السُّقُوط من آخر السَّنَد فَإِن كَانَ بعد التَّابِعِيّ فَالْحَدِيث مُرْسل وَهَذَا الْفِعْل إرْسَال، ...وَإِن كَانَ السُّقُوط من أَثْنَاء الْإِسْنَاد فَإِن كَانَ السَّاقِط اثْنَيْنِ متواليا يُسمى معضلا بِفَتْح الضَّاد... لَا يُسمى الرَّاوِي شَيْخه الَّذِي سَمعه مِنْهُ بل يروي عَمَّن فَوْقه بِلَفْظ يُوهم السماع وَلَا يقطع كذب۔ از ص ۴۰ تا ۴۵)

خبرِ واحد کی پانچویں تقسیم

پانچویں اعتبار یعنی صیغِ ادا کے اعتبار سے خبرِ واحد کی دو قسمیں ہیں:
(۱) مُعَنْعَن (۲) مسلسل۔

مُعَنْعَن: وہ حدیث ہے جس کی سند میں لفظِ "عن" ہو(۱)۔

مسلسل: وہ حدیث ہے جس کی سند میں صیغِ ادا کے یا راویوں کے صفات یا حالات ایک ہی قسم کے ہوں(۲)۔

کتبِ حدیث کی پہلی تقسیم

کتب حدیث کی مختلف اعتبار سے دو تقسیم مشہور ہیں:

اول: وضع وترتیبِ مسائل کے اعتبار سے، دوم مقبول ہونے، نہ ہونے کے اعتبار سے۔

اول اعتبار سے کتب حدیث کی نو قسمیں ہیں: (۱) جامع (۲) سنن (۳) سند (۴) معجم (۵) جزء (۶) مفرد (۷) غریب (۸) مستخرج (۹) مستدرک۔

جامع: وہ کتاب ہے جس میں تفسیر، عقائد، آداب، احکام، مناقب، سیر، فتن، علاماتِ قیامت وغیرہا، ہر قسم کے مسائل کی احادیث مندرج ہوں، جیسے بخاری شریف، ترمذی شریف۔

سنن: وہ کتاب ہے جس میں احکام کی احادیث ابوابِ فقہ کی ترتیب کے موافق بیان ہو، جیسے: سنن ابی داود، سننِ نسائی، سنن ابن ماجہ۔

مسند: وہ کتاب ہے جس میں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم أجمعین کی

---

(۱) الموقظة في علم مصطلح الحديث للذهبی علیہ الرحمۃ، ص ۴۴.

(۲) نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر، ص ۱۵۵.

ترتیبِ رتبی ، یا ترتیبِ حروف ہجاء یا تقدم وتأخرِ اسلامی کے لحاظ سے احادیث مذکورہوں، جیسے :مسندِ احمد،مسندِ دارمی۔

معجم : وہ کتاب ہے جس کے اندروضعِ احادیث میں ترتیبِ اساتذہ کالحاظ رکھا گیاہو، جیسے : معجم طبرانی۔

جزء : وہ کتاب ہے جس میں صرف ایک ہی مسئلے کی احادیث یکجا جمع ہوں، جیسے : جزءالقرآۃ، جزءرفع الیدین للبخاری، جزءالقرآۃ للبیہقی۔

مفرد : وہ کتاب ہے جس میں ایک محدث کے منفردات جوکسی شیخ سے ہیں، وہ ذکرہوں۔

غریب : وہ کتاب ہے جس میں ایک محدث کے متفردات جوکسی شیخ سے ہیں، مذکورہوں۔

مستخرج : وہ کتاب ہے جس میں دوسری کتاب کی حدیثوں کی زائد سندوں کااستخراج کیا گیاہو، جیسے مستخرج ابی عوانہ۔

مستدرک : وہ کتاب ہے جس میں دوسری کتاب کی شرط کے موافق اس کی رہی ہوئی حدیثوں کو پورا کردیا گیاہو، جیسے مستدرک حاکم(۱)۔

---

(۱) ان نواقسام میں سے پہلی سات اقسام کی تعریفات فتح الملہم ، ج ا ص ۲۲۰ پر مذکور ہیں اور مستخرج اورمستدرک میں زیادہ فرق نہیں ہے، ملا قاریؒ فرماتے ہیں : (مُسْتَخْرِجاً) بِكَسْر الرَّاء حَال من فَاعل عمل الْمنزل منزلَة اللّازِم. يُقَال :كتب فلَان مستخرجا على الصَّحِيحَيْنِ [أَي جاعلاً الزِّيَادَة عَلَيْهِمَا] ، أَي مستدر كاً عَلَيْهِمَا. وَالْفرق بَين الاستخراج والاستدراك أَن الزَّوَائِد فِي المستخرَج بِالْفَتْح - من الْمُسْتَخْرج - بِالْكَسْرِ - بِخِلَاف الْمُسْتَدْرك فالتعبير هُنَا بالمستخرج أولى من الْمُسْتَدْرك وَقيل :الظَّاهِر أَن مَعْنَاهُ :زَادأَبُو نُعَيم على كتاب الْحَاكِم أَشْيَاء, واستدرك عَلَيْهِ مَا فَاتَهُ وَحِينَئِذٍ يكون قَوْله :مستخرجاً على بِنَاء الْمَفْعُول مفعول عَمِل. (شرح نخبة الفكر في مصطلحات أهل الأثر, ص ۱۳۸)

کتب حدیث کی دوسری تقسیم

مقبول ہونے، نہ ہونے کے اعتبار سے کتب حدیث پانچ قسم پر ہیں:

پہلی قسم : وہ کتابیں ہیں جن میں سب حدیث صحیح ہوں، جیسے موطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابن حبان، صحیح حاکم، مختارہ ضیاء مقدسی (۱) صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن عوانہ، صحیح ابن سکن، منتقیٰ ابن جارود۔

دوسری قسم : وہ کتابیں ہیں، جن میں صحیح، حسن، ضعیف، سب طرح کی احادیث ہوں؛ مگر سب قابلِ احتجاج ہوں؛ کیوں کہ ان کی ضعیف بھی حسن کے قریب ہیں، جیسے : سنن ابی داود، جامع ترمذی، سنن نسائی۔

تیسری قسم : وہ کتابیں ہیں جن میں حسن، صحیح، منکر، ہر نوع کی احادیث ہوں، جیسے : سنن ابن ماجہ، مسند طیالسی، زیادات ابن حنبل، مسند عبدالرزاق، مسند سعید بن منصور، مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، مسند احمد، مسند ابی یعلیٰ موصلی، مسند بزار، مسند ابن جریر، تہذیب ابن جریر، تفسیر ابن جریر، تاریخ ابن مردویہ، تفسیر ابن مردویہ، معجم صغیر، معجم کبیر، معجم اوسط للطبرانی، سنن دارقطنی، غرائب دارقطنی، حلیہ ابی نعیم، سنن بیہقی، شعب الایمان بیہقی وغیرہا۔

چوتھی قسم : وہ کتابیں ہیں، جن میں سب حدیث ضعیف ہوں، الاماشاء اللہ جیسے : نوادرالاصول للحکیم الترمذی، تاریخ الخلفاء، تاریخ ابن نجار، مسند الفردوس للدیلمی، کتاب الضعفاء للعقیلی، کامل ابن عدی، تاریخ خطیب بغدادی، تاریخ ابن عساکر وغیرہا۔

---

(۱) اس کتاب کا اصل نام "الأحادیث المختارۃ" ہے، مصنف کا نام ضیاء الدین ابو عبداللہ محمد بن مقدسی ہے۔

پانچویں قسم: وہ کتابیں جن سے موضوعات معلوم ہوتی ہیں، جیسے: موضوعات ابن جوزی، موضوعات شیخ محمد طاہر نہروانی وغیرہ (۱)۔

خصوصیاتِ بخاری شریف

(۱) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اس کتاب صحیح بخاری میں اصل مقصد اور مطمح نظر احادیث سے استنباطِ احکام اور استخراجِ لطائف وفقہیات ہے (۲) اور یہ کام معمولی اور آسان نہیں، نہایت اہم و اعظم ہے، بڑے غور وفکر اور دماغی وقلبی جدوجہد کا ہے؛ اس لیے کتاب کی تالیف وتنقیح ایسے عظیم الشان اہتمام کے ساتھ فرمائی جس کی نظیر نہیں کہ ہر حدیث شریف سے پہلے غسل اور دو رکعت نماز ادا فرماتے (۳) اور دعاء کے بعد حدیث شریف اور اس کی ترتیب وتبویب قائم فرماتے، اس درجہ ظاہری و باطنی طہارت وصفائی اور توجہ قلبی ودماغی کے ساتھ سولہ سال تک یہ مقدس کام انجام فرمایا؛ اس لیے بفضلہٖ تعالیٰ ایسے طریق تبویب وترتیب پر فائز ہوئی، جو کافی غور وخوض کو مقتضی ہے اور نہایت جامعیت پر مشتمل ہے، ہر ایک عالم اپنی استعدادِ فہم وعقل کے موافق اس نہج تبویب اور طریق ترتیب سے علوم عجیبہ وغریبہ کا ادراک کرتا اور فیض یاب ہوتا ہے، انھیں وجوہ سے علماء نے فرمایا ہے کہ خواص کے لیے صحیح بخاری سب سے انفع ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ فرماتے تھے کہ تین کتاب البیلی ہیں: قرآن شریف، بخاری شریف، مثنوی شریف۔

(۲) مقصد مذکور کی وجہ سے ہی دوسرے ائمہ حدیث کی طرح ایک باب

(۱) مقدمة لامع الدراری، ص ۳۹،۳۸.
(۲) هدی الساری مقدمة فتح الباری ص ۱۱،الفصل الثاني في بيان موضوعه والكشف عن مغزاه فيه وتسمية المؤلف لكتابه الجامع الصحيح المسند.
(۳) هدی الساری مقدمة فتح الباری ص ۱۰ .

میں طرق احادیث جمع نہیں فرماتے؛ بلکہ عمق نظری سے ہر حدیث کے لیے اس کے کسی خاص جزء کی مناسبت سے ایک الگ باب وعنوان قائم فرماتے ہیں؛ اگر چہ اس حدیث شریف کا اکثر حصہ بہ ظاہر کسی دوسرے باب سے تعلق رکھتا ہو۔

اسی لیے بہت سی احادیث **نظراً إلى الظاهر وتبادر الذهن** جن ابواب کے تحت ہونے کو مقتضی تھیں، ان ابواب کے تحت نہیں لائے ، اس لیے ہر کسی حدیث کا بخاری شریف سے تلاش کرلینا آسان نہیں، ازبس دشوار ہے، سوائے اس شخص کے جو بخاری شریف پر عبور رکھتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے احادیث صحیح بخاری کے بخاری شریف میں ہونے سے انکار کردیا ہے، بخاری شریف بالاصل وبالذات مسند اور متصل احادیث کے لیے وضع کی گئی ہے، غیر مسند یعنی صحابیؓ یا تابعیؒ سے روایات اس میں بہت کم ہیں، اور جو موجود ہیں، وہ بھی تبعاً وتعلیقاً استنباط وغیرہ کی غرض سے، احادیث بخاری کے رواۃ سوائے چند کے سب متفق الضبط والعدالۃ ہیں، اسی واسطے بخاری کے نزدیک ہر راوی کا اپنے شیخ، یعنی استاذ سے ملاقات کرنا شرط ہے؛ تاکہ اس کے اقوال واحادیث، مجالست کے ذریعہ اچھی طرح معلوم ہوسکیں، بس احادیث صحیح بخاری تنقید وتبصرہ سے سالم ہیں، بجز ایک غیر معتد بہ قلیل تعداد کے چوں کہ متکلم فیہ رجال اس میں بہت کم ہیں۔

(۳) یہ بات مسلّم ہے کہ بخاری شریف میں اس کا التزام ہے کہ ترجمہ یا حدیث مکرر نہ لایا جائے ، لیکن حقیقت تکرار ملحوظ رہے، جو یہ ہے کہ محض الفاظ ہی کا اتحاد نہ ہو کہ یہ تو تکرار کی صورت ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مطلوب وغرض بھی دونوں جگہ متحد ہوں (۱)۔

(۱) مام بخاریؒ نے بھی اس کا دعوی کیا ہے کہ میری کتاب میں تکرار نہیں ہے؛ اس لیے جو تکرار نظر آتا ہے، وہ صورتِ تکرار ہے اور صورتِ تکرار بخاری شریف میں کثیر ہے، اس سے امام بخاریؒ کے مذکورہ دعوے پر ←

(۴) امام بخاریؒ ترجمۂ باب کے لیے کسی آیت یا جملہ مذکورہ فی الحدیث کو اختیار فرماتے ہیں۔

(۵) ترجمۂ باب ایک دعویٰ اور ماتحت الباب حدیث اس کی دلیل ہوتی ہے۔

(٦) ترجمۂ باب کا اکثر مدلول ظاہر مقصود نہیں ہوتا، بلکہ مدلول التزامی اور ثابت بالاشارہ مقصود اکثری ہوتا ہے۔

(۷) اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ترجمہ یا عنوان پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ دو، تین ترجمہ اور عنوانات اختیار فرماتے ہیں، ان میں بھی یہ ترتیب ملحوظ نظر آتی ہے کہ ہر ایک ترجمہ اول دعوی اور دوسرا ترجمہ ماقبل ترجمہ کی دلیل اور مابعد ترجمہ کے لیے دعوی ہے، کہیں ایسا ہے کہ قضایا قیاسا تہا معہا کے قبیل سے تراجم رکھے گئے۔

(۸) دوسرا، تیسرا ترجمہ اکثر آثار صحابہؓ، اقوال تابعینؒ ہوتے ہیں جو کبھی دلیل ترجمہ کی حیثیت سے اور کبھی فائدہ کی غرض سے اور کبھی استنباط وغیرہ کی غرض سے مؤلفؒ ذکر فرماتے ہیں۔

(۹) ان متعدد تراجم میں بعض دفعہ دوسرا ترجمہ مسلم ہوتا ہے، اس کا اثبات

← کوئی اشکال نہیں کیا جاسکتا کہ دعوی حقیقی تکرار کے عدم کا ہے اور وجود صورتِ تکرار کا ہے اور اگر یہ مانا جائے کہ دعوی ہی مطلق تکرار کے عدم کا ہے تو اشکال ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ صورتِ تکرار تو بہت ہے، چنانچہ حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری قدس سرہ فرماتے ہیں : بعد میں علماء نے جائزہ لیا تو پوری کتاب میں ایک سواڑسٹھ حدیثیں مکرر پائی گئیں یعنی بخاری شریف میں اتنی حدیثیں بعینہٖ سند کے ساتھ ایک سے زائد جگہ آئی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ جب حضرت نے خود لکھا ہے کہ مکرر حدیثیں نہیں لکھتا پھر یہ حدیثیں کیوں لائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری شریف سولہ سال میں لکھی گئی ہے اور وہ ایک ضخیم کتاب ہے، اتنی بڑی کتاب میں نظر چوک سکتی ہے، ایسی بھول ہوجاتی ہے اور ہر انسان سے ہوتی ہے؛ لہٰذا اگر یہ حدیثیں مکرر ہیں تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ (تحفۃ القاری ۱:۲۴)

مقصود نہیں ہوتا، مقصود صرف ترجمہ اولیٰ کا اثبات ہوتا ہے اور دوسرے ترجمہ کو تبعاً واحتیاطاً ذکر فرماتے ہیں۔

(۱۰) بعض دفعہ دوسرا ترجمہ اس لیے قائم کیا جاتا ہے کہ جس حدیث کو تحت الباب ذکر کرنا منظور ہوتا ہے، وہ حدیث اپنے اندر ترجمۂ اولیٰ کی بعینہٖ دلیل نہیں رکھتی یا اس کے دلیل بننے میں قلت ودقت ہوتی ہے، یا اس میں کوئی خلجان ہوتا ہے تو دوسرا ترجمہ تلافی تدارک کی خاطر لاتے ہیں، اور اس کے ساتھ حدیث کی مطابقت صریحہ ہو کر اس کے واسطے سے اول ترجمہ کا اثبات ہوتا ہے۔

(۱۱) اگرچہ ترجمۃ الباب مدعا اور حدیث اس کی دلیل ہوتی ہے مگر متعدد جگہ ترجمہ میں ایسی قید یا تفصیل امر کا اضافہ فرمادیتے ہیں، جس کا حدیث باب میں ذکر نہیں ہوتا؛ جس سے کسی مغالطہ کا دفع یا کسی خلجان کا رفع مقصود ہوتا ہے اور تطبیق کے لیے دوسرے دلائل ملحوظ ہوتے ہیں۔

(۱۲) بعض دفعہ ترجمہ کے تحت دو حدیثیں ہوتی ہیں، مگر دوسری حدیث ترجمۃ الباب کے مخالف ہوتی ہے، ایسی جگہ تطبیق کے لیے اشکال وخلجان میں نہ پڑنا چاہیئے، دوسری حدیث سے یہ مقصود نہیں ہوتا بلکہ کسی قابل بیان امر کی تفصیل وغیرہ مطلوب ہوتی ہے۔

(۱۳) بعض مواقع میں تحت الباب ایسی حدیث ہوتی ہے کہ ترجمہ کے متعلق اس میں کچھ ذکر نہیں ہوتا مگر اسی حدیث کو جو دوسرے باب میں لاتے ہیں، اس میں صریح وہ لفظ موجود ہوتا ہے جو سابق الذکر ترجمہ کے مطابق ہوتا ہے، جیسے: **باب السمر فی العلم** کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما کی روایت **"بِتُّ فِي بَيْتِ خَالَتِي مَيْمُونَةَ" الحديث** (۱)، اس میں سمر کا ذکر نہیں، آگے کتاب التفسیر میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی روایت بیان کی جس میں **"فَتَحَدَّثَ**

(۱) صحيح البخاری، جلد: ۱/ ۲۲.

رَسُولُ اللّٰہ ﷺ مَعَ أَھْلِہٖ سَاعَۃً، ثُمَّ رَقَدَ (۲)' صاف موجود ہے۔

(۱۴) بعض دفعہ ایسا بھی کیا ہے کہ وہ روایت جس میں مطابقۃ بالباب صریح نظر آتی ہے، اس کو پوری کتاب میں نہیں لائے، چوں کہ شرائط کے مطابق نہیں ہوتی تھی اور مقصد ومطمح نظر اس سے یہ ہوتا ہے کہ علماء اپنی اپنی وسعت کے مطابق اس کے سمجھنے اور حل کرنے میں پوری پوری توجہ مبذول فرمائیں۔

(۱۵) بعض جگہ باب مع ترجمہ قائم فرمایا، مگر حدیث مسند اس کے تحت ذکر نہیں فرمائی؛ توسیع تراجم یا تشحیذ اذہان وغیرہ کی خاطر۔

(۱۶) بعض مواقع میں باب بلاترجمہ رکھا اور حدیث مسند ذکر فرمائی، اس سے ماقبل کی تتمیم یا استدراک یا تشحیذ اذہان وغیرہ کا قصد ہوتا ہے۔

❁ ❁ ❁

(۲) صحیح البخاری: ۲/۶۵۷، کتاب التفسیر، بَابُ قَوْلِہِ {إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِأُولِي الأَلْبَابِ}.

الدرس الاوّل

سیرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ

۱ - ا بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ کی قرأت کے بعد فرمایا کہ بخاری شریف کے شروع کرنے سے قبل امام بخاری محمد بن اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وسوانح سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے، کیوں کہ کسی کتاب کے پڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ اس کے مؤلف کے حالات معلوم کریں؛ چوں کہ بلا مؤلف کے حالات معلوم ہوئے کتاب کی پوری طرح معرفت حاصل نہیں ہوسکتی؛ اسی لیے طلبہ کے لیے ہر کسی کتاب کو دیکھنا جائز نہیں، جب تک اس کے مؤلف کا حال معلوم نہ ہو۔

اور یہ جو خیال کیا جاتا ہے کہ معلومات میں وسعت ہوگی، یہ محض غلط ہے، آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسجد نبوی کے اندر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ توریت کا مطالعہ فرمارہے ہیں، اتنے میں وہاں حضور اکرم ﷺ تشریف لے آتے ہیں، آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہکو مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ کر غصہ کیا اور فرمایا کیا تمہارے لیے قرآن کافی نہیں ہے؟۔

اب آپ دیکھئے! حالاں کہ حضرت عمرؓ کے دل میں توریت کے مطالعہ سے نہ کسی مذہب کی فضیلت آسکتی ہے، نہ کسی مغالطے میں پڑ سکتے ہیں اور اگر کوئی شبہہ ہوتا بھی تو حضور اکرم ﷺ سے حل کرلیتے مگر اس کے باوجود آپ نے منع فرمایا تو پھر بھلا ہم طلبہ کو کسی کی کتاب دیکھنا کیوں کر روا اور جائز ہوسکتا ہے!۔ضروری ہے کہ کسی کتاب کے دیکھنے سے قبل اپنے کسی معتمد استاذ سے مشورہ کرلیں، اس کے بعد مطالعہ کریں، بدون اس کے ان طلبہ کو جن کا علم ابھی تحقیق کو نہیں پہنچا، ابھی

صرف درسیات کا علم ہے اور وہ بھی پوری طرح نہیں، اس پر بھی عبور نہیں، نہ اساتذہ کے درس میں پابندی کے ساتھ حاضری ہے اور نہ دل چسپی کے ساتھ سنتے ہیں تو ان کے لیے بلاتحقیق ہر کتاب کا مطالعہ کیسے درست ہوسکتا ہے؟۔

بہرحال بات چل رہی ہے کہ کتاب کے پڑھنے سے قبل مصنف کے حالات سے واقف ہونا ضروری ہے اس لیے بخاری شریف کے پڑھنے سے پہلے مؤلف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کو بیان کیا جاتا ہے۔

ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے، نام محمد ہے، باپ کا نام اسماعیل، دادا کا نام ابراہیم اور پردادا کا نام مغیرہ اور پردادا کے والد کا نام بردِزبہ ہے، یہ فارسی کا لفظ ہے جس کے معنیٰ کاشتکار کے ہیں، امام بخاری کی ولادت ۱۳/شوال (۱) اور بہ روایت ثانیہ ۱۲/شوال ۱۹۴ھ کو جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ ہوئی ہے (۲)۔

قبیلہ جُعف کی طرف سے منسوب کرکے ان کو جعفی کہا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پردادا مغیرہ جو کہ پہلے مجوسی تھے، انھوں نے بخاریٰ کے سردار یمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جو کہ قبیلہ جعف کے تھے اور قاعدہ یہ تھا کہ جو کوئی کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا تھا، اسی کی طرف اس کی نسبت کردی جاتی تھی، تو اس وجہ سے مغیرہ کو بھی جعفی کہا جانے لگا، اور اس طرح یہ نسبت آپ کے خاندان کی قرار پائی (۳)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ولادت کے کچھ دن بعد بچپن ہی میں نابینا ہو گئے، ان کی والدہ نے رو رو کر عرصۂ دراز تک دعاء کی، اللہ میاں نے ان کی دعاء قبول فرمالی، گریہ وزاری اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، عادۃ اللہ یہی ہے کہ جب کوئی گریہ وزاری کے

(۱) هدى السارى ص ٦٤٠/.

(۲) هدى السارى ص ٦٤٠ .

(۳) هدى السارى ص ٦٤١/.

ساتھ دعاء مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی دعاء قبول فرماتے ہیں۔

چنانچہ حضرت والا فرماتے تھے کہ ایک شیخ پر قرضہ ہو گیا، وہ بیمار ہو گئے، حالت غیر ہو گئی، مشہور ہو گیا کہ شیخ قریب المرگ ہیں، سارے قرض خواہ آموجود ہوئے، تقاضا کیا، شیخ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو، اتنے میں ایک بچہ حلوہ بیچنے آیا، خادم سے فرمایا : دیکھو! کیا ہے؟ عرض کیا حلوہ فروش ہے، فرمایا: بلالو!، چنانچہ بلوالیا، بھاؤ معلوم کیا، حلوہ دیکھا کہ کس قسم کا ہے اور فرمایا کہ سارا تول دو، بچہ بہت خوش ہوا اور سارا تول دیا، فرمایا : کھاؤ، چنانچہ سب کو کھلایا، بچے کو بھی کھلایا تو وہ اور بھی خوش ہوا کہ حلوہ بھی فروخت ہوا، اور کھانے کو بھی ملا، جب سب کھا چکے تو آپ چادر تان کر لیٹ گئے، پیسے دینے کا نام ہی نہیں لیا تو بچہ رونے لگا، فرمایا: کیوں روتے ہو؟ تو اس نے کہا: پیسے دے دیجئے تو کہا کہ اگر پیسے ہوتے تو یہ لوگ کیوں بیٹھے رہتے۔

یہ سن کر بچہ اور رونے لگا کہ میری والدہ نے تو حلوہ فروخت کرنے کے لیے بھیجا تھا، اگر پیسے نہ لے گیا تو اماں پٹائی کرے گی۔ اتنے میں ایک شخص نے آکر دروازہ پر دستک دی اور کہا کہ فلاں امیر صاحب نے آپ کو یہ رقم بھیجی ہے، یہ کہہ کر آنے والے نے رقم پیش کردی، شیخ نے بچے کو اور قرض خواہوں کو سب کو پیسے دے دئے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا اللہ دینے میں اتنی دیر کیوں فرمائی؛ تو اللہ تعالی نے فرمایا کہ مانگنے والے تو بہت تھے مگر رونے والا کوئی نہیں تھا، جب یہ بچہ رویا، ہم نے اس کی دعاء قبول کرلی۔

تو امام بخاریؒ کی والدہ بہت روتی تھیں اور دعائیں مانگتی تھیں، ایک روز خواب میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کو دیکھا کہ فرماتے ہیں : محمد بن اسماعیل کی والدہ تم روتی کیوں ہو؟ دیکھو تمہارے بچے کو اللہ تعالیٰ نے بینائی عطا فرمادی، اُٹھ کر دیکھا تو واقعی آپ بینا ہو چکے تھے تو والدہ کی دعاء سے ان کو

بینائی عطا ہو(۱)۔

قرآن پاک کے حفظ کے بعد دس سال کی عمر سے احادیث کا لینا شروع کردیا، اسی طرح ایک سال تک برابر حدیث لینے میں مصروف رہے، گیارہ سال کی عمر میں ایک روز آپ محدث داخلی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر ہوئے، محدث داخلیؒ نے حدیث بیان کی تو سند کو یوں بیان کیا: ''سفیان عن أبی الزبیر عن إبراهیم'' اس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ سند اس طرح نہیں ہے۔ محدث داخلیؒ نے کہا کہ پھر تم بتلاؤ صحیح سند کس طرح ہے؟ تو آپ نے کہا کہ آپ اپنی اصل کتاب لائیے اور مسودہ سے ملائیے، جب اصل نسخہ لایا گیا تو واقعی اس میں اس طرح سند نہیں تھی، محدث داخلیؒ نے پوچھا کہ بتلائیے! اصل سند کس طرح ہے؟ تو آپ نے فرمایا: **هو الزبیر وهو ابن عدی عن إبراهیم** یوں ہے، چوں کہ سفیان، زبیر بن عدی ہی سے روایت کرتے ہیں۔ ابوالزبیر سے نہیں کرتے، اس پر شیخ داخلیؒ نے قلم لے کر اصلاح کی اور فرمایا کہ تم نے سچ کہا، اصل سند اسی طرح ہے، کسی نے پوچھا: اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ فرمایا: گیارہ برس (۲)۔

اسی طرح آپ علم حدیث کو حاصل کرتے رہے، بدون دوات قلم کاغذ لیے احادیث سنتے تھے اور حفظ کر لیتے تھے، ایک روز ان کے ساتھ حاشد بن اسماعیل نے کہا کہ لڑکے کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو، گئے اور آ گئے، نہ قلم دوات ہے نہ حدیث کی کتابت ہے، اس سے کیا حاصل، جب بہت دن تک اسی طرح طعن وتشنیع ہوتی رہی تو ایک روز آپ نے ان سے فرمایا کہ آپ نے کتنی احادیث کو جمع کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ پندرہ ہزار، آپ نے فرمایا کہ آپ اپنی کتاب کو لے کر بیٹھ جائیے اور ملاتے رہیے، اور آپ نے ایک ہی مجلس کے اندر پندرہ ہزار احادیث

(۱) هدی الساری ص ٦٤٠/.

(۲) هدی الساری ص ٦٤٠/.

کو حفظ سنا دیا(۱) اسی طرح اگر کوئی بے چارہ دوات قلم لے کر نہ آئے اور لکھ نہ رہا ہوتو آپ بھی اس کو طعن نہ کیجئے ، ہوسکتا ہے اس زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا حافظہ دے دیا ہو کہ وہ استاذ کی پوری تقریر کو سن کر یاد کرلیتا ہو، یہ الگ بات ہے کہ لکھ لینا بہت اچھا ہے، داشتہ آید بکار، رکھی ہوئی چیز کبھی کام ہی آجاتی ہے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ ہے، میرے ہاں اس قسم کے جملہ معترضہ بہت آتے ہیں تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پندرہ ہزار احادیث اپنے ساتھی کے طعن وتشنیع پر حفظ سنا دیں اور اپنے استاد کی سند پر بھی کلام کیا، اب آپ کی عمر سولہ برس کی ہوجاتی ہے ، دس برس کی عمر سے سولہ برس تک چھے برس کی مدت گذر جاتی ہے، آپ کے والد ماجد اور بھائی احمد بن اسماعیل کا ارادہ حج کا ہوا، آپ بھی ساتھ میں تشریف لے گئے ، حج سے فراغت کے بعد والدہ سے عرض کیا کہ اچھا ہو کہ آپ مجھے حجاز میں تحصیل علم کے لیے چھوڑ جائیں، والدہ نے اجازت دے دی (۲)۔

اُس زمانے کی والدہ ایسی ہی ہوا کرتی تھی، آپ نے چھے سال حجاز میں قیام کیا، وہاں سے آپ طلب حدیث کے لیے مختلف مقامات پر گئے ، مصروشام کا طلب حدیث کے لیے دوبارہ سفر کیا، بصرہ کا چار مرتبہ اور کوفہ بغداد کے سفر وقیام کی تو کوئی انتہا نہیں ہے (۳)۔

جب دو سال آپ کو گذر گئے اور اٹھارہ سال کی عمر ہوئی تو آپ کو تصنیف وتالیف کا شوق ہوا، عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے فقیہ تھے اور امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے ان کی کتابوں کو حفظ کیا، آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب التاریخ مشہور

(۱) هدى السارى ص/ ٦٤٠.
(۲) سير أعلام النبلاء، ج١٠، ص ٢٨١، ط: دار الفكر، بيروت .
(۳) هدى السارى ص/ ٦٤٠.

کتاب ہے جس میں صحابہؓ وتابعینؒ کے اقوال واحوال کو جمع کیا ہے (۱)، نیز صحیح بخاری، جزء رفع یدین اور الادب المفرد اور ان کے علاوہ بہت سی کتابیں آپ نے تصنیف فرمائی ہیں۔

الغرض آپ اسی طرح برابر تصنیف وتالیف میں مصروف رہے اور محدثین کے ہاں آتے جاتے رہے، ایک روز اپنے استاذ اسحٰق بن راہو یہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، وہاں یہ تذکرہ ہوا کہ کیا اچھا ہو کہ کوئی شخص ایسا کھڑا ہو جو ایسی صحیح متصل السند روایات کو جمع کرے کہ جن پر بلا تأمل عمل کیا جا سکے اور یہ پوچھنا نہ پڑے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں یہ بات جم گئی اور خیال ہوا کہ میں ایسی کتاب لکھوں جس میں صحیح احادیث کو جمع کردوں (۲)۔

حجاز میں تو آپ کا قیام تھا ہی، آپ نے اس جمع احادیث کے لیے سرزمین مدینہ منورہ کو تجویز کیا اور مدینہ منورہ میں بھی مسجد نبوی میں ممبر وروضۂ مبارک کے درمیان اس مقام کو منتخب کیا، جس کو روضۃ الجنۃ کہا جاتا ہے، آپ نے وہاں بیٹھ کر جمع احادیث کا کام شروع کیا (۳) اور اس اہتمام کے ساتھ کہ اول غسل فرماتے پھر دو رکعت نفل پڑھتے اور پھر حدیث کو لکھتے، پھر اسی طرح غسل کرتے اور دو رکعت نفل پڑھتے اور دوسری حدیث کو لکھتے، اسی طرح احادیث کو جمع کرنا شروع فرمایا (۴) اور چھے لاکھ احادیث جو آپ کو یاد تھیں، ان میں سے آپ نے انتخاب فرما کر ۷۲۷۵/ احادیث کو اس شانِ احترام واعزاز کے ساتھ سولہ برس

(۱) سیر أعلام النبلاء، ج ۱۰، ص ۲۸۲، ط: دار الفکر، بیروت.
(۲) هدی الساری ص ۱۰/۱.
(۳) سیر أعلام النبلاء، ج ۱۰، ص ۲۸۴، ط: دار الفکر، بیروت.
(۴) ایضًا، ص ۲۸۳.

میں صحیح ، جامع میں جمع کیا(۱)۔

(۱) صحیح بخاری شریف میں احادیث کی کل تعداد کتنی ہے؟، اس سلسلے میں علماء کی تحقیق مختلف ہے، علامہ عینیؒ نے مکررات کے ساتھ یہی تعداد بتائی ہے یعنی ۷۲۷۵، اور حذفِ مکررات کے بعد تقریباً چار ہزار تعداد رہ جاتی ہے، جب کہ انھوں نے ابو حفص عمر بن عبد المجید المیانشی کا قول نقل کیا ہے کہ ''۷۲۰۰'' سے کچھ زیادہ احادیث ہیں۔(عمدة القاری: ۶/۱) لیکن حافظ نے اس قول کی تردید کی ہے، ان کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح بخاری میں بہ شمول مکررات ومعلقات ومتابعات کل ۹۰۸۲/احادیث ہیں اور مکررات کو حذف کرنے کے بعد یہ تعداد دو ہزار پانسو تیرہ (۲۵۱۳) رہ جاتی ہے، جن میں سے معلقات اور متابعات وغیرہ کی تعداد ''۱۶۰'' ہے اور باقی موصولات ہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے یہاں یہ تعداد ان لوگوں کے وہم پر متنبہ کرنے کے لیے بیان کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ مکررات کے ساتھ روایاتِ بخاری کی تعداد ''۷۲۷۵'' ہے (علامہ عینیؒ کے علاوہ علامہ نوویؒ اور علامہ ابن الصلاحؒ وغیرہ کی یہی رائے ہے) اور مکررات کے بغیر روایات کی تعداد چار ہزار یا اس کے قریب ہے إلخ۔ یہ فتح کی آخری جلد کی آخری سطور کی بات ہے۔(فتح الباری :۵۴۳/۱۳) اور ہدی الساری میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح بخاری میں احادیثِ موصولہ کی تعداد بغیر تکرار کے ''۲۴۶۰'' ہے اور تعلیقات ''۱۵۹'' کی تعداد میں ہیں اور موصولہ وموقوفہ وغیرہ کی مجموعی تعداد وہی ''۹۰۸۲'' بیان کی ہے۔(هدى الساري :۴۶۹، ط:المكتبة السلفية) علامہ قسطلانیؒ نے ہدی الساری میں اس باب میں موجود طویل تفصیل کا خلاصہ بیان کیا ہے کہ معلقات اور متابعات کے علاوہ مکررات کے ساتھ صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد ''۷۳۹۷'' ہے یعنی علامہ ابن الصلاحؒ کے قول کی بہ نسبت ''۱۲۲'' احادیث زیادہ ہیں اور حذفِ تکرار کے بعد یہ تعداد ''۲۶۰۲'' رہ جاتی ہے اور متونِ معلقہ مرفوعہ غیر موصولہ ''۱۵۹'' ہیں، اس طرح احادیثِ مرفوعہ کی تعداد ''۲۷۶۱'' ہو جاتی ہے، بخاری میں کل تعلیقات ''۱۳۴۱'' ہیں جن میں سے اکثر مکرر ہیں اور کتاب میں ان کی تخریج کی گئی ہے (یعنی کل تعلیقات اگرچہ اس قدر زیادہ ہیں لیکن حذفِ مکررات کے بعد، اسی طرح جن تعلیقات کی صحیح میں تخریج ہو چکی ہے، ان کو خارج کرنے کے بعد تعلیقات کی تعداد یہی ''۱۵۹'' رہ جاتی ہے) اور متابعات اور اختلافِ روایات پر تنبیہ کی قبیل سے ''۳۴۴'' احادیث ہیں، اس طرح مکررات کے ساتھ احادیثِ صحیحہ کی تعداد ''۹۰۸۲'' ہو جاتی ہے جو احادیثِ موقوفہ علی الصحابہ اور اقوالِ تابعین کے علاوہ ہے۔(إرشاد الساري :۲۸/۱) علامہ بدرِ عالم میرٹھیؒ نے مقدمۂ فیض الباری کے حاشیے میں ہدی الساری والی تحقیق کو — جس کو یہاں علامہ قسطلانیؒ کے حوالے سے نقل کیا گیا — صحیح قرار دے کر فتح الباری والی تحقیق کو ناسخ کے سہو پر محمول کیا ہے۔(حاشیۂ مقدمۂ فیض الباری، ص:۲۸) بعض حضرات کا ماننا ہے کہ یہ تعدادِ روایات کا اختلاف نسخوں کے اختلاف پر مبنی ہے، چنانچہ نسخۂ حماد بن شاکر میں نسخۂ فربری کے مقابلے میں ۲۰۰/احادیث کم ہیں اور نسخۂ ابراہیم میں تو ۳۰۰/احادیث کم ہیں۔(متعلقاتِ دورۂ حدیث : ص/۲۱۵ بہ حوالہ مقدمۂ لامع الدراری) واللہ تعالی اعلم۔

ظاہر ہے کہ جب اس اہتمام واحترام کے ساتھ لکھیں گے تو کتنا عرصہ لگے گا، تو اس ادب واحترام کے ساتھ آپ نے بخاری شریف کو لکھا، مکررات کو نکال دیجیے تو کل تعداد بخاری شریف کی احادیث کی ۴۰۰۰ ر چار ہزار رہ جاتی ہے(۱)۔

جب آپ نے بخاریٰ کو واپسی فرمائی اور درس دینا شروع کیا تو بلاواسطہ آپ نے بخاری شریف کی سند نوے ہزار کو دی ہے، اس عرصہ میں جب آپ کا درس نہایت وسیع ہوا، اور آپ شہرۂ آفاق ہوئے تو جوق درجوق آپ کے درس میں لوگوں کا مجمع ہوگیا، اس تشہیر کی وجہ سے خالد بن احمد حاکم بخاریٰ کو اپنے بچوں کی تعلیم کا خیال ہوا، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے کہلا بھیجا کہ آپ میرے مکان پر آکر میرے بچوں کو تعلیم دیا کریں۔ بھلا ایسا شخص جس نے احادیث کو ایسے اعزاز واحتیاط اور احترام کے ساتھ جمع کیا ہو، اور صحت کا اس درجہ اہتمام کیا ہو کہ آپ ایک مرتبہ سفر کر کے ایک محدث کے پاس ایک حدیث کو لینے گئے، جب پہنچے، وہ جنگل میں اپنی گھوڑی کو اپنا دامن پکڑ کر بلا رہے تھے، آپ نے فرمایا کہ تمھارے دامن میں کچھ ہے، انھوں نے فرمایا کہ کوئی چیز نہیں ہے، اس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص جانوروں کو دھوکہ دے سکتا ہے، اس کی حدیث پر کیا اعتبار ہوسکتا ہے اور یہ فرما کر بلا حدیث لیے ہی واپس آگئے۔

تو جس نے احتیاط، اہتمام واحترام کے ساتھ احادیث کو جمع کیا ہو، بھلا وہ حاکم کی بات سے مرعوب ہو کر پڑھانے کے لیے گھر جائے! یہ کیسے ہوسکتا تھا؟، یہ درویشی نہیں ہے، مقام علم ہے کہ جس میں کامیاب کے سامنے سجدہ کرایا جاتا ہے، دیکھئے! آدم علیہ الصلوۃ والسلام علم میں کامیاب ہوئے تو آپ کو سجدہ کرایا گیا، چوں کہ جیسا کامیاب ویسے ہی نمبر اور جیسے نمبر ویسا ہی انعام تو سب سے بڑا انعام ان کے لیے سجدہ تعظیمی کرانا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس شریعت میں وہ سجدۂ

(۱) مقدمة ابن الصلاح، ص ۲۰.

تعظیمی بھی منسوخ ہو گیا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ علم ہے اس کو لینے کے لیے یہاں آویں، حاکم نے کہا بہت اچھا مگر اُس وقت غرباء کے بچے نہ ہوں، امام بخاریؒ نے انکار فرما دیا کہ یہ بھی نہیں ہوسکتا، یہ علم عام ہے جو بھی آوے گا، کسی قوم کا ہو، امیر ہو یا غریب ہو، میں اس کو اپنے درس سے نہیں ہٹا سکتا۔

یہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ سردارانِ قریش نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ جی چاہتا ہے کہ ہم آپ کا کلام سنیں، کیا عجب ہے کہ ہم کو ہدایت ہوجائے آپ کے اندر چوں کہ ملاطفت، رفق ورحمت بے انتہا تھی تو آپ کو کچھ خیال ہوا کہ اس بہانے ہی ان کو ہدایت ہوجائے مگر ذاتِ باری کی طرف سے وحی آ گئی کہ یہ آویں یا نہ آویں، ان کی وجہ سے ان بندوں کو جو ہر وقت ہمارا نام لیتے ہیں، نہ ہٹایا جائے، برابر آپ ان کو اپنے پاس رہنے دیجئے، چنانچہ ارشاد باری ہے: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ [الکهف]

اور دوسری جگہ سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ ﴾ [الأنعام]۔

تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے بھی انکار فرما دیا کہ سب کو ہٹا کر مخصوص طور پر ان کے صاحب زادوں کو درس دیں، علمائے سوء جن کے اندر طمع غالب ہوتی ہے، ہر زمانے میں ہوتے ہیں، اسی لیے لکھا ہے کہ طلبہ کے انتخاب میں یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ طامع تو نہیں ہیں، اگر تم کو قرائن قویہ وتجربات متعددہ سے طامع

ہونا کسی طالب علم کا معلوم ہوجائے تو اس کو انتہائی تعلیم مت دو، تجربہ سے جدھر اس کا رخ دیکھو: کتابت، خیاطی وغیرہ اس میں لگادو، تو طامع کو انتہائی تعلیم نہیں دینی چاہئے، ورنہ لالچ میں آکر حرام کو حلال کردکھائے گا، طلبہ کے انتخاب کے اندر متقدمین نے اس کا بڑا خیال رکھا ہے، اگرچہ اب اس کا خیال نہیں رکھا جاتا، یہ ہماری غلطی ہے۔

تو حاکم جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے ناراض ہوا تو اس نے طماع علماء کو بلایا اوران سے ایک محضر نامہ لکھایا جس میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مسائل مستنبط پر کلام کیا گیا، سب نے اس محضر نامے پر دستخط کیے، حاکم نے سپاہی بھیج کر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ہاں طلب کرلیا اور کہا: چوں کہ آپ مسائل غلط بتلاتے ہیں، دین کے اندر خلل پیدا کرتے ہیں، لہٰذا آپ کو شہر بدر کیا جاتا ہے، چنانچہ آپ کو نکال دیا گیا۔

آپ صبر وتحمل کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئے، چند روز بعد ہی امیرِ بخاریٰ نے حکم جاری کیا کہ گورنرِ بخاریٰ کو گرفتار کرلیا جائے اور گدھے پر سوار کر کے تشہیر کی جائے اور رسوا کیا جائے (۱)، اس نے امام کو نکالا، امیر وقت نے اس کو نکالا، حدیث میں ہے :**مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالحَرْبِ** (۲)، یہ حضرات تو کچھ کہتے نہیں، صبر فرماتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کو غیرت آتی ہے اوران پر عذاب آتا ہے۔

ان علماء پر بھی اسی طرح مصیبت آئی، حریث بن ورقہ جوان میں شریک تھا، اس کی بھی اسی طرح ذلت ہوئی، ایک اور عالم کی تمام اولاد ختم ہوگئی، سلسلۂ نسب

---

(۱) هدى السارى ص/۴۹۰، سيرأعلام النبلاء، ج۱۰، ص۳۱۷، ط: دارالفكر، بيروت.

(۲) صحيح البخارى، ج۲ ص ۹۶۳، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضى الله تعالى عنه، كتاب الرقاق، بَابُ التَّوَاضُعِ، رقم الحديث: ۶۵۰۲.

اور علم کا شیوع سب ختم ہو گیا(١)۔

اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نیشا پور تشریف لے گئے، وہاں عرصہ قیام کیا مگر وہاں کے امیر سے بھی موافقت نہ ہوئی اور کچھ دن بعد وہاں سے بھی تشریف لے گئے(٢) پھر وہاں سے مقام خرتنگ گئے جو سمرقند کے قریب نو میل کے فاصلے پر ہے، وہیں آپ نے قیام فرمایا اور وہیں پر ٢٥٦ھ میں آپ کی وفات ہوئی، ١٩٤ھ میں ولادت ہوئی تھی، اس طرح باسٹھ برس کی عمر میں رمضان المبارک کی آخری رات سے عید کی شب بعد العشاء آپ کا انتقال ہوا(٣)۔

آپ کے استاذ ابوبکر خطیب حمیدی شافعیؒ روایت کرتے ہیں ... یوں تو امام بخاریؒ کے اساتذہ بہت ہیں، بروایتِ خود امام بخاریؒ کے اساتذہ ایک ہزار، اسی (١٠٨٠) ہیں، مگر مشہور ان میں چند ہیں، ایک تو یہی اسحق بن راہویہؒ ہیں، یہ عبداللہ بن مبارکؒ کے شاگرد ہیں اور وہ امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں، دوسرے علی بن مدینیؒ، یہ یحییٰ بن قطانؒ کے شاگرد ہیں اور یحییٰ ابن قطانؒ امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں، تیسرے امام احمد بن حنبلؒ، یہ امام ابو یوسفؒ کے شاگرد ہیں اور امام ابو یوسفؒ بھی امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں، چوتھے یحییٰ بن معینؒ (٤) یہ امام محمدؒ کے شاگرد ہیں، اور امام محمد امام اعظمؒ کے، پانچویں ابوبکر خطیب حمیدی شافعی بغدادیؒ، ان کے استاذ اکثر امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں، تو امام بخاریؒ امام اعظمؒ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔

چوں کہ امام بخاریؒ امام اعظمؒ سے تقریباً نصف صدی بعد پیدا ہوئے ہیں، اور اتنی طویل مدت میں بہت حالات بدل جاتے ہیں، اسی لیے کہا گیا ہے کہ صحیح

(١) سیر أعلام النبلاء، ج١٠، ص٣١٧، ط: دار الفکر، بیروت.
(٢) تاریخ بغداد، ج٢ ص٢٩، ط: دار الکتب العلمیة، بیروت.
(٣) سیر أعلام النبلاء، ج١٠، ص٣١٩، ط: دار الفکر، بیروت.
(٤) تاریخ بغداد، ج٢ ص٥، ط: دار الکتب العلمیة، بیروت.

بخاری میں احادیث صحیح ہیں، یہ صحیح ہے مگر امام اعظم پر یہ احادیث حجت نہیں ہوسکتی، کیوں کہ امام اعظمؒ کا زمانہ بہت قریب ہے، ممکن ہے کہ امام بخاریؒ تک پہنچنے میں وہ حدیث جو امام اعظمؒ نے اپنے استدلال میں پیش کی تھی، ضعیف ہوگئی ہو، اور امام اعظمؒ کے نزدیک وہ صحیح ہو، اس کا خیال رکھئے! بہت کام کی بات ہے، امام اعظمؒ کا واسطہ نہایت قریب ہے، امام اعظمؒ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کو دیکھنے والے ہیں، ائمہ اربعہ میں سے اور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے صحابہ کرام کو دیکھا ہو، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ جیسے جلیل القدر صحابی فقہ میں صرف تین واسطوں سے امام اعظمؒ کے استاذ ہیں اور اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ امام بخاریؒ نے کوفہ اور بغداد کے کتنے سفر کئے ہیں، اور وہاں اکثر محدثین احناف تھے، جو امام بخاریؒ کے استاذ ہیں۔

یہ بات درمیان میں آ گئی، اصل بات یہ چل رہی تھی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ ابوبکر خطیب حمیدیؒ محدث عبدالواحد بن آدم طواویسی سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مع صحابہ کرامؓ کے جم غفیر کے کھڑے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی کے استقبال میں کھڑے ہیں، میں نے عرض کیا : حضور! آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں ؟ فرمایا کہ ہم یہاں محمد بن اسماعیل کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد جب ان کو امام بخاریؒ کی وفات کی اطلاع پہنچی تو خواب جس تاریخ کو دیکھا تھا، وہی وفات کی تاریخ تھی (۱)۔

بھلا جنھوں نے جمع احادیث کے لیے ایسا تعب برداشت کیا ہو، اس درجہ احتیاط برتی ہو، ایسا اہتمام وتقویٰ اختیار کیا ہو، اس درجہ اعزاز واحترام کو مدنظر رکھا ہو، وہ کیوں نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب ترین ہوں گے؟ اسی لیے تجربہ ہے کہ اگر

(۱) تاریخ بغداد، ج ۲ ص ۳۳، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت.

کسی قسم کی آفت ومصیبت پیش آجائے تو بخاری شریف کاختم کر کے دعاء مانگی جائے ،ان شاء اللہ وہ بلا دور ہو جائے گی۔

تمام مسلمانوں نے اس کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کالقب دیا ہے۔ جب آپ کو دفن کیا گیا تو قبر شریف سے ایک مدت تک مشک کی خوشبو آتی رہی (۱)۔

اور دوسرے متعدد محدثین کا بیان ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے خواب میں اس بخاری شریف کو اپنی طرف منسوب فرمایا، چنانچہ خالد بن عبداللہ مروزی فرماتے ہیں کہ میں رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان سویا ہوا تھا، خواب میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا اے ابوزید! کتاب شافعی کو کب تک پڑھاتے رہو گے، میری کتاب کو کیوں نہیں پڑھاتے؟ میں نے عرض کیا حضور! آپ کی کتاب کون سی ہے؟ تو فرمایا کہ جامع محمد بن اسماعیل میری کتاب ہے، اس کے بعد انھوں نے بخاری شریف کو پڑھانا شروع کیا (۲)۔

یہ امام بخاریؒ کی زندگی کا ایک مختصر ساخا کہ اور اس کا بیان ہے کہ کس احتیاط، اہمیت وعظمت، اعزاز واحترام، تقویٰ وطہارت کے ساتھ امام نے ان احادیث کو جمع کیا ہے، اس لیے جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے فضل سے میزان سے لے کر یہاں تک پہنچایا اور ہمارے ہاتھوں میں بخاری شریف کو دے دیا تو اول تو ہر کتاب ہی عموماً اور بخاری شریف تو خصوصاً باوضو پڑھنا ہی چاہئے، اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت باادب واحترام بیٹھنا چاہئے، یہ نہیں کہ طبیعت کے اندر ایک آزادگی ہو، جس طرح چاہا بیٹھ گئے، جس سے معلوم ہو کہ ادب نہیں ہے، اس طرح علم نہیں آئے گا، یوں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں؛ یہ اور بات ہے اس لیے طلبہ

---

(۱) هدى السارى ص ٦٦٣.

(۲) هدى السارى ص ٦٥٦.

کو چاہئے کہ علم اور آلات علم اور اہل علم کا عموماً اور اپنے اساتذہ کرام کا خصوصاً ادب واحترام کی فکر اور اہتمام رکھیں، یہ تھی مختصر سوانح امام بخاریؒ کی جو بیان کی گئی، آگے ان شاء اللہ زندگی بخیر رہی تو سبق چلیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اسلاف کی اتباع کی توفیق بخشے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الدرس الثاني

۱ - بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إِلَى رَسُولِ الله ﷺ؟

جب آپ من حیث المقدمہ حدیث کی تعریف اوراس کا موضوع اوراس کی غرض اورحدیث وکتب حدیث کے اقسام معلوم کرچکے تو اب کتاب بخاری سے متعلق جو بعد بسملہ "بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءِ الوَحْيِ" میں بحثیں ہیں، ان کا بیان شروع کیاجاتاہے، اوروہ چند بحثیں ہیں:

اجمالی مباحث

(۱) امام بخاریؒ نے تسمیہ کے بعد حمد کو ذکرنہیں فرمایا، حالاں کہ حدیث شریف میں وارد ہے: كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِحَمْدِ اللهِ فَهُوَ أَقْطَعُ. أو كما قال (۱)۔

نیز تمام مؤلفین ومصنفین اپنی کتب میں بعد بسملہ کے حمد وصلوۃ لاتے ہیں جو کہ اجماع فعلی ہے، اور بہ ظاہر کتاب اللہ کی موافقت بھی ہے، تو امام بخاریؒ کا یہ فعل کتاب اللہ کے بھی خلاف ہے، حدیث کے بھی خلاف ہے اور طریق مصنفین اور تعاملِ اسلاف کے بھی خلاف ہے جو کہ امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر محدث کی شان سے نہایت ہی عجیب ہے، پھر آپ نے اس تفرد کی کیوں جرأت فرمائی؟۔

(۲) تسمیہ کے بعد باب کے عنوان سے شروع فرمایا، دیگر محدثین مؤلفین کی

---

(۱) صحيح ابن حبان، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضى الله تعالى عنه، ذِكْرُ الْإِخْبَارِ عَمَّا يَجِبُ عَلَى الْمَرْءِ مِنَ ابْتِدَاءِ الْحَمْدِ لِلهِ جَلَّ وَعَلَا فِي أَوَائِلِ كَلَامِهِ عِنْدَ بُغْيَةِ مَقَاصِدِهِ.

طرح کتاب کا عنوان کیوں اختیار نہ فرمایا؟۔

(۳) سب سے اول مثل دیگر اصحاب کتب حدیث نہ کتاب الایمان کو بیان کیا، نہ کتاب الطہارۃ کو بلکہ بہ جائے اس کے وحی کا بیان مقدم کیا، یہ تفرد کیوں اختیار فرمایا؟۔

(۴)۔۔ تراجم ابواب ابتدائی ہیں یا الحاقی ؟۔

(۵) باب کی لفظی ومعنوی کیا تحقیق ہے اور اس کا اعراب کیا ہے؟۔

(۶) کیف کے کتنے معانی ہیں اور یہاں کس معنیٰ میں ہے؟۔

(۷) "بدء" ناقص ہے یا مہموز ہے اور اگر دونوں صحیح ہیں تو راجح کون ہے؟۔

(۸) وحی کے کتنے معانی ہیں اور یہاں کون سے معنیٰ مراد ہیں؟۔

(۹) رسول کے کیا معنیٰ ہیں اور رسول و نبی میں کیا نسبت ہے؟۔

(۱۰) رسول سے یہاں کون سے رسول مراد ہیں؟۔

(۱۱) اللہ جو کہ اسم علم ہے اس کی اصل کیا ہے اور معنیٰ حقیقی کیا ہیں، کیا غیر اللہ پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے؟۔

(۱۲) صلوٰۃ کے کتنے معنیٰ ہیں اور یہاں کس معنیٰ میں ہے؟۔

(۱۳) سلم کو صلوٰۃ کے ساتھ کیوں جمع کیا؟۔

(۱۴) ترجمۃ الباب امام بخاریؒ کا ایک دعویٰ ہوتا ہے اور تحت الباب آیت وحدیث اس کی دلیل ہوتی ہے اور دلیل کا دعویٰ کے ساتھ موافق ہونا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا یہاں آیت ﴿ اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ۚ [النساء: ۱۶۳] کو اور احادیث مذکورہ فی الباب کو ترجمہ باب سے کیا مناسبت ہے؟۔

(۱۵) حضرات محدثینؒ حدیث شریف کو کن کن الفاظ سے بیان کرتے ہیں؟۔

تفصیلِ مباحث

پہلی بحث یہ تھی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بسم اللہ کے بعد بغیر حمد کو ذکر کیے ہی کتاب شروع فرمادی، جو کہ طریقِ اسلاف کے بھی خلاف ہے، چوں کہ طریقِ اسلاف یہ ہے کہ اولاً حمد وصلوٰۃ بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد مضامین مقصود کے بیان میں مشغول ہوتے ہیں، نیز امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فعل خود حدیث شریف کے بھی خلاف ہے، اور امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر محدث کی شان سے یہ نہایت عجیب ہے کہ وہ حدیث کے خلاف کریں، حدیث شریف میں تو وارد ہے: كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِحَمْدِ اللهِ، فَهُوَ أَقْطَعُ کہ جو کام بغیر حمد کے شروع کیا جائے، وہ بے برکت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر حمد کے کسی اہم کام کو شروع کر دینا پسند نہیں فرمایا بلکہ اس پر بے دلی کا اظہار فرمایا ہے۔ الحاصل امام بخاریؒ کا بسم اللہ کے بعد فوراً کتاب شروع کر دینا طریقِ اسلاف وطریق مؤلفین ومصنفین کے بھی خلاف ہے جو کہ ایک قسم کا اجماع ہے اور حدیث شریف کے بھی خلاف ہے، یہ خلجان اور اشکال ہوتا ہے۔

سو اس کے متعدد جوابات ہیں، طریق اسلاف کی مخالفت کا جواب تو یہ ہے کہ بسم اللہ کے بعد حمد کو ذکر نہ کرنا اس کا طریق اسلاف کے خلاف ہونا تسلیم نہیں، کیوں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جو سب سے ہی مقدم ہیں اور نہایت عظیم القدر اور جلیل المرتبت محدث ہیں، ان کی جلالتِ قدر کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث شریف کا درس دیتے ہوئے ایک مرتبہ بچھو نے چالیس مرتبہ ڈنک مارا مگر ذرا حرکت نہیں کی، اسی شانِ وقار کے ساتھ کوہِ سکون بنے رہے، غلبہ ادب حدیث کی وجہ سے اپنی توجہ حدیث کی طرف ہی برقرار رکھی، عظمتِ کلام رسول میں ذرا فرق آنا گوارا نہ فرمایا۔

تو ایسے محدث جن کی کتاب موطا امام مالک کے نام سے مشہور ہے، اس میں بھی بسم اللہ کے بعد حمد وصلوٰۃ نہیں ہے، اسی طرح دوسرے اسلاف نے بھی تحمید کا التزام نہیں فرمایا، پس امام بخاریؒ کا بسم اللہ کے بعد بغیر تحمید کتاب شروع فرما دینا طریقِ اسلاف کے خلاف نہیں ہوا۔

اب رہی دوسری بات کہ حمد کو ذکر نہ کرنا حدیث کے خلاف ہے، سو یہ غلط ہے اور اس کے غلط ہونے کی مختلف وجوہ ہیں: اول جس حدیث کو لے کر اعتراض ہو رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صحیح نہ ہو، پھر وہ کیسے اس پر عمل کرنے کے مکلف ہوسکتے ہیں (۱)۔

دوم: اگر صحیح بھی ہو تو اس میں لکھنے کی قید نہیں تو ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ نے زبانی حمد فرما لی ہو (۲)۔

سوم: بسم اللہ پر اکتفا فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ تحمید لانا واجب نہیں، لہٰذا نہ لانا بھی جائز ہے۔ اس پر اگر کوئی وجوب تحمید کا دعویٰ کرے تو کہا جائے گا کہ وجوب کے لیے حدیث کا محکم ہونا ضروری ہے اور اس حدیث کو محکم ثابت کرنا مشکل ہے؛ اس لیے کہ اس میں اضطراب ہے، چنانچہ کسی حدیث میں **لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِالْحَمْدِ لِلّٰهِ** (۳) ہے تو کسی میں **بِبِسْمِ اللهِ** (۴) ہے، کسی روایت میں **أَقْطَعُ** (۵)

(۱) (الأول) أن الحديث ليس على شرطه.(عمدة القاری ۱/۴۴)

(۲) فلعله حمد وتشهد نطقا عند وضع الكتاب ولم يكتب ذلك اقتصارا على البسملة.(فتح الباری ۱/۹)

(۳) سنن ابو داؤد ۲/۶۶۵، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ تعالی عنہ، كتاب الادب، باب الهدى فى الكلام، رقم الحديث: ۴۸۴۰.

(۴) أخرجه الحافظ عبد القادر الرهاوي في أربعينه من حديث أبي هريرة مرفوعا، كمافى الجامع الكبير للسيوطى، ج ۱ ص ۶۲۳.

(۵) صحيح ابن حبان، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضى الله تعالى عنه، ذِكْرُ الْإِخْبَارِ عَمَّا يَجِبُ عَلَى الْمَرْءِ مِنَ ابْتِدَاءِ الْحَمْدِ لِلّٰهِ جَلَّ وَعَلَا فِي أَوَائِلِ كَلَامِهِ عِنْدَ بُغْيَةِ مَقَاصِدِهِ.

ہے تو دوسری میں اس کے بہ جائے أبتر (۱) أجزم (۲) وغیرہ کے الفاظ ہیں، تو لفظی ومعنوی دونوں قسم کے اضطراب موجود ہیں، لہٰذا یہ حدیث محکم نہیں، پس اس سے وجوب ثابت نہیں ہوسکتا، اور جب واجب نہیں تو ترک پر اعتراض کرنے کا بھی حق نہیں ہوگا۔

چہارم: رہا یہ سوال کسی حدیث میں بسم اللہ اور کسی میں بحمد اللہ کے الفاظ ہیں تو تطبیق کی یہی صورت ہے کہ مقصود نبی ﷺ ذکر اللہ کی تعلیم ہے جو دونوں الفاظ سے حاصل ہے، چنانچہ یہی حدیث ان الفاظ "**كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِذِكْرِ اللهِ أَقْطَعُ**" (۳) کے ساتھ بھی مروی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود ذکر الٰہی سے ابتداء ہے، اب جیسا کسی کا محاورہ ہو، جیسی عادت ہو، تسمیہ کے ذریعہ ہو یا تحمید کے ذریعہ ہو، قولی ہو یا فعلی ہو، حدیث پر عمل ہوجائے ، پس امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بسم اللہ کے بعد اپنی کتاب کو شروع کردینا نہ طریق اسلاف کے خلاف ہے اور نہ حدیث شریف کے خلاف ہے۔

نیز اس حدیث سے اگر بسم اللہ کے بعد حمد کا لانا ضروری ٹھہرایا جائے تو آپ نے جو خطوط بادشاہوں کے نام بھیجے، ان پر بھی یہ اعتراض ہوتا ہے، چوں کہ آپ نے بھی بسم اللہ کے بعد حمد نہیں لکھی۔

بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اتباعِ ذاتِ حق اور اتباع رسول برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام دونوں امام بخاریؒ کے اس فعل میں نظر آتے ہیں، اس لیے کہ حضور اکرم

---

(۱) كُلُّ كَلَامٍ لَا يُبْدَأُ فِي أَوَّلِهِ بِذِكْرِ اللهِ، فَهُوَ أَبْتَرُ. (السنن الکبری للنسائی، عَنِ الزُّهْرِيِّ مرسلا، مَا يُسْتَحَبُّ مِنَ الْكَلَامِ عِنْدَ الْحَاجَةِ، رقم الحدیث: ۱۰۲۵۸)

(۲) كُلُّ كَلَامٍ لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِالْحَمْدُ لِلَّهِ فَهُوَ أَجْذَمُ. (سنن أبی داود، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللّٰہ تعالی عنہ، بَابُ الْهَدْيِ فِي الْكَلَامِ، رقم الحدیث: ۴۸۴۰.)

(۳) سنن الدارقطنی، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ تعالی عنہ، كِتَابُ الصَّلَاةِ، رقم الحدیث: ۸۸۴.

ﷺ نے جومکتوبات وصحیفہ جات بادشاہوں کے نام ارسال فرمائے جس کی ایک مثال اسی بابِ وحی میں حدیثِ ہرقل میں وہ صحیفہ منقول ہے جوآں حضرت ﷺ نے عظیم روم کے نام ارسال فرمایا تھا، اسی طرح عاملینِ صدقات کو جوخطوط روانہ فرمائے ہیں، ان میں بھی تحمید نہیں، اورصلح حدیبیہ کے موقع پرصلح نامہ میں بھی تحمید کا ذکرنہیں، صرف بسم اللہ ہے (۱) اوراس کے علاوہ انبیائے سابقین کا بھی یہی طرزوطریق معلوم ہوتا ہے کہ وہ بسم اللہ پراکتفا فرماتے تھے، چنانچہ حضرت سلیمان علیہ الصلوۃ والسلام کا خط بلقیس کے نام جوقرآن پاک میں مذکور ہے اس میں بھی بسم اللہ ہی ہے، تحمید نہیں ہے۔

ادھرخود ذاتِ باری سبحانہ وتعالیٰ نے جوابتداء وحی نازل فرمائی توحضرت جبرئیل علیہ السلام نے بلاتحمید ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱﴾ [العلق] فرمایا(۲)۔

پس امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عمل طریقِ اسلاف کے بھی موافق اورطریق رسول ﷺ کے بھی موافق بلکہ طریق انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کے بھی مطابق اورسنت الٰہی پربھی منطبق ہے۔

پنجم: حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جوکچھ تمام قرآن میں موجود ہے، وہ سب سورہ فاتحہ میں محفوظ ہے اورجوکچھ سورہ فاتحہ میں ہے، وہ سب بسم اللہ

(۱) ويؤيده أيضًا وقوع كتب رسول الله - ﷺ - إلى الملوك، وكتبه في القضايا مفتتحة بالتسمية دون حمدلة وغيرها، كما يأتي في حديث أبي سُفيان في قصة هِرَقْل في هذا الباب، وكما يأتي في حديث البَراء في قصة سهيل بن عمرو في صلح الحُدَيْبِية، وغير ذلك من الأحاديث. (كوثَر المَعَاني الدَّرَارِي في كَشْفِ خَبَايا صَحِيحُ البُخَاري للشنقيطى، ج ۱ ص ۱۲۵)

(۲) لأن أول ما نزل من القرآن: {اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّك}، فالتَّأسي به يحصل بالشروع بالبسملةالخ (فيض الباری، ج ۱ ص ۷۷.)

میں ہے، اور جو کچھ بسم اللہ میں ہے، وہ بسم اللہ کی بامیں موجود ہے تو جب بسم اللہ کی بامیں پورا قرآن ہے(۱) تو بسم اللہ میں حمد ہونا کوئی قابل تعجب بات نہیں ؛ لہٰذا بسم اللہ کے ذریعہ حمد ہونے سے بھی حدیث تسمیہ وحدیث تحمید دونوں پر عمل ہو گیا۔

الحاصل بسم اللہ کے اندر حمد موجود ہے جس پر لفظ اللہ معناً دال ہے کہ اللہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو اپنی ذات میں تمام صفاتِ کمالیہ کو مستجمع ہے (۲) اور بیان صفات کمالیہ یہی حمد ہے تو لفظ اللہ مشتمل و متضمن حمد کو ہے، نیز وصفِ رحمن ورحیم بھی صفتِ رحمانیت ورحیمیت کو بیان کررہے ہیں جو کہ یہ بھی حمد ہے تو پس چوں کہ لفظ اللہ ذاتِ علم اور وصفِ رحمٰن ورحیم حمد کو ظاہر کررہے ہیں تو گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تسمیہ کے ساتھ حمد کو بھی بیان فرمادیا کہ تسمیہ صراحتاً اور تحمید ضمناً ہے؛ اس لیے اب کوئی اعتراض حدیث کے خلاف ہونے کا نہ رہا کہ امام بخاریؒ نے تسمیہ کو ذکر فرمایا اور تحمید کو ذکر نہیں فرمایا۔

اس کے بعد بحث یہ تھی کہ تسمیہ کے بعد باب کے عنوان سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کیوں شروع فرمایا،مثل دیگر مؤلفین و مصنفین کے کتاب الایمان، کتاب الطہارۃ وغیرہ کے شروع میں لانے کو کیوں ترک کردیا؟۔

---

(۱) حضرت علیؓ کا یہ قول نہیں مل سکا، البتہ تفسیرِ رازی وغیرہ بعض کتبِ تفسیر میں یہ قول اس طرح منقول ہے :قِيلَ :كُلُّ الْعُلُومِ مُنْدَرِجٌ فِي الْكُتُبِ الْأَرْبَعَةِ، وَعُلُومُهَا فِي الْقُرْآنِ، وَعُلُومُ الْقُرْآنِ فِي الْفَاتِحَةِ، وَعُلُومُ الْفَاتِحَةِ فِي (بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ) وَعُلُومُهَا فِي الْبَاءِ مِنْ بِسْمِ اللهِ (قُلْتُ) لِأَنَّ الْمَقْصُودَ مِنْ كُلِّ الْعُلُومِ وُصُولُ الْعَبْدِ إِلَى الرَّبِّ، وَهَذَا الْبَاءُ بَاءُ الْإِلْصَاقِ فَهُوَ يُلْصِقُ الْعَبْدَ بِالرَّبِّ، فَهُوَ كَمَالُ الْمَقْصُودِ.(مفاتيح الغيب = التفسير الكبير، ج ۱ ص ۹۸ .)

(۲) كتاب المسامرة بشرح المسايرة، ص ۵۰ .

لفظِ باب کی تحقیق

اس کی وجہ معلوم کرنے سے قبل لفظ ''باب'' کی لفظی ومعنوی تحقیق بہ طور تمہید بیان کرنا ضروری ہے کہ لفظ باب اصل میں بَوَبٌ تھا، واؤ متحرک ماقبل مفتوح کے قاعدے کے مطابق واؤ کو الف سے بدل دیا، بَابٌ ہوگیا(۱)، اور بَابٌ کے معنیٰ مدخل شئے کے ہیں، خواہ وہ شئے کچھ بھی ہو : دار، بیت، بلد وغیرہ، پس یہاں یہ بَابٌ مدخل ہے مجموعۂ مسائل کا، اب مجموعۂ مسائل کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں اور متعدد حیثیات میں غور کرتے ہیں تو ہم کو اس کی چند صورتیں نظر آتی ہیں: ایک یہ کہ مجموعہ مسائل من حیث الاجناس ہو، دوسرے یہ کہ من حیث الانواع ہو، تیسرے من حیث الفصول ہو۔

مختلف جنسوں کے بیان کے وقت عنوان کتاب کا اختیار کیا جاتا ہے، جیسے: کتاب الطہارۃ، کہ طہارت حقیقی بھی ہوتی ہے اور طہارت حکمی بھی ہوتی ہے(۲)، اسی طرح نجاست کی بھی دو قسم ہیں: حقیقی اور حکمی (۳) پھر نجاست حقیقی کی بھی دوقسمیں ہیں : نجاست غلیظہ نجاست خفیفہ، اور نجاست حکمیہ کی بھی دوقسمیں ہیں: حدث اصغر، حدث اکبر (۴)، اسی اعتبار سے طہارت کی بھی مختلف قسمیں ہیں، جیسے: طہارت بیر، طہارت لباس، طہارتِ بدن اور طہارتِ اِہاب، طہارتِ ارض وغیرہ، اور بھی بہت سی قسمیں طہارت کی نکلتی ہیں۔

اسی طرح کتاب الصلوٰۃ ہے کہ صلوٰۃ بھی بہت جنسوں اور قسموں کی ہے، صلوٰۃِ مکتوبہ، صلوٰۃِ خوف، صلوٰۃِ نافلہ، صلوٰۃِ کسوف، صلوٰۃِ جنازہ وغیرہ؛ اس لیے نماز

---

(۱) عمدة القاری ۱/۴۶ بیان اللغة.

(۲) اللباب فی شرح الكتاب ص ۷ ط :المكتبة المدينه ديو بند.

(۳) كتاب الفقه على المذاهب الأربعة ۱/۱۲، ط :دار القدس القاهره .

(۴) موسوعة الفقه الإسلامی ۱/۲۵۹، ط :دار الفكر بيروت .

کے بیان کے وقت بھی جو بہ جائے باب کے کتاب کا عنوان اختیار کیا جاتا ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ کے مسائل بھی مختلف الاجناس اور مختلف الانواع ہیں، مثلاً: زکوٰۃ بہائم، زکوٰۃ سوائم، زکوٰۃ اثمان، زکوٰۃ اموالِ تجارت، زکوٰۃ ارض عشر، نصف عُشر وغیرہ، لہٰذا یہاں زکوٰۃ کے سلسلہ میں بھی کتاب کا عنوان مناسب و موزوں ہوا، یہ تو ان مسائل میں گفتگو تھی جن کے اجناس مختلف ہیں۔

اب رہ گئے وہ مسائل جن کی اتنی مختلف حیثیات نہیں، ان کا اختلاف قسم اول کے اعتبار سے اخف ہے، اس لیے اس اختلاف کا اختلافِ اجناس کے بہ جائے اختلافِ انواع نام رکھنا انسب و الیق ہوا، لہٰذا اس کے تحت مختلف فصول رکھی گئیں ، بخلاف اول قسم کے کہ اس کے تحت مختلف انواع کے مسائل ہیں، اس لیے اس کے تحت مختلف انواع یعنی باب رکھے ہیں۔

جب اتنی بات خوب اچھی طرح ذہن میں آ گئی تو اب سمجھئے کہ چوں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا شروع میں مختلف اجناس کے مسائل جمع کرنا اور بیان کرنا مقصود نہیں اور انواع وغیرہ بھی اس کے تحت بیان کرنا منظور نہیں، بلکہ نوعِ واحد کے مسائل کا مجموعہ اس جگہ مقصود بالبیان ہے جو کہ وحی ہے؛ اس لیے باب کا عنوان اختیار کیا گیا(۱)۔

بابِ وحی سے ابتداء کرنے کی پہلی وجہ

جب لفظ ’’باب‘‘ کی تحقیق آپ اچھی طرح سمجھ چکے، تو اب سمجھئے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بابِ وحی سے ابتداء کرنے کا تفرد کیوں اختیار فرمایا؟ مثل دیگر مؤلفین کے کتاب الایمان یا کتاب الصلوٰۃ سے ابتداء کیوں نہ فرمائی ؟، اس سوال کے جواب سے پہلے آپ ایک تمہیدی مضمون سنئے ؛ تا کہ اس تفرد کی وجہ آپ بہ خوبی

(۱) عمدۃ القاری ۱/۴۶.

سمجھ سکیں۔

اور وہ تمہیدی مضمون یہ ہے کہ ایک فطری اصول ہے کہ جب کوئی آدمی کسی بادشاہ کی حکومت میں بود و باش اختیار کرتا ہے تو پہلے یہ معلوم کرلیتا ہے کہ اس بادشاہ کے اوصاف کیا ہیں، اس کا عدل وانصاف کیسا ہے، اس کے ملک کے قوانین کیا ہیں، وہاں کا نظم حکومت کس طرح ہے، حُکّام اور وزراء کیسے ہیں، چوں کہ اُسے اس ملک میں اس بادشاہ کی رعایا بن کر رہنا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ وہ اس کے اوصاف و کمالات، اس کی حکومت کے اہل منصب، اور اس کی مملکت کے قوانین وضوابط معلوم کرلے؛ تاکہ وہ کوئی خلاف قانون کام نہ کرے اور اس کے قانون کے مطابق اس کے ملک میں زندگی گذار کر راحت وآرام سے رہے، بادشاہ کا وفادار اور فرماں بردار رہے اور نافرمان نہ بنے۔

ٹھیک اسی طرح پر یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ اس تمام عالم کا خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہی اس تمام جہاں کو پیدا فرمایا، وہی اس کا مالک اور بادشاہ ہے، لہٰذا ہمیں اس کی مملکت میں رہنے کے لیے سب سے پہلے اس کے احکام وقوانین کا علم حاصل کرنا چاہئے؛ تاکہ ہم اس کی مرضیات ونامرضیات کو جان سکیں۔

چنانچہ اپنے احکام وقوانین کا معلم بھی خود وہی خالق ومالک، شہنشاہِ حقیقی ہے، اس نے سب سے پہلے بشر حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کو تعلیم دی جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرة: ۳۱]، جب حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام شاگرد کی حیثیت سے مخلوق میں چنے گئے تو آپ کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہوا کہ آپ اپنے استاد ومعلم ''ذاتِ باری'' کی ہستی کو پہچانیں اور اس کی معرفت حاصل کریں، اس لیے کہ معرفت ہی سے دو اجنبیوں میں عرفان ہوتا ہے، پھر جس درجہ کا عرفان ہوگا، اسی درجہ اپنے معرّف کی دل میں عزت

،عظمت اور محبت ہوگی اور جتنی معرفت میں کمی ہوگی، اتنی ہی عظمت ومحبت میں کمی واقع ہوگی، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کو تعلیم فرمائی تو وہاں ملائک بھی تھے، جنات بھی تھے مگر حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کو مقصود بالذات خطاب تھا، دوسروں کو مقصود بالذات خطاب نہ تھا۔

اسی طرح درس میں بھی شاگرد دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک لائق محنتی اور طالب، اور دوسری قسم صرف نام کے طالب علم، یہاں بھی اصل خطاب ان لائق شاگردوں ہی کو ہوتا ہے، گو خطاب کا عنوان عام ہوتا ہے جس میں سب شامل ہوتے ہیں مگر مقصود انھیں لائق طلبہ کو خطاب ہوتا ہے۔

تو حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام جن کو خطاب مقصود بالذات تھا اور انھوں نے خطاب باری کو سماعِ قبول سے سنا تھا ان کو کامل نفع ہوا، اور جب امتحان لیا گیا تو حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کامیاب ہوئے، چوں کہ آپ نے استاذ باری تعالیٰ عز اسمہٗ کی تقریر کو بہ غور، بہ طلبِ کامل، بہ توجہ تام، بہ سماع قبول سنا تھا، اس لیے ساری باتیں آپ کے ذہن نشیں ہوگئیں جس جس لغت کی تعلیم آپ نے حاصل فرمائی؛ ان کے جو حقائق ودقائق واشارات، اسرار وحکم ومعانی رکھے ہوئے تھے اور جو عملی کیفیتیں جو سوالات وجوابات ان میں پنہاں تھے حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کو محض ان الفاظ کی ہی تعلیم سے ان تمام حقائق ودقائق کا ادراک حاصل ہوگیا، نیز چوں کہ آپ کی قوت روحانی اور تمام حاضرین کی قوت روحانی سے بدرجہا اتم واکمل تھی، اور اصل روح ہی پر فیضانِ علم ہوتا ہے؛ اس لیے آپ نے سب سے زیادہ اکتساب فیضانِ علم کیا۔

اسی لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط﴾ [الحشر : ۲۱] کہ اگر ہم اپنے اس کلام کو کسی پہاڑ پر بھی نازل کرتے تو وہ مارے خشیت وہیبت کے چکنا چور

ہو جاتا، چوں کہ ایک تو جسم مادی عنصری ہے اور ایک روح ہے جو اس جسم مادی کے اندر سرایت کرتی ہے، پہاڑ گو اپنی مادیت میں بڑا اور مضبوط ہے مگر اس کے اندر قوت روحانی نہیں ہے اور فیضان علم وحی کے لیے قوت روحانی کا ہونا ضروری ہے، یہ عطیہ اللہ تعالیٰ نے اس انسان اشرف المخلوقات ہی کو نصیب فرمایا ہے کہ اس کو ایسی روحانی قوت عطا فرمائی کہ اس کا قلب وحی الٰہی کا تحمل کر سکے۔

الغرض! حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام نے ان الفاظ کو سنا اور چوں کہ آپ کی استعداد و قوتِ روحانی جملہ حاضرین متعلمین سے زیادہ تھی، اس لیے سب سے زیادہ آپ نے اکتساب فیض کیا اور امتحان میں کامیاب ہوئے، پھر حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام سے چل کر خاتم النبین محمد ﷺ کی ذات پاک تک اسی طرح یہ سلسلۂ تلمذی جاری رہا، اور آپ کو اخص الخاص شاگرد کا منصب عطا کیا گیا اور فرمایا گیا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ①﴾ [العلق: ۱]، ایسی تعلیم جامع کامل اور سہل مطابق فطرت بشری آپ کو دی گئی جواب تک کسی کو نہیں دی گئی تھی، آپ پر کتاب ایک ہی مرتبہ مجموعی طور پر نازل نہیں کی گئی بلکہ یہ سلسلہ تلمذ ۲۳ر سال تک چلتا رہا اور جب ۲۳ر سال میں یہ سلسلہ مکمل ہوا تو ان الفاظ میں سند تکمیل عنایت کی گئی: ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ○﴾ [المائدۃ: ۳]۔

پھر جو قانون کی کتاب قرآنِ پاک آپ پر نازل کی گئی، اس کی آپ نے اپنے قول وعمل سے تشریح فرمائی جس کو حدیث کہتے ہیں، تو کتنا بڑا احسان ہوا، اس شہنشاہِ حقیقی ذات باری تعالیٰ عز اسمہ کا کہ اس نے اپنے ملک میں رہنے والوں کو اپنے احکام وقوانین کی کتاب بھی بھیجی اور اس کے ساتھ اس کی عملی تفسیر بھی اپنے اخص الخاص مقرب بندے خاتم النبین محمد ﷺ کی عملی زندگی کے ساتھ کرادی، کیوں کہ عمل ہی اصل مقصود تھا اور اس لیے ضرورت تھی کہ پہلے بطور نمونہ اس قانون

کے مطابق کوئی مکمل نمونہ ہمارے سامنے آئے۔

چنانچہ آپ کو اپنے قانون کی عملی تفسیر بنا کر بھیجا، اسی کو فرمایا گیا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب: ۲۱]، قرآن پاک میں جو احکام تھے، ان پر عمل کر کے دکھایا، جو کلیات تھیں، ان کی اپنے اقوال سے شرح فرمادی اور اس طرح یہ علم حدیث جو آپ کے اقوال، افعال واحوال کا مجموعہ ہے، اللہ تعالیٰ کے کلام قرآن پاک کی تفسیر قرار پائی، اسی فن حدیث میں یہ کتاب بخاری شریف ہے جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "باب بدء الوحی" سے شروع فرمایا ہے۔

جب اس تقریر سے یہ بات آپ کے اچھی طرح ذہن نشین ہوگئی کہ بندہ اپنے تمام شعبہ ہائے زندگی میں خواہ وہ مادی ہوں یا روحانی، معاشی ہوں یا سیاسی، دنیوی ہوں یا اخروی، متعلق بالاعمال ہوں یا متعلق بالاقوال والاحوال، اس کا مکلف ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ خالق ومالک بادشاہ حقیقی کے اس ملک میں اس کی مرضی کے مطابق رہے اور مرضیات ونامرضیات کا معلوم ہونا موقوف ہے وحی پر؛ لہٰذا سب سے پہلے ضرورت وحی کی ہوئی، اگرچہ ایمان اجمالی کا جو درجہ ہے وہ بغیر وحی کے بھی حاصل ہوجاتا ہے؛ کہ اگر نبی نہ آتے، تب بھی صرف عقل ذاتِ باری تعالیٰ کی وحدانیت کو جان لیتی کہ ضرور ہمارا کوئی خالق ومالک ہے اس ذات واحد کے وجود کو پہچاننے اور ماننے کے لیے کسی نقلی دلیل کی ضرورت نہیں، اسی وجہ سے تمام انسان، واجب الوجود واحد کی ذات پر ایمان لانے کے عقلاً مکلف ہیں (۱)۔

مگر ایمان تفصیلی یعنی ذات واحد وحدہ لاشریک لہ کی ذات کو مفصلاً بصفات وافعال جاننے اور ماننے کے لیے البتہ نقل کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ علم قطعی حاصل ہو، اور ایسی نقل جس کے ذریعہ علم قطعی حاصل ہو، وہ وحی ہے، لہٰذا جب

(۱) اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسلم الثبوت ص ۱۶، کتاب المسامرہ، بشرح المسایرہ، ص ۸۰۔

مدار انسان کے ایمانِ تفصیلی کا اور حسب مرضی الٰہی تمام اعمال انسانی کا وحی قرار پائی تو ضروری ہوا کہ امام بخاریؒ وحی کے باب ہی کو ابتداء میں لائیں ، چنانچہ فرمایا :باب کیف کان بدء الوحی ، اس میں تنبیہ فرمادی کہ میں اپنی اس کتاب میں جو کچھ بیان کروں گا وہ ثابت بالوحی ہوگا ، اس لیے امام بخاریؒ نے باب وحی سے ابتداء فرمائی۔

بابِ وحی کو مقدم لانے کی دوسری وجہ

نیز بابِ وحی کے مقدم لانے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اسباب علم تین قسم پر ہیں، جن پر حصولِ علم کا مدار ہے :اول حواس خمسہ ظاہرہ، دوم عقل، سوم اخبار(۱)۔

اب ان تینوں قسم کے اسباب پر تفصیلی نظر ڈالئے ! سب سے پہلے حواس خمسہ ہیں تو غور کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی ایسے اسباب علم نہیں ہیں جن سے علم قطعی حاصل ہوجائے ، زیادہ سے زیادہ ان اسباب سے اکثر شک ، وہم یا ظن ، یا ظن غالب حاصل ہوتا ہے علم قطعی بہت کم حاصل ہوتا ہے ، چوں کہ حواس خمسہ ظاہرہ: قوت باصرہ،قوت شامہ،قوت ذائقہ،قوت سامعہ اورقوت لامسہ کے مجموعہ کا نام ہے،اب ان میں سے ہر ایک پر نظر ڈالئے !۔

پہلے قوت باصرہ ہے، اگر اس میں نقصان ہو، مثلاً آدمی احول ہوجائے تو ایک کے دو نظر آویں گے ، اور نقصان نہ بھی ہو،تب بھی دیکھ لیجئے ، ہمارا آپ کارات دن کا مشاہدہ ہے کہ ہم ایک ریل میں بیٹھے ہیں، دوسری ریل اس کے مقابلے میں دوسری پٹڑی پر چل رہی ہے اور ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہماری ریل چل رہی ہے اور وہ دوسری ریل کھڑی ہے تو دیکھئے ! ہماری قوت باصرہ نے ہمیں دھوکہ دیا کہ اس نے ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن دیکھا، اسی طرح دور سے

(۱) شرح العقائد النسفیة ص ۱۵ ط :دار الهدى الجزائر.

دیکھ کر ایک درخت کو ہم ہاتھی سمجھ رہے ہیں اور جب قریب جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت ہے، دور سے ایک شکاری ایک بچے کو جھکا ہوا دیکھ کر ہرن سمجھتا ہے، حالاں کہ وہ انسان ہے، تو یہ سب ہماری نظر ہی کا تو قصور ہے، جس کی وجہ سے ہم دھوکہ کھا رہے ہیں اور اشیاء کا علم واقع کے مطابق ہمیں حاصل نہیں ہو رہا، اس سے قوت باصرہ کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے اس کا حال آپ کو معلوم ہو گیا، جب حال یہ ہے تو کیسے کہا جاتا ہے کہ قوت باصرہ کے ذریعہ جو علم حاصل ہو وہ قطعی ہے۔

یہی حال قوت سامعہ کا ہے بسا اوقات ہمارے سننے میں غلطی ہوتی ہے اور ہم خلاف واقعہ سن کر دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں، نحو میر میں توابع کی بحث میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ تاکید اس لیے بھی کی جاتی ہے؛ تاکہ سامع کو اگر سننے میں غلطی ہو گئی ہو یا کمی رہ گئی ہو، تو وہ دور ہو جائے، اسی لیے بولا جاتا ہے: ''قام زید زید'' اس سے معلوم ہوا کہ قوت سامعہ سے بھی آدمی کو ہمیشہ ایسا علم قطعی حاصل نہیں ہوتا جس میں احتمال غلطی کا بالکل نہ ہو بلکہ بسا اوقات روزمرہ کے حالات میں ہمیں مشاہدہ ہوتا ہے کہ ہم متکلم کے کلام کو قوت سامعہ کی خطا کی وجہ سے غلط سمجھ جاتے ہیں: سعید بولا جاتا ہے اور رشید سمجھ لیا جاتا ہے، اس سے ثابت ہو گیا کہ قوت سامعہ کے ذریعہ بھی علم قطعی حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد قوت ذائقہ کو لیجئے! اس کا بھی کم وبیش وہی حال ہے جو دوسری قوتوں کا ہے، ذرا سی طبیعت خراب ہوئی اور قوت ذائقہ کا عمل بدلا، اسی لیے صفرا جس پر غالب ہے، اس کو میٹھی چیز بھی کڑوی لگ رہی ہے، بخار والا جس پر بلغم کا غلبہ ہے، اس کو نمکین چیز کھلائیے مگر اس کے باوجود اس کو محسوس نہیں ہوگا کہ یہ نمکین ہے تو معلوم ہوا کہ قوت ذائقہ سے بھی علم قطعی جس میں خلاف کا بالکل احتمال نہ ہو، حاصل نہیں ہو سکتا۔

اب قوت شامہ کو دیکھئے !اس میں بھی یہی حال ہے ایک چیز خوشبودار ہے مگر وہ قوت شامہ کی خرابی کی وجہ سے بدبودار ہوتی ہے تو اس کے ذریعہ جو علم حاصل ہوگا، وہ بھی قطعی نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح قوت لامسہ کا حال ہے کہ وہ بسااوقات سرد کو گرم اور گرم کو سرد محسوس کرتی ہے، اسی طرح چکنی چیز کو کھردری اور کھردری کو چکنی محسوس کرتی ہے، آج صبح حکیم صاحب آئے تھے میری نبض دیکھنے کے لیے مگر چوں کہ ان کے پوروے سرد ہورہے تھے ، اور پوروؤں کی سردی کی وجہ سے بدن کی حرارت وبرودت کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا ، لہٰذا انھوں نے میری نبض کچھ دیر تک نہیں دیکھی، اس سے قوت لامسہ کا حال بھی معلوم ہوگیا۔

جب آپ نے بالتفصیل حواس خمسہ ظاہرہ میں سے ہر ایک کا حال معلوم کرلیا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا سبب علم نہیں ہے جس سے قطعی علم حاصل ہو سکے تو اب اسبابِ علم میں سے دوسری قسم ”عقل“ کو لیجئے اور دیکھئے ! کیا اس سے علم قطعی حاصل ہوسکتا ہے؟ تو یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عقل محض سے بھی علم قطعی حاصل نہیں ہوسکتا، اسی وجہ بڑے بڑے حکماء وفلاسفہ جن کو اپنی عقل پر ناز تھا، انھوں نے ہمیشہ اسی عقل کے راستے سے غلطی کی اور جگہ جگہ دھوکا کھایا، کسی نے کہا عالم متغیر ہے، اور ہر متغیر حادث ہے؛ لہٰذا عالم حادث ہے اور کسی نے کہا کہ عالم کسی مؤثر سے مستغنی ہے اور ہر وہ شئے جو مؤثر سے مستغنی ہو وہ قدیم ہے؛ لہٰذا عالم قدیم ہے ، یہی حال آج کے سائنس دانوں کا ہے جس چیز کو آج بڑے زور شور سے ثابت کرتے ہیں، کل اس کا انکار کردیتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ عقل محض سے علم قطعی حاصل نہیں ہوتا، اگر ہمیشہ ایسا ہوا کرتا تو تمام عقلاء اپنی عقل کے ذریعہ ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ، کبھی ان میں اختلاف واقع نہ ہوتا، عقلاء کے درمیان یہ اختلاف خود عقل کی درماندگی و بے

چارگی کی دلیل ہے، عقل سے یہ امید تھی کہ اس سے علم قطعی حاصل ہوگا مگر تجربہ سے یہ بھی ناکام ثابت ہوگئی۔

اب اسبابِ علم میں سے تیسری قسم یعنی ''اخبار'' باقی رہ گئی، سو اس کی دو قسم ہیں : ایک اخبار الناس عن الناس، دوم اخبار الناس من جانب اللہ، سو اخبار کی پہلی قسم اخبار الناس عن الناس میں غلطی وخطا کا تو ہم رات دن مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، بعض مرتبہ راوی بھی ثقہ ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اس کی خبر غلط نکلتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی شئے کو اس نے جیسا اپنے علم میں جانا یا سمجھا یا سنا، وہ واقع کے مطابق نہیں تھی، لہٰذا گو وہ اپنے نزدیک جھوٹ نہیں بول رہا مگر اس کا بیان واقع کے مطابق نہیں ہے، چوں کہ اس کو ہی نفس الامر کا واقع کے مطابق علم نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اخبار کی یہ قسم یعنی اخبار الناس عن الناس بھی مفید علم قطعی نہیں ہے۔

اب دوسری قسم اخبار الناس من جانب اللہ باقی رہ گئی، اس کے اندر غور کیجئے تو غور کرنے سے ہم نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہمیں علم قطعی مطابق واقعہ نفس الامر حاصل ہوگا، اس میں غلطی وخطا کا شک وشبہ اور وہم گمان بھی نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ اس میں مخبر ذات باری تعالیٰ ہے اور رسول جبرئیل علیہ الصلوۃ والسلام ہیں اور مرسل الیہ ذات محمدی ﷺ ہے، اور یہ تینوں ذات اپنے اپنے اعتبار سے قطعیت کو لیے ہوئے ہیں، اس لیے کہ اللہ نام ہے اس ذات باری کا جو جمیع صفاتِ کمالیہ کی جامع اور جمیع صفات نقائص وعیوب سے پاک اور بالکل منزہ ہو، اس کی قدرت بھی کامل ہو کہ اس کی قدرت پر کسی کو اقتدار حاصل نہ ہو، اس کا تصرف بھی کامل ہو جس پر کسی کو تصرف حاصل نہ ہو، اس کا علم بھی محیط ہو کہ کوئی شئے اس کے علم سے باہر نہ ہو، اس کا نفاذ بھی کامل ہو کہ کوئی اس کے حکم کے نفاذ کو نہ روک سکے۔

تو جب ایسی ذات جامع جمیع کمالات کی جانب سے جس کا علم بھی کامل ہو، جس کی قدرت بھی کامل ہو، اور تمام قسم کے نقائص وعیوب سے اس کی ذات پاک ہو، جو چیز آئے گی، وہ بھی لازماً ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک ہوگی، اس کی ذات سے جس کا علم ذاتی ہے، جو علم چلے گا وہ قطعی اور یقینی ہوگا۔

اب وہ علم جس واسطے سے آیا ہے وہ فرشتہ جبرئیل امین ہے، جس کی شان میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿١٩﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿٢١﴾﴾ [التکویر] ایک جگہ فرشتوں کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ [التحریم: ٦] تو معلوم ہوگیا کہ یہاں بھی غلطی وخطا کا شائبہ نہیں ہے۔

اب رہ گیا مرسل الیہ یعنی ذاتِ پیغمبر، چوں کہ وہ بشر ہے، اس لیے یہاں غلطی کا احتمال ہوسکتا تھا مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی کسی قسم کی غلطی وخطا کا شائبہ نہیں ہے، چوں کہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی بادشاہ کسی کو اپنا خلیفہ یا قائم مقام بناتا ہے تو اس کے اندر تین اوصاف کو دیکھتا ہے: اول یہ خود اس کے اندر اس منصبِ خلافت کی پوری صلاحیت موجود ہو، دوم جس چیز میں اس کو خلیفہ بنایا گیا ہے، اس کی پوری فہم وبصیرت اس کو حاصل ہو، پورے مالۂ وما علیہ کے ساتھ اس کی حقیقت کی معرفت اس کو حاصل ہو، سوم وہ پورا وفادار ہو کہ اس مقرر کردہ قانون میں اپنی طرف سے وہ کسی قسم کا تغیر وتبدل نہ کرے، جو حکم دیا جائے من وعن بعینہٖ اسی طرح اسے دوسروں تک بلا کم وکاست پہنچا دے۔

جب یہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی کہ خلیفہ کے لیے صلاحیت فہم وبصیرت اور وفاداری کے اوصاف کا ہونا لازمی ہے، تو اب آپ سمجھئے کہ ایک بادشاہ اپنے نائب کا انتخاب کرتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس کا انتخاب غلط ہوجائے، چوں کہ بادشاہ بھی انسان ہے اس کا علم ناقص ہے، اس کا علم ذاتی اور تمام اشیاء کو محیط نہیں، اسی طرح

اس کی قدرت بھی ناقص ہے، غرض ہر جہت سے اس کی ذات نقائص کو لئے ہوئے ہے؛ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ بادشاہ جس کا انتخاب کرے اس میں اس سے غلطی ہوجائے ، اور بسا اوقات غلطی ہوتی ہے، جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے، مگر اللہ تعالیٰ جو علیم وخبیر ہے، جس کی قدرت بھی کامل ہے اور جس کا علم بھی کامل ہے، جس کی ذات تمام قسم کے عیوب سے پاک اور منزہ ہے، وہ جس کو اپنا خلیفۃ بنائے گا، ضرور اس میں تینوں وصف بدرجہ اتم موجود ہوں گے، اس لیے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنایا ہے، اس سے غلطی یا خطا یا کذب کا ہونا عقلاً قطعاً محال ہے، لہٰذا اب وہ رسول، اللہ تعالیٰ کی جانب سے آیا ہوا جو پیغام بھی بندوں کو پہنچائے گا، وہ قطعی الثبوت ہوگا، جس میں کسی کی جانب سے بھی غلطی وخطا کا شائبہ ووہم نہیں ہوسکتا اور اسی اخبار کا نام وحی ہے۔

پس اس تقریر سے علم کی تمام دوسری اقسام کا علم قطعی کے لیے غیر مفید ہونا اور اخبار کی قسم ثانی اخبار الناس من جانب اللہ یعنی وحی کا قطعی ہونا ثابت ہوگیا، اور ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اس کے ملک میں رہتے ہیں، لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی مرضیات ونامرضیات کو معلوم کریں، اور جس ذریعہ سے ہمیں وہ علم حاصل ہو، وہ قطعی ہو، اس میں کسی قسم کی غلطی وخطا کا احتمال نہ ہو، پس وہ ایسا ذریعہ جس سے قطعی طور اللہ تعالیٰ کی مرضیات ونامرضیات کا علم حاصل ہو، وہ وحی ہے، لہٰذا امام بخاریؒ نے وحی کے باب ہی کو تمامی ابواب پر مقدم فرمایا۔

اس کے بعد یہ بحث ہے کہ بخاری شریف کے تراجم ابتدائی ہیں یا الحاقی ہیں، سو اس کا جواب یہ ہے امام بخاری (۱) رحمۃ اللہ علیہ کے تراجم ابواب ابتدائی نہیں ہیں بلکہ الحاقی ہیں ۔جمع احادیث کے بعد ابواب قائم فرمائے ہیں ، اس لیے یہ ابواب الحاقی ہیں، ہر باب کو مکہ معظّمہ میں طواف کے بعد تحریر فرمایا ہے ا، امام

(۱) هدى السارى ص/٦٥٦ .

بخاریؒ نے ترجمۃ الباب کے انعقاد میں نہایت تدبر اور غایت خوض سے کام لیا ہے، استنباط مسائل کا عجیب طرز اختیار فرمایا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے : فقہ البخاری فی تراجمہ(۱)۔

اس کے بعد یہ بحث ہے کہ باب بالسکون ہے یا بالحرکۃ ہے اور اگر بالحرکت ہے تو بالتنوین ہے یا بلاتنوین ہے، سو اس میں یہ تمام صورتیں ہوسکتی ہیں، اس کو بالسکون بھی پڑھ سکتے ہیں، اس وقت باب مبنی بالسکون ہوگا مثل حروف کے اور اگر بالحرکت پڑھیں تو بلاتنوین بھی پڑھ سکتے ہیں، جب کہ مبتدا محذوف کی خبر ہو، یا یہ باب مبتدا محذوف الخبر ہو، اور اس کو بلاتنوین بھی پڑھ سکتے ہیں، جب کہ اس کو مضاف پڑھا جائے اور اس کا بعد اس کا مضاف الیہ ہو(۲)۔

لفظ ''کیف'' کے معنیٰ وتحقیق

اس کے بعد یہ بحث ہے کہ کیف کے کتنے معنیٰ آتے ہیں، اور یہاں کون سے معنیٰ مراد ہیں، سو کیف کے ایک تو معنیٰ حقیقی ہیں اور ایک مجازی، اس کے حقیقی معنیٰ حالت کے ہیں اور مجازی معنیٰ أَنّٰی کے ہیں، جیسے :أَنّٰی بھی مجازاً کیف کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ مجازی معنیٰ کی طرف

---

(۱) فتح الباری، ج۱ ص۱۳، الفصل الثاني في بيان موضوعه والكشف عن مغزاه فيه وتسمية المؤلف لكتابه الجامع الصحيح المسند.

(۲) ارشادالساری للقسطلانی، ۱/۴۷-۴۸، ط :مطبعة الكبرىٰ الأميرية مصر، الكرمانی ص ۱۳ ج ۱. علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:قوله باب بالرفع خبر مبتدأ محذوف أي هذا باب ويجوز فيه التنوين بالقطع عما بعده وتركه للإضافة إلى ما بعده وقال بعض الشراح يجوز فيه باب بصورة الوقف على سبيل التعداد فلا إعراب له حينئذ وخدشه بعضهم ولم يبين وجهه غير أنه قال ولم تجيء به الرواية قلت لا محل للخدش فيه لأن مثل هذا استعمل كثيرا في أثناء الكتب إلخ (عمدة القاری : ۱/۱

اسی وقت رجوع کیا جاتا ہے جب کسی وجہ سے حقیقی معنی مراد لینے میں کسی قسم کی قباحت یا محذور لازم آتا ہے، جیسے قرآن پاک میں ہے :فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ ﴾ [البقرة:۲۲۳] کہ یہاں اگر اَنّٰی کی حقیقی معنیٰ مراد لئے جائیں تو معنی یہ ہوں گے کہ عورتوں کے پاس جہاں سے، جس مقام سے، جس جگہ سے چاہے آؤ، تو تعمیم مکان مراد ہو کر وطی فی الدبر کی اجازت حاصل ہوگی جو صحیح نہیں، اس لیے کہ شروع آیت میں عورتوں کو کھیتی قرار دیا، اور کھیتی پیداوار کو مستلزم ہے جو وطی فی الدبر میں متحقق نہیں، اس لیے کہ اولاد دبر سے حاصل نہیں ہوتی، قبل سے حاصل ہوتی ہے، علاوہ ازیں أَنّٰی کو حقیقی یعنی مکان پر رکھیں تو عورت کے جسم میں اور بھی راستے ہیں، ایک منھ، دوناک کے سوراخ، دوکان کے سوراخ اور ایک بول کا راستہ، ایک براز کا، یہ کل سات سوراخ ہیں، تو کیا سب راستوں کو استعمال کرنے کی اجازت ہوگی، ظاہر ہے کہ اس قدر تعمیم ہرگز نہیں تو اس طرح سیاق وسباق دُبر کے مراد ہونے کو بھی منافی ہے(۱)۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، گفتگو یہ تھی کہ کیف کے یہاں حقیقی معنیٰ مراد ہیں حالت کے یا مجازی معنی جگہ اور مکان کے مراد ہیں، سو حضرات اساتذہ سے یہی سنا

(۱) (كَأَنَّى) أَيْ مِثَالِ الْمُشْكِلِ لَفْظُ أَنَّى (فِي أَنَّى شِئْتُمْ) بَعْدَ قَوْله تَعَالَى {فَأْتُوا حَرْثَكُمْ} [البقرة :۲۲۳] فَإِنَّهُ مُشْتَرَك بَيْنَ مَعْنَيَيْنِ (لِاسْتِعْمَالِهِ كَأَيْنَ) كَمَا فِي قَوْله تَعَالَى {أَنَّى لَكِ هَذَا} [آل عمران :۳۷] (وَكَيْف) كَمَا فِي قَوْله تَعَالَى {أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللهُ بَعْدَ مَوْتِهَا} [البقرة :۲۵۹]

فَاشْتَبَهَ الْمَعْنَى الْمُرَادُ فِي الْآيَةِ عَلَى السَّامِعِ وَاسْتَمَرَّ ذَلِك (إلَى أَنْ تُؤُمِّلَ) بَعْدَ الطَّلَبِ لَهُمَا وَالْوُقُوفِ عَلَيْهِمَا فِي مَوْقِعِهَا هَذَا (فَظَهَرَ الثَّانِي) وَهُوَ كَيْف دُونَ أَيْنَ (بِقَرِينَةِ الْحَرْثِ، وَتَحْرِيمِ الْأَذَى) أَيْ وَدَلَالَةِ تَحْرِيمِ الْقُرْبَانِ فِي الْأَذَى الْعَارِضِ وَهُوَ الْحَيْضُ فَإِنَّهُ فِي الْأَذَى اللَّازِمِ أَوْلَى فَيَقْتَضِي التَّخْيِيرَ فِي الْأَوْصَافِ أَيْ سَوَاءٌ كَانَتْ قَائِمَةً أَوْ نَائِمَةً أَوْ مُقْبِلَةً أَوْ مُدْبِرَةً بَعْدَ أَنْ يَكُونَ الْمَأْتِيُّ وَاحِدًا وَقَدْ ظَهَرَ مِنْ هَذَا الْفَرْقُ بَيْنَ الطَّلَبِ وَالتَّأَمُّلِ. (التقرير والتحبير، لابن أمير حاج، ج ۱ ص ۱۵۹)

ہے کہ کیف یہاں اپنے حقیقی معنی میں مستعمل ہے، اگر چہ مجازی معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ بعض احادیث مذکورۃ الذیل میں نزول وحی کا غار حرا میں ہونا بھی مذکور ہے، پس کیف کو اَنّٰی کے معنی میں لینا صحیح ہو جائے گا جو کہ اس کے مجازی معنی ہیں، پھر یہ کیف مبنی علی الفتح ہے، ہر حال میں اس پر فتح ہوگا اور معنی حقیقی ہوں یا مجازی استفہام کے لیے ہوتا ہے۔

تو گویا امام بخاریؒ نے پہلے سوال قائم فرمادیا کہ وحی کی ابتداء کس طرح ہوئی؟ اور آیات اور احادیث ذیل سے اس کا جواب فرمایا، دوسری صورت یہ ہے کہ سوال مقدر ہے یعنی ایُ باب ھذا؟ اس کا جواب ترجمہ باب سے ارشاد فرمایا کہ یہ باب بدأت وحی کی کیفیت اور حالت کا ہے، الحاصل گو حقیقی ومجازی دونوں معنی مراد لیے جاسکتے ہیں مگر یہاں حقیقی معنی مراد لینا زیادہ اصلح ہیں، کیف کی بحث کے بعد اب کان کی بحث ہے کہ کان تامہ بھی ہوتا ہے، ناقصہ بھی ہوتا ہے اور زائدہ بھی، یہاں کون سی قسم ہے؟، سو یہاں کان تینوں قسم کا ہوسکتا ہے، کان ناقصہ ہونے کی صورت میں کیف خبر مقدم ہوگی کان کی، اور کان کا ما بعد بدء الوحی، کان کا اسم ہوگا، اور اگر کان تامہ ہے تو وَجَدَ یا حَصَلَ کے معنیٰ میں ہوگا ، اور اس کا فاعل بدؤ الوحی الخ ہوگا، اور کیف اس کا حال ہوگا اور کان زائدہ ہونے کی صورت میں صرف تحسین عبارت کے لیے ہوگا(۱)۔

---

(۱) کَانَ کی علماء نے پانچ قسمیں بیان کی ہیں :أمّا کان فتنقسم علی خمسة أَوجه:الوجه الأوّل :أنها تكون ناقصة فتدل على الزمان المجرد عن الحدث...والوجه الثاني :أنها تكون تامة، فتدل على الزمان والحدث كغيرها من الأفعال الحقيقية، ولا تفتقر إلى خبر...والوجه الثالث :أن يجعل فيها ضمير الشأن والحديث، فتكون الجملة خبرها...والوجه الرابع :أن تكون زائدة (غير عاملة)...والوجه الخامس:أن تكون بمعنى صار...(أسرار العربية،لأبى البركات، كمال الدين الأنباري،ص ۱۱۳،ط:دار الأرقم بن أبي الأرقم.)

لفظ بدء الوحی کی تحقیق

ایک بحث یہ ہے کہ بدء مہموز ہے یا ناقص ہے یا دونوں طرح درست ہے؟ سو یہاں بدء کی عبارت دونوں طرح صحیح ہے، دونوں نسخے ہیں، ایک ناقص واوی بدوٌّ، دوسرا مہموز اللام بدء جس کے معنی ابتداء کے ہیں اور ناقص واوی کے معنی ظہور کے ہیں (۱) مہموز ہونے کی صورت میں مطلب ترجمہ باب کا یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف وحی کی ابتداء کس طرح ہوئی؟ اور ناقص ہونے کی صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف وحی کا ظہور کس طرح ہوا؟۔

مگر ترجیح مہموز کے نسخے کو ہے اور وجہ ترجیح اس کی اشہریت ہے کہ مابین العلماء مہموز ہی مشہور تر ہے، لیکن اس پر اشکال ہوگا اور وہ یہ کہ جب مابین المحدثین بدء بالہمزہ ہی مشہور ہے تو اسی اشہریت کے باعث یہ راجح ہوا، گویا یہی متعین او ردوسرا احتمال قابل ترک ہوا تو اب باب ابتدائے وحی کی کیفیت کے بیان کرنے کے لیے ہوگا اور اس میں ابتدائے وحی کی کیفیت احادیث سے بیان کریں گے تو پھر ترجمۂ باب پر احادیث منطبق نہ ہوں گی، حالاں کہ ترجمۃ الباب دعویٰ کے مطابق ہونا ضروری ہے اور یہاں دعویٰ کو احادیث ثابت نہیں کرتی ہیں، چوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس باب کے تحت چھے احادیث مذکور ہیں، جن میں سوائے ایک حدیث کے اور کسی حدیث میں ابتدائے وحی کا ذکر نہیں، برخلاف ناقص واوی

---

(۱) والبدء بفتح الموحدة وسكون المهملة آخره همزة من بدأت الشيء بدأ ابتدأت به. قال القاضي عياض روي بالهمز مع سكون الدال من الابتداء وبدوّ بغير همزة مع ضم الدال وتشديد الواو من الظهور، ولم يعرف الأخيرة الحافظ ابن حجر. (إرشاد الساري:۱۴۸)

کے نسخے کے جس کے معنیٰ ظہور ہیں، اس پر سب حدیثیں منطبق ہیں، اس لیے کہ تمام احادیث میں وحی کا ظہور اور اس کا ذکر ہے پھر مہموز کی اشہریت سے کیا حاصل؟ جب کہ مابعد کی احادیث کا اس پر انطباق نہ ہوا، اور بدؤ ناقص والی صورت کا ترک کیوں کر درست ہوگا؟ اس اشکال کے متعدد جوابات ہیں، لیکن اب وقت مساعد نہیں، لہٰذا اس کو ان شاء اللہ تعالیٰ کل عرض کیا جاوے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

الدرس الثالث

ماتحت الباب احادیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت کی وجوہ (۱)

لفظ بدء الوحی کے مضاف سے متعلق کل یہ کلام تھا کہ ’’بدء‘‘ بالہمزہ کو ترجیح ہے جس کے معنیٰ ابتدا کرنا ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ باب وحی کی ابتدا کی کیفیت کا ہے یعنی اس باب میں جو مضامین مذکور ہوں گے، وہ وحی کی ابتدا سے متعلق ہوں گے، اس پر یہ اشکال ہے کہ اس وقت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ترجمہ ماتحت الباب احادیث کے موافق ومناسب نہ ہوگا، چوں کہ باب کے اندر سوائے ایک حدیث کے اور کسی حدیث میں ابتدائے وحی کا ذکر نہیں، اس اشکال کو اٹھانے اور احادیث باب کو ترجمہ کے ساتھ مطابق کرنے میں مختلف وجوہ بیان کی ہیں، جو اس اشکال کے جوابات ہیں:

(۱) بخاری شریف کے من جملہ شراح دو شارح زیادہ مشہور ہیں، جن میں ایک شافعی اور دوسرے حنفی ہیں، ایک کا نام حافظ بدر الدین عینیؒ ہے (۲)، یہ حنفی

---

(۱) **انتباہ**: اس جگہ فرمایا گیا کہ ہر شے کے تین اعتبار ہوتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ تین درجے ہوتے ہیں، بشرط شئ، بشرط لاشئ، لابشرط شئ، یہاں وحی لابشرط شی کے مرتبہ میں ملحوظ ہے، جس کو مطلق الشئ کہتے ہیں، پس یہاں مطلق الوحی ملحوظ ہے، وحی بشرط الابتداء ملحوظ نہیں، یہاں سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ دورہ حدیث شریف سے قبل کی کتابیں مستحکم ہونا ضروری ہیں اور خصوصاً علم منطق پڑھنا ضروری ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ فرصت نصیب فرمائیں، اسے تو چاہئے کہ ابتداء سے لے انتہاء تک منطق کی ساری کتابیں پڑھے، اس فن سے استعداد بڑھتی ہے اور طریق کلام اور ترتیب حاصل ہوتی ہے۔ (نصیر احمد غفرلہ)

(۲) حافظ بدر الدین عینیؒ: اسمِ گرامی: محمود، کنیت: ابو محمد، لقب: بدر الدین، عرفی نام: شارحِ بخاری، بدر الدین عینی، علامہ عینی، ۱۷ یا ۲۶ / رمضان ۷۶۲ھ، مطابق ۳۰: جولائی ۱۳۶۱ء کو قلعہ ’’عین تاب‘‘ حلب، شام میں آپ کی ولادت ہوئی، علامہ عینیؒ امام فاضل، محدث کامل، فقیہ بے عدیل، علامۂ بے تمثیل، عارف عربیت وتصریف، حافظِ لغت، سریع الکتابت، تخریج احادیث

←

ہیں، دوسرے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ہیں جو شافعی ہیں (۱)۔

یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کا اس باب سے مقصود مطلق وحی کا بیان کرنا ہے اور وحی کا ذکر تمام احادیث میں موجود ہے، لہٰذا ترجمہ کے ساتھ پوری مطابقت موجود ہے (۲)

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ پھر بدء کا لفظ زائد ہوگا، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جب کہ امام بخاریؒ کو اختصار پسند ہے پھر انھوں نے طول لاحاصل کیوں اختیار فرمایا؟ جب کہ ابتداء کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے؟، پہلا جواب یہ ہے کہ امام بخاریؒ کی شانِ استنباط کا یہی تقاضا تھا، چوں کہ امام بخاریؒ روایت کے ساتھ درایت کو بھی بہت اونچا کرنا چاہتے ہیں؛ تاکہ متعلمین وطالبین حدیث کے اندر بذریعۂ تدبر وتفکر فطانت وذکاوت پیدا ہو، چنانچہ یہاں لفظ ''بدء'' کا اضافہ فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ دعویٰ کے لیے اگر ایک دلیل بھی قائم کردی جائے تو ثبوت دعویٰ کے لیے کافی ہوتی ہے، اور باقی دلیلیں اس ایک دلیل کی توضیح وتائید

← اوران کے کشف معانی میں وسعت کامل رکھتے تھے،آپ کا وصال ۴/ذی الحجہ ۸۵۵ھ، مطابق ۲۸/دسمبر ۱۴۵۱ء کو قاہرہ میں ہوا، اپنی مسجد اور مدرسے کے صحن میں مدفون ہوئے۔ (حدائق الحنفیۃ، مقدمۃ عمدۃ القاری، مطبوعہ بیروت) موصوف کی تصنیفات میں عمدۃ القاری شرحِ بخاری، البنایہ شرحِ ہدایہ شرحِ ابی داود وغیرہ مشہور ہیں۔

(۱) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ: امام المحدثین احمد بن علی بن محمد عسقلانی، مصری، شافعی، ۲۲/شعبان ۷۷۳ھ کو مصر میں پیدا ہوئے، حافظ علیہ الرحمہ کو مختلف علوم وفنون میں کمال حاصل تھا، علم حدیث آپ کا خاص فن تھا، اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی مبارک مشغلے کی نذر کیا، قاہرہ کے بڑے بڑے مدارس میں مدت تک تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی، حافظ صاحبؒ نے حدیث، رجال، اور تاریخ وغیرہ پر قلم اٹھایا، فتح الباری آپ کی مایۂ نازتصنیف ہے، ۲۸/ذی الحجہ ۸۵۲ھ شب شنبہ بعد نمازِ عشاء اس دارفانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی، ہفتہ کے دن ظہر سے پہلے نماز جنازہ ادا کی گئی، جامع دیلمی کے بالمقابل قبرستان میں تدفین ہوئی۔ (الجواھر والدرر فی ترجمۃ ابن حجر، فوائد جامعہ ص ۴۳۷)

(۲) فتح الباری، ج ۱ ص ۱۱، عمدۃ القاری، ج ۱ ص ۴۶.

ہی میں پیش ہوں تو یہ بھی متعدد دلیلوں کے قائم مقام ہوجاتا ہے تو اس طرح احادیث مبحوث عنہا ضمناً والتزاماً دعوی پر دلائل ہوں گی۔

چوں کہ دلالت کی تین قسمیں ہیں: (۱) مطابقی (۲) تضمنی (۳) التزامی (۱)۔

بہر حال ''وحی'' پر بالقصد دلائل قائم فرمائے، اور بدء پر ضمناً وتبعاً تو ثابت ہوگیا کہ وحی کا بیان مقصود ہونے سے لفظ ''بدء'' کا بے فائدہ اور زائد ہونا لازم نہیں آتا، ایک بالذات مقصود ہے اور ایک بالتبع مقصود ہے۔

(۲) دوسرا جواب علامہ سندھی (۲) کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بدءٔ کی اضافت، الوحی کی طرف اضافت بیانیہ ہے، لہٰذا ''الوحی'' بیان ہوا، بدء مضاف کا بیان ابہام کو رفع کرنے کے لیے آتا ہے، جیسے بدل مبدل منہ کا بیان ہوتا ہے، کہا جاتا ہے :جاءَ نِیْ زَیْدٌ اَخُوْكَ، پس ''بدء'' سے مراد وحی ہی ہے۔ چوں کہ وحی امر دین اور مدار نبوت ورسالت ہے، اس طرح جملہ احادیثِ باب ترجمۃ الباب کے مطابق ہوں گی، چوں کہ احادیث ستہ جو تحت الباب ہیں، سب میں امورِ دینیہ کو بیان فرمایا گیا ہے۔ بہر حال وحی سے مراد امور دینیہ ہیں تو وحی کی ابتداء سے مراد امور دینیہ کی ابتداء ہے جو کہ آیت اور احادیث باب میں

(۱) مرقات، ص ۹۔

(۲) نام محمد ابوالحسن کنیت، نورالدین لقب، المعروف علامہ سندھی، محمد بن عبدالہادی سندھی ٹھٹھوی ثم مدنی حنفی۔ سندھ کے مردم خیز علاقہ ٹھٹھ میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم وتربیت ہوئی، تکمیل علوم کے بعد ٹھٹھ میں تدریس کا مشغلہ اختیار کیا پھر حجاز مقدس کا سفر کیا، وہاں شیوخ سے استفادہ کیا، دوسال تک حرم مکہ میں مجاورت اور قیام کے بعد مدینہ منورہ میں اقامت گزیں ہوئے، حرم نبوی میں تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دینا شروع کیا، علوم عالیہ وآلیہ پر کامل دستگاہ رکھتے تھے، علمی دنیا میں صحاح ستہ، مسند امام احمد، فتح القدیر (تاباب النکاح) بیضاوی، الزہراوین للقاری، شرح جمع الجوامع لابن قاسم پر گراں قدر حواشی آپ کی یادگار ہیں۔ ۱۲ر شوال ۱۱۳۸ھ کو مدینہ منورہ میں انتقال فرما کر بقیع میں مدفون ہوئے۔ (فوائد جامعہ ص ۲۱۶ مطبوعہ ۱۹۶۴ء)

بیان کی گئی ہے (۱)۔

علامہ عابد حسن سندھیؒ (۲) جو مسند امام شافعیؒ کے شارح ہیں، وہ بھی علامہ ابوالحسن صاحبؒ کے مذکورہ جواب کی تائید فرماتے ہیں اور اسی کو پسند فرماتے ہیں۔

(۳) تیسرا جواب حضرت شیخ نورالحق محدث دہلوی (۳) تیسیر القاری شرح بخاری میں فرماتے ہیں کہ یہاں وحی سے نبوت ورسالت مراد ہے، کیوں کہ وحی کے لیے محل وحی ہونا ضروری ہے، ہر کس وناکس وحی کا محل نہیں ہوسکتا، محل وحی معصوم ومحفوظ انسان ہی ہوسکتا ہے جو کہ وصف رسالت سے موصوف ہوتا ہے، وحی غیر رسول پر نہیں آتی، جب یہ بات ہے تو وحی کے بیان سے پہلے رسالت ونبوت کا بیان ضروری ہے کہ اگر رسالت رسول نہ ہوتو نبوت ہی نہ ہو، اس لیے یہاں نبوت ورسالت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کی ابتداء کس طرح ہوئی، رویائے صالحہ سے

(۱) حاشیۃ السندی علی البخاری، ج ۱ ص ۴، ط: دار الفکر، بیروت.

(۲) شیخ محمد عابد بن شیخ احمد علی بن شیخ الاسلام محمد مراد انصاری، سیوہن شریف، ضلع: داور، سندھ میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم وتربیت ہوئی، پھر یمن کے علمی مرکز زبیدہ کے علماء اور مشائخ سے استفادہ کیا، اس کے علاوہ مدینہ منورہ حاضر ہوکر علمی وروحانی استفادہ کیا، تدریس کا آغاز زبیدہ (یمن) سے کیا، پھر مدینہ منورہ میں درس وتدریس، تحریر وتصنیف، عبادت وریاضت میں مشغول ہوگئے۔ طوالع الانوار شرح الدر المختار، المواہب اللطیفہ شرح مسند الامام ابوحنیفہ، مسند امام شافعی، ترتیب مسند ابوحنیفہ، ترتیب مسند امام شافعی وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں، ۱۸ یا ۱۹/ ربیع الاول ۱۲۵۸ھ کو گنبد خضرا کے زیر سایہ وصال ہوا، جنت البقیع میں حضرت عثمانؓ کے مقبرے کے دروازے سے متصل مدفون ہوئے۔

(۳) یہ شیخ عبدالحق محدثِ دہلویؒ کے صاحب زادے ہیں اور شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کو نبیٔ کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ ہندوستان جا کر درسِ حدیث کا سلسہ شروع کریں، یہ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے پہلے ہوئے ہیں، ان کو بیداری میں نبیٔ اکرم ﷺ کی زیارت ہوتی تھی، صاحب حضوری ہوئے ہیں۔

یاملائکہ کے ذریعہ، الفاظاًیاغیرالفاظاًملوک وسلاطین کی تصدیق کے ذریعہ (۱)۔

پس اس طریق سے تمام احادیث ترجمۂ باب پر بلاتکلف منطبق ہیں، چوں کہ کوئی حدیث نبوت ورسالت کے بیان سے خالی نہیں۔

(۴) چوتھا جواب حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ہے، ان کی توجیہ اس مقام پر عجیب ہی ہے جس کا بیان یہ ہے کہ "بدء" سے مراد مبدأ ہے، پس یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مبدء الوحی کو بیان فرماتے ہیں کہ وحی ونبوت ورسالت کا مبدأ وہ ذات والاصفات اللہ تعالیٰ ہے (۲)۔سبحان اللہ امام بخاریؒ اپنی کتاب کی ابتداء اس ذاتِ منبع البرکات کے ذکر سے فرمارہے ہیں جو وحی ورسالت ونبوت کا مبدأ ہے۔

گویاامام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو وحی آئی، وہ کسی بشریا کسی جن شاعر یا ساحروکاہن کی طرف سے نہیں آئی، جیسا کہ اہل مکہ ودیگر کفارمشرکین کہتے تھے، بلکہ مبدأ وحی اور فرشتے کے واسطے سے ہے یعنی حضرت جبرئیل علیہ الصلوۃ والسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے کرآتے ہیں، کیا ہی عجیب انداز بیان اختیارفرمایا کہ تمام شکوک وشبہاتِ اہل باطل کا جواب ہوگیا۔

بہرحال! مبدأالوحی کا ذکر اور بیان ہے جو تمام احادیث باب میں پھیلا ہوا ہے، پس عدم انطباق کا خلجان ختم ہوگیا۔

(۵) پانچواں جواب حضرت شیخ الاسلام نبیرۂ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۳) فرماتے ہیں کہ بدء سے مراد نزول ہے، مطلب یہ ہے کہ نزول وحی کی کیفیت کیا ہوئی ؟ کس طرح اور کن حالات میں نزول وحی ہوا؟ نزول وحی کے وقت کیا

---

(۱) تیسر القاری ۱/ ٦ .

(۲) رساله شرح تراجم ابواب الشاه ولی الله محدث الدهلوی ص ۱ ، ملحق به صحيح بخاری جلد اول.

(۳) شیخ عبدالحقؒ کے ان نبیرہ کا نام مولانا سلام اللہ ہے، جن کی تصنیفات میں "محلّی" اور "کمالین" ہیں۔(تذکرہ شاہ ولی اللہ، ص ۷۲)

حالات پیش آئے ؟ موافقین نے کیا معاملہ کیا او رمخالفین کس طرح پیش آئے ، یہی چیزیں احادیث باب میں مذکور ہیں ، بس ترجمہ باب پر تمام احادیث کا انطباق ظاہر ہے (۱) ۔

(۶) چھٹا جواب: حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن) (۲) (۳) رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور عجیب ارشاد فرماتے ہیں کہ بناء اعتراض دلالت مطابقی پر نظر کو مقصود کرلینا ہے، حالاں کہ یہ امام بخاریؒ کے مذاق کے موافق نہیں ہے، اس لیے کہ امام بخاریؒ نہایت ذہانت سے کام لیتے ہیں اور تشحیذ اذہان ان کا شیوہ بھی ہے اور جو جس درجہ عقل وفہم ، علم ودرک میں بڑھا ہوا ہوتا ہے اسی قدر اس کا کلام اجمع واشمل ہوتا ہے اور دلالات التزامیہ وتضمنیہ سے اکثر امور کو بیان کر دیتا ہے ۔

پس امام بخاریؒ گویا ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے عنوانِ باب کو مدلول مطابقی

(۱) شرح بخاری از شیخ الاسلام علی هامش تیسیر القاری ۱/ ۲۳ .

(۲) آپ کے درس کی ایک عجیب شان تھی جس کو دیکھ کر علامہ انور شاہ کشمیری صاحبؒ گرویدہ ہوکر آپ کے حلقہ درس میں شامل ہوتے، آپ سفر فرما کر حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ سے استفادہ کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے تھے مگر ان کا انتقال ہو چکا تھا بہت حسرت ہوئی ، اتفاق سے دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہند کے درس میں شریک ہوئے حسرت امید سے بدل گئی ، یقین کرلیا کہ مراد مل گئی ، حضرت شیخ الہندؒ کے درس میں معانی وحقائق کی گوہر فشانی سے بے حد محظوظ ہوئے اور بالآخر انھیں کے ہو رہے ۔

(۳) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ : آپ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالبِ علم ہیں اور ہزاروں علماء کے استاذ اور مربی بھی ہیں ، جنگِ آزادئ ہند کے رہنما اور تحریکِ ریشمی رومال کے بانی ہیں ، ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے ، آپ کے تلامذہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ ، مجددِ ملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطینِ علم کا شمار ہوتا ہے ، ۱۸/ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰/ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں وفات پائی اور مزارِ قاسمی دیوبند میں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے برابر میں مدفون ہیں ، رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ ۔

میں منحصر نہ کرنا، بلکہ مدلول تضمنی والتزامی تک کے عموم وشمول کو ملحوظ رکھنا؛ تا کہ ترجمہ باب کے تحت الباب پر منطبق کرنے میں الجھنیں اور مشکلیں پیش نہ آئیں، بلکہ میں اکثر التزامی اور کنائی طور پر ہی اپنی اس کتاب میں ملحوظ رکھتا ہوں۔

لہٰذا یہاں ترجمہ باب کا مدلول التزامی جو کہ عظمت وعصمت وحفاظت وحی واطاعت وحی ہے، وہ مراد ہے، چنانچہ عظمت وحی کا ہی یہ اثر تھا کہ آپ سخت سردی میں پسینہ پسینہ ہوجاتے، اور عظمت وہیبت وحی سے اونٹنی بھی بوقت نزول وحی چل نہ سکتی، بیٹھ جاتی اور زمین پر گردن ڈال دیتی تھی، حفاظت وحی کا یہ عالم کہ حضرت جبرئیل نہایت باعظمت وشدید القویٰ تھے۔ جو چیز ایسی عظمتوں اور حفاظتوں کے ساتھ بھیجی جائے تو لامحالہ اس کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے گردن اطاعت جھکادی جائے اور اپنے اعضاء وجوارح سے حقوق عظمت ادا کئے جائیں، یہی تینوں چیزیں عظمت وحی، عصمت وحفاظت وحی واطاعت وحی احادیث ستہ میں مختلف طرق سے مذکور ہیں؛ لہٰذا ترجمہ باب کا احادیث باب پر انطباق ظاہر ہے۔

ان جوابات سے وہ اعتراض جو لفظ بدء مہموز اللام کے زائد ہونے کا کیا گیا تھا، وہ رفع ہوگیا اور ثابت ہوگیا کہ عند العلماء یہی اشہر ہے، بدء الوحی سے متعلق بیان ختم ہوگیا، اب کل آگے ان شاء اللہ وحی کے متعلق بیان کیا جائے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

الدرس الرابع

وحی کے معنیٰ واقسام کا بیان بہ عنوانات مختلفہ

آج کی بحث لفظ ''بدءٗ'' کے بعدوالے لفظ ''وحی'' سے متعلق ہے لیکن ایک بات لفظ **بدء** سے متعلق اس وقت خیال میں آ گئی، وہ یہ ہے کہ آگے چل کر امام بخاریؒ اس لفظ بدء کو دوسرے ابواب میں مہموز اللام لائے ہیں، جیسا کہ **بدء الحیض بدء الخلق، بدء الاذان**، وہاں سب جگہوں پر آغاز کے معنیٰ لیے ہے، اسی ذوق کے پیش نظر یہاں بھی آغاز کے معنی لیے جائیں تو دیگر ابواب کی موافقت بھی حاصل ہوجائے گی، مطلب یہ ہوگا کہ آغاز وحی کے کیا حالات تھے؟ اس پر تمام احادیث ترجمہ باب پر بہ سہولت منطبق ہوجائیں گی، تو دوسرے ابواب میں مہموز اللام لانا اس کا مؤید ہے کہ یہاں بھی بدء مہموز اللام ہی ہے۔

اب وحی سے متعلق بحث ہے، وحی کے لغت میں بہت سے معانی آتے ہیں: (۱) اعلان کرنا (۲) اشارہ کرنا (۳) لکھنا (۴) لکھا ہو (۵) ارسال یعنی بھیجنا (۶) مرسل یعنی بھیجا ہوا (۷) طبعی طور پر کسی چیز کا ودیعت رکھنا جیسے سورج کی طبعی رفتار کہ ۲۴ رگھنٹے میں دورہ پورا کرتا ہے، چاند کی طبع میں ہے کہ ایک ماہ میں دورہ کرتا ہے، بادیان کی طبع میں کسر ریح، ہضم طعام اور پیچش کے لیے مفید ہے۔ (۸) تسخیر یعنی تابع کرنا (۹) **القاء فی القلب** : کسی حق یا ناحق بات کا دل میں ڈالنا۔ (۱۰) ملقیٰ یعنی دل میں ڈالی ہوئی بات۔ (۱۱) امر کے معنیٰ بھی آتے ہیں۔ (۱۲) الہام یعنی کسی متبع سنت مؤمن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا کوئی واقعی بات مطابق نفس الامر اس طرح ڈالنا کہ اس کو محسوس ہو کہ یہ من جانب اللہ ہے مگر لا علی

التعیین ہو، چوں کہ بالتعیین ظاہر ہوجانا کشف ہے یہ معنیٰ تو وحی کے لغوی ہیں (۱)۔

اور اصطلاحِ شرع میں وحی کے یہ معنیٰ ہیں: **کلام اللہ المنزل علی نبی من أنبیائه** (۲)۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ مؤمنین میں سے برگزیدہ بندہ موصوف بہ وصف مصطفویت سے بواسطۂ ملک یا بلا واسطۂ ملک اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا کہ اس برگزیدہ بندہ کو شک وشبہہ بلکہ شبہہ بھی، غلطی، وہم، سہو، تخیل، ذہول ونسیان وخلط کا نہ ہو بلکہ نفس الامر کے مطابق قطعی یقین منطقی کے طور پر ہو، جس میں مشاہدہ سے بھی زیادہ یقین ہو کہ یہ بات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، گویا اس طرح ہو، جیسے اس وقت میرے کلام کے وقت آپ کو میرے کلام ہونے میں واہمہ وشبہہ بھی غیر مسیح اللہ ہونے کا نہیں ہے، یقین قطعی ہے کہ میں ہی کلام کر رہا ہوں، اسی طرح نبی کو بھی یقین قطعی ہوتا ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے، اسی لیے وہ مخصوص بندہ نبی بھی خود اس بات کا مکلف ہوتا ہے کہ وحی کے اللہ تعالیٰ کے کلام ہونے کا یقین کرے، ذرا بھی خلط، غیر کا وہم تک نہ ہو (۳)۔

اس طور وکیف کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام نبی یا رسول کے ساتھ مخصوص ہے، اس وحی اصطلاحی کی چھ قسمیں ہیں جس کی تقریر کے مختلف عنوانات ہیں۔

(۱) ایک عنوان وطریق تقریر کا یہ ہے کہ وحی یا تو بواسطہ ملک ہوگی یا باسماعِ صوت یا مناماً وحلماً ہوگی یعنی بذریعۂ خواب، اگر بواسطہ ملک ہوگی تو یا بہ

---

(۱) فتح الباری ۱/۱۱، عمدة القاری ۱/۴۷.

(۲) عمدة القاری ۱/۴۷.

(۳) وَوَحْيُ اللهِ تَعَالَى إِلَى أَنْبِيَائِهِ عِلْمٌ يَخُصُّهُمْ بِهِ مِنْ غَيْرِ كَسْبٍ مِنْهُمْ وَلَا تَعَلُّمٍ مَنْ غَيْرِهِمْ، بَلْ هُوَ شَيْءٌ يَجِدُونَهُ فِي أَنْفُسِهِمْ مِنْ غَيْرِ تَفَكُّرٍ وَلَا اسْتِنْبَاطٍ مُقْتَرِنًا بِعِلْمٍ وُجْدَانِيٍّ ضَرُورِيٍّ بِأَنَّ الَّذِي أَلْقَاهُ فِي قُلُوبِهِمْ هُوَ الرَّبُّ الْقَادِرُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ....وَعَرَّفَهُ شَيْخُنَا فِي رِسَالَةِ التَّوْحِيدِ :((بِأَنَّهُ عِرْفَانٌ يَجِدُهُ الشَّخْصُ مِنْ نَفْسِهِ مَعَ الْيَقِينِ بِأَنَّهُ مِنْ قِبَلِ اللهِ تَعَالَى بِوَاسِطَةٍ أَوْ بِغَيْرِ وَاسِطَةٍ(تفسير المنار، ج ۱ ص ۱۸۴)

تمثیل بشکل بشری ہوگی، جیسا کہ بعض دفعہ حضرت جبرئیل علیہ الصلوۃ والسلام حضرت دحیہ کلبی صحابی رضی اللہ تعالی عنہ کی شکل میں خدمت نبوی میں تشریف لائے جو ایک نوجوان وخوب صورت حسین آدمی تھے یا بلاتمثیل ہوگی، جیسا کہ بعض دفعہ حضرت جبرئیل علیہ الصلوۃ والسلام اپنی اصلی شکل میں نازل ہوئے ، یا سماعاً ہوگی یعنی ایک آواز وصوت سنائی دے گی، جیسے حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام سے ہم کلامی ہوئی، جیسا کہ ارشاد ہے :وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴿۱۶۴﴾ [النساء] اور حضور اکرم ﷺ سے شب معراج میں کلام فرمایا ہے جس کا بیان فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى﴿۱۰﴾ [النجم] میں ہے۔

یا وحی مناماً ہوگی، چوں کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، جیسا کہ انبیاء سابقین میں سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کو خواب ہی میں وحی ہوئی، حضرت اسماعیل علیہ الصلوۃ والسلام کے بارے میں بھی ایسا ہی وارد ہے، اسی طرح حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام کا خواب بھی وحی تھا جس کو قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نقل فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے :اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ﴿۴﴾ [یوسف] اوراس طرح حضور اکرم ﷺ پر چھے ماہ تک خواب کے ذریعہ نزول وحی ہوتا رہا کہ جس طرح خواب میں دیکھتے تھے، بعینہ اسی طرح اس کا ظہور ہوتا تھا(۱)۔

---

(۱) جیسا آگے حدیث میں اس کی صراحت آرہی ہے :أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ، فَكَانَ لاَ يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ الحديث،وحكى البيهقي أن مدة الرؤيا كانت ستة أشهر.(فتح الباري، ج ١ ص ٢٧)

(۲) دوسرا طریق تقریر کا یہ ہے کہ وحی دوحال سے خالی نہیں ، مناماً ہوگی یا یقظۃً ، پھر یقظۃً دوحال سے خالی نہیں بواسطۂ ملک ہوگی یا بلاواسطۂ ملک ہوگی ، بواسطۂ ملک ہوگی تو یہ بھی دوحال سے خالی نہیں یا تو بالکتاب ہوگی یا بلاکتاب ، اگر بلاکتاب ہوگی تو وہ بھی دوحال سے خالی نہیں یا تو اسماعاً ہوگی یا بلااسماع ہوگی ، بلااسماع پھر دوحال سے خالی نہیں ، یا الہاماً ہوگی یا اجتہاداً ، الہاماً پھر دوحال سے خالی نہیں یا لفظاً ہوگی یا معناً ، اسی طرح اجتہاداً بھی دوحال سے خالی نہیں ، یا اس کا نسخ ہوگا یا نسخ نہیں ہوگا ، یہ تقریر حصری طریق سے ہوئی ۔

(۳) تیسرا عنوان تقریر کا یہ ہے کہ وحی ظاہراً ہوگی یا باطناً یا یوں کہو کہ جلیاً ہوگی یا خفیاً ، وحی خفی کی پھر تین قسمیں ہیں : (۱) الہام (۲) اجتہاد (۳) منام ، اوراسی طرح وحی جلی کی بھی تین قسمیں ہیں : (۱) کتاباً (۲) ملکا (۳) اسماعا ، یہ کل چھے قسمیں ہوئیں ۔

(۱) الہاماً (۲) اجتہاداً (۳) مناماً (۴) کتاباً (۵) ملکاً (۶) اسماعاً ۔

وحی سے متعلق اس تفصیل کے معلوم ہونے کے بعد اب سنئے کہ وحی اسماعی میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ کلام لفظی ہے یا کلام نفسی ، اس میں دو مذہب ہیں ، ایک اشاعرہ کا جدوسرا ماترید یہ کا ، اشاعرہ اس کو کلامِ نفسی کہتے ہیں ، اور ماترید یہ اس کو کلام لفظی مانتے ہیں ، اس لئے کہ آواز اور لفظ کے واسطے جہت ہوتی ہے اور کلام نفسی جہت سے بالاتر ہوتا ہے ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی جو کلام سنا تھا اس میں جہت نہیں تھی ۔

وحی اجتہادی وعصمت انبیاء کے بارے میں اہل السنت والجماعت کے دلائل اور مخالفین کے دلائلِ مذاہب اور اس کا ابطال

دوسرا اختلاف یہ کہ وحی اجتہادی معصوم عن الخطاء ہے یا غیر معصوم، بعض اہل سنت والجماعۃ اسی پر ہیں کہ اجتہاد نبی بھی معصوم عن الخطاء ہوتا ہے۔

جو حضرات اجتہاد نبی کی معصومیت کے قائل نہیں ہیں، وہ استدلال اس سے کرتے ہیں کہ اُسارائے بدر کے بعض کو آپ نے فدیہ لے کر چھوڑ دیا، اس پر آپ کو تنبیہ (۱) کی گئی کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اور تنبیہ وہاں ہوتی ہے جہاں خطا ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ سے خطا ہوئی، آپ کا فدیہ لے کر چھوڑ دینا معصوم عن الخطاء نہیں ہوا، ایک دلیل تو ان حضرات کی یہ ہوئی۔

دوسری دلیل یہ ہے غزوۂ تبوک میں بعض کو آپ نے عدمِ شرکت کی اجازت دے دی اس پر وحی نازل ہوئی، ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ۝۴۳ [التوبة] یعنی آپ نے ان کو کیوں اجازت دی؟ یہ تو غلطی ہے، خیر اللہ تعالیٰ نے معاف کیا تو معافی کا لفظ بتلا رہا ہے کہ خطا ہوئی، اس لیے کہ معافی خطا ہی کی ہوا کرتی ہے، یہ دلائل ہیں قائلین عدم معصومیتِ اجتہاد نبی کے۔

جمہور محققین کی طرف سے ان کے جوابات دئے گئے ہیں، جواب کا ایک طریق یہ ہوتا ہے کہ خصم کے دلائل پر نقض وارد کیا جائے یا ان کے دلائل میں

---

(۱) مراد یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝۶۷﴾ [الأنفال]

احتمال پیدا کر دیا جائے ،جس سے وہ قابل استدلال نہیں رہتے چونکہ قاعدہ ہے : **إذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال** (۱) ، چنانچہ ان کے دلائل مخدوش کیے جائیں گے پھر جمہور محققین کی طرف سے مستقل دلائل مخالفین کے خلاف اوراپنے مذہب کی تائید وحمایت میں پیش کیے جائیں گے۔

چنانچہ ان کی پہلی دلیل یعنی بعض اُسارائے بدر کا فدیہ لے کر چھوڑ دینا اوراس پر حق تعالیٰ کی طرف سے نزول وحی ہونا،جس کا حاصل آپ کے اجتہاد پر انکار تھا، اس کا جواب محققین کی طرف سے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں دیا ہے کہ جوآیت اس موقع پر نازل ہوئی تھی :﴿فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً﴾[**محمد: ۴**] اس میں لفظ ''إِمَّا'' **بمعنی** ''أَوْ'' ہے جوتخییر کا مقتضی ہوتا ہے، جودلیل ہے فداء کے ماذون فیہ ہونے کی (۲)۔

لہٰذا آپ نے اگرفدیہ لے کر بعض قیدیوں کوچھوڑ دیا تواس کوحق تعالیٰ نے جائز رکھا پھر اس کو خطا کہنا کیوں درست ہوسکتا ہے؟ اور آیت کو مخالفین اپنا مستدل کیسے قرار دیتے ہیں؟ یہ تو ہمارے دعوی کے مطابق ہے، نہ کہ مخالف، پس یہ ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے۔

اب رہی دوسری دلیل مخالفین کی کہ غزوۂ تبوک میں بعض صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے شرکت نہ کرنے کی رخصت چاہی ، آپ نے اجازت فرمادی تھی، اس پر یہ آیت کریمہ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ نازل ہوئی جس سے غلطی اورخطا کا ہونا صاف معلوم ہورہا ہے، چوں کہ معافی کسی غلطی وخطا ہی کی ہوتی ہے۔

(۱) الشرح الميسر لقواعد الأصول ومعاقد الفصول، ج۵ ص ۱۹ .

(۲) وَالعَمَلُ عَلَى هَذَا عِنْدَ أَكْثَرِ أَهْلِ العِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ وَغَيْرِهِمْ أَنَّ لِلإِمَامِ أَنْ يَمُنَّ عَلَى مَنْ شَاءَ مِنَ الأُسَارَى، وَيَقْتُلَ مَنْ شَاءَ مِنْهُمْ، وَيَفْدِي مَنْ شَاءَ. (ترمذی شریف، ج ۱ ص ۲۸۶ ،بَابُ مَا جَاءَ فِي قَتْلِ الأُسَارَى وَالفِدَاءِ، رقم الحديث: ۱۵۶۸ .)

علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ "عَفَا اللّٰهُ" کے معنی عدم مواخذہ کے ہیں اور یہ عدم خطاء پر ہوتا ہے (۱)، مطلب آیت کریمہ کا یہ ہے کہ آپ سے کوئی مواخذہ نہیں، پس اس آیت کا اثبات خطا فی الاجتہاد کے لیے دلیل میں پیش کرنا صحیح نہیں۔

اب رہی یہ بات کہ آگے "لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ" بھی تو ہے جو مؤاخذہ پر دال ہے، اس کے متعلق علامہ قشیریؒ فرماتے ہیں کہ یہ خطاب وعنوان عاشقانہ ومحبوبانہ ہے، یہ تنبیہ نہیں ہے، انتباہ ہے افضل سے مفضول کی طرف آنے پر، نہ کہ صحیح سے غلطی اور خطا کی طرف آنے پر، پس یہاں سے خطا ہونا بالکل ثابت نہیں ہوتا، اس لیے اجتہادِ نبی کا معصوم عن الخطا ہونا اپنی جگہ ثابت وسالم ہے (۲)

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ نبی کا اجتہاد اگر خطا سے مبرا اور معصوم ومحفوظ ہوتا ہے تو پھر اجتہادِ نبی کے بعد اس پر عتاب فرمانا اور اس کے خلاف وحی نازل ہونا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ معلوم ہوا کہ نبی کا اجتہاد معصوم عن الخطا نہیں ہوتا، اس لیے وہ وحی میں داخل نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو عتاب ہوتا ہے اور ایک انتباہ، یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، عتاب ایسا خطاب اور کلام ہوتا ہے جو ناراضگی پر مشتمل ہوتا ہے، یہ خطا پر وارد ہوتا ہے اور انتباہ میں یہ بات نہیں ہوتی، وہ ترک اولیٰ پر بھی ہوتا ہے جس سے مقصود اولیٰ اور اعلیٰ افضل پر دلالت ہوتی ہے، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ گو جو آپ نے اختیار فرمایا ہے، ٹھیک وہ بھی ہے مگر یہ کر لیتے، ایسا

---

(۱) وليس عفا هنا بمعنى غفر.. بل قال النبي ﷺ عفا الله لكم عن صدقة الخيل والرقيق « ولم تجب عليهم قط. أي لم يلزمكم ذلك ونحوه للقشيري، قال» :وإنما يقول »العفو « لا يكون إلا عن ذنب من لم يعرف كلام العرب قال :ومعنى عفا الله عنك أي لم يلزمك ذنبا (كتاب الشفا بتعريف حقوق المصطفىٰ ۲/۱ ۳۶.)

(۲) وَقَالَ الْكِرْمَانِي :أَنه عتاب على ترك الأولى. (تيسير التحرير: ۱۸۵/۴

کرتے تو یہ آپ کے زیادہ لائق تھا، آپ کی شان کے شایاں تھا، اس لیے یہ ہی بہتر تھا، پس جس طرح اجتہاد کے بعد عتاب ہونا آپ سمجھ رہے ہیں اور اعتراض کر رہے ہیں، وہ درحقیقت عتاب نہیں، صرف انتباہ وشکوۂ عاشقانہ ہے جس سے اجتہادِ نبی کا خطا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

رہی یہ بات کہ بعض مواقع پر اجتہادِ نبی کے خلاف وحی نازل ہوئی جس سے اجتہاد کا خطا ہونا ظاہر وثابت ہے۔

اس کا جواب شیخ الاسلام علامہ ابن ہمامؒ نے دیا ہے جو ہدایہ کے نہایت ذکی اور فہیم شارح ہیں، فرماتے ہیں: اے معترضین! تمہارا یہ کہنا کہ اجتہاد نبی کے خلاف وحی اور حکم الٰہی نازل ہونا خطائے اجتہادی کی دلیل ہے، غلط ہے۔ چوں کہ وہ حکم جو اجتہادی تھا، وہ بھی صحیح تھا مگر اس نزول وحی تک تھا، نزول حکم جدید کے بعد وہ منسوخ ہو گیا اور یہ حکم نازل ناسخ ہو گیا، جیسا کہ خود وحی جلی کلام الٰہی میں بھی ایسا موجود ہے کہ پہلے ایک حکم نازل ہوا، پھر بعد چندے دوسرا حکم نازل ہوا، جیسا کہ صاف صاف ارشاد ہے :مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط [البقرة:۱۰۶] اسی طرح من جملہ اس ناسخ ومنسوخ کی جزئیات کے یہ آیت ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۝﴾[البقرة :۱۸۴] جس میں روزہ کی طاقت کے باوجود روزہ نہ رکھنے کی اجازت اور اس کے عوض فدیہ کی کفایت بیان فرمائی ہے، پھر اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا، دوسرا حکم نازل ہوا: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط [البقرة:۱۸۵] جس میں یہ حکم فرمایا کہ روزہ ہی رکھنا ضروری ہے، البتہ شیخ فانی، نہایت کمزور کے لیے بناء بر معذوری یہ رخصت اور اجازت اب بھی ہے کہ وہ ہر روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلا دے(۱)۔

پس اس طرح وحی خفی یعنی اجتہاد نبی میں بھی ناسخ ومنسوخ ہیں کہ پہلے حضور

(۱) كتاب التحرير لابن الهمام ص ۵۲۵.

اکرم ﷺ کے قلب پر ایک حکم نازل ہوا، وہ ایک وقت تک باقی رہا پھر اس کو منسوخ کردیا، اس کے بہ جائے دوسرا حکم نازل فرمادیا، ورنہ اگر اجتہاد نبی خطا ہوتا توحق تعالیٰ علیم وقدیر ہیں، ہر چیز کو پورے طور سے جانتے ہیں تو حضور ﷺ کے دل پر جب بھی کوئی حکم بہ طور خطا اجتہادی کے آتا فوراً حضرت جبرئیل علیہ الصلوۃ والسلام کو بھیج کر حق تعالیٰ منع کرادیتے، حالاں کہ ایسا نہیں کیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ وہ حکم اجتہادی خطا اور غلط نہ تھا۔

یہاں تک مخالفین کے دلائل کے جوابات تھے، اب آگے حضرات اہل سنت والجماعت جو جمیع انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی معصومیت کے قائل ہیں، ان کے دلائل ذکر کیے جاتے ہیں۔

ان حضرات کی پہلی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ۝۳ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى ۝۴ [النجم] اس آیت میں صاف موجود ہے کہ نبی اپنی ہوائے نفس سے اور اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، اس کا قول تو سوائے وحی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

قصر اور حصر کے ساتھ فرمادیا کہ ان کا نطق خواہ ظاہری ولسانی ہو، یا قلبی وباطنی جس کو اجتہاد کہتے ہیں، وحی ہی ہوتا ہے۔ بس قول وفعل دونوں اجتہادی امور آپ کے وحی ہیں، چوں کہ ہُوَ کا مرجع نطق ہے جو يَنۡطِقُ کے ضمن میں موجود ہے، حاصل یہ ہوا کہ آپ کا نطق قرآن ہو، یا غیر قرآن، اجتہاداً ہو یا بلا اجتہاد، قبل اجتہاد ہو یا بعد الاجتہاد، وہ سب وحی ہی ہے۔

آیت میں" وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى" کے بعد "اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى" کا فرمانا ایسا ہی ہے جیسا کہ ﴿وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ﴾ [الأنعام:۳۸] میں يَطِيۡرُ کا لفظ طٰٓئِرٌ کے بعد فرمانا۔

اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ طٰٓئِرٌ تو اپنے بازوؤں سے اڑتا ہی ہے پھر

يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ لانے کا کیا فائدہ ہوا؟ یہ بات تو لفظ طٰٓئِرٍ سے ہی معلوم ہو گئی تھی، اس کا جواب حضرت شیخ عبدالقادر جرجانیؒ نے دیا ہے جوفن بلاغت کے امام اور ماہر ہیں، انھوں نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ بعض دفعہ جنس کی صنعت احتمالِ مجاز کے قطع کے لیے لائی جاتی ہے، یہاں ایسا ہی ہے، چوں کہ طٰٓئِرٌ کے لفظ میں کوئی خیال کرسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ مراد تیز رفتار گھوڑا ہو، اس کو تیز رفتاری کے سبب سے طیران سے مُتصف کر دیا ہوتو اس ایہام کے دفع کے لیے يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ فرمایا(۱)۔

پس اسی طرح وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴ کہ يُوْحٰى کا لفظ احتمالِ مجاز کوختم کرنے کے لیے فرمایا جس میں قوت اور مبالغہ کے ساتھ بتلادیا کہ آپ کا سب کا سب نطق وحی ہے، غیر وحی نہیں، اور وحی کے معصوم اور محفوظ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں، پس عصمت وحی مستلزم ہے صاحب وحی یعنی نبی وپیغمبر کی عصمت ومعصومیت کو، اس لیے کہ معصوم کا قول وفعل خواہ اجتہادی ہی ہو، ضرور معصوم ہی ہوگا کہ جب ذات معصوم ہے تو اس کا قول وفعل بھی معصوم ہوگا۔

دوسری دلیل اہل سنت والجماعت کی من جملہ دیگر دلائل کے وہ ہے جسے مسلم الثبوت میں ذکر کیا گیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ آیت کریمہ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ [النساء: ۱۰۵] سے عصمت نبی اور اجتہاد نبی کے خطا سے محفوظ ہونے پر اس طرح استدلال فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ میں اَرٰی کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نبی کے دل میں اور خیال پاک میں کسی امر سے متعلق جو فیصلہ آتا ہے، وہ منجانب اللہ ہوتا ہے، اس میں نفس وشیطان کا دخل نہیں ہوتا، پس ثابت ہوا کہ اجتہادِ نبی

(۱) مفاتيح الغيب = التفسير الكبير، ج ۱۲ ص ۱۷۵.

میں خطا اور غلطی کا احتمال نہیں ہوتا (۱)۔

تیسری دلیل ﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۝۲۶ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝۲۷ [الجن] اس آیت میں صاف صاف موجود ہے کہ غیبی امور کی اطلاع رسول کو دے کر اس کے گرد وپیش اور اگلے، پچھلے، پیش آمدہ اور ناپیش آمدہ کے احاطۂ علمی کے ساتھ اس کی حفاظت کے انتظامات اللہ تعالیٰ فرمادیتے ہیں، یعنی نفس وشیطان کی آمیزش اور دخل سے مامون ومحفوظ فرمادیتے ہیں، اس سے بھی ثابت ہوا کہ نبی کے اجتہاد میں نفس وشیطان کا خلل نہیں آسکتا، اور یہی غلطی اور خطا کے مبادی ومناشی تھے، پس جب اسباب خطا وغلطی کا انسداد اور بندش فرمادی تو اجتہاد نبی میں غلطی وخطا کے احتمال کی کسی درجہ بھی گنجائش باقی نہیں رہی۔

چوتھی دلیل حق تعالیٰ کا ارشادِ عالی ہے: اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ۝۴۰ [الصافات] اس آیت میں حق تعالیٰ نے گرفت اور پکڑ سے عباد مخلصین کا استثناء فرمایا ہے، حضرت امام رازی (۲) رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت میں حق تعالیٰ نے مخلصین فرمایا ہے، اور مخلص وہ ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص

---

(۱) مسلم الثبوت ۲/۳۲۲۔

(۲) حضرت امام رازیؒ: آپ کا نام محمد بن عمر بن حسن ہے اور فخر الدین آپ کا لقب ہے، علامۂ وقت، فقیہ النفس، مفسر بے بدل، متکلم الاسلام، ادیب ولغوی، فصیح اللسان خطیب، الغرض آپ تمام علوم میں ید طولی رکھنے والے نادر الوجود شخصیت کے مالک تھے۔ ۵۴۴ھ کو ''رے'' میں پیدا ہوئے، اپنے والد ضیاء الدین کے پاس حصول علم میں مشغول ہوئے کہ جن کے تلامذہ میں محی السنہ ابومحمد بغویؒ جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کا شمار ہوتا ہے اور پھر آپ نے تمام علوم میں جو مہارت وبصیرت حاصل کی، وہ عوام وخواص پر عیاں ہے۔ آپ کی تصانیف میں تفسیرِ کبیر ہے جو تفسیرِ رازی کے نام سے جانی جاتی ہے اور کئی جلدوں پر مشتمل ایک نہایت ہی قیمتی کتاب ہے، اس کے علاوہ أسرار التنزیل وأخبار التأویل، نهایة العقول في أصول الدين (یہ چار جلدوں میں ہے)، ←

فرمالیا ہو، اور شیطان ونفس کے وسوسوں سے پاک اور محفوظ فرمادیا ہو، چنانچہ شیطان نے جب تمام بنی آدم کے ساتھ دشمنی ظاہر کی اور سب کو ضرر پہنچانے کا اعلان کیا تو ساتھ ہی عبادِ مخلصین سے عاجز اور بے بس ہونا اوران کا اپنے قابو سے باہر ہونا بھی ظاہر کردیا اور مخلصین میں جمیع انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام اعلیٰ درجہ کے مخلص ہیں اور حضور اکرم ﷺ تو اخص المخلصین میں سے ہیں، پھر آپ پر نفس وشیطان کا اثر کس طرح ممکن ہے، الحاصل نبی خطا وغلطی سے محفوظ اور معصوم ہوتا ہے، نبی کی عصمت نہایت مستحکم ومضبوط ہے۔پس خطائے اجتہادی کے وہم کی بھی گنجائش نہیں رہی۔

غلطی وخطا کی نسبت بھی انبیاء کی طرف نہیں کی جاسکتی، جیسا کہ اوپر تفصیل سے مدلل بیان کردیا گیا اور بالخصوص نبی اکرم ﷺ کی عصمت پر تو بہت سی آیات موجود ہیں، مثلاً: ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾ [الفتح] یہ آیت بھی آپ کی عصمت پر دال ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰۷﴾ [الأنبياء]، یہ مستقل دلیل عصمت ہے اور فرمایا: اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴿۱۳﴾ [الشورى] اور فرمایا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] اور فرمایا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب: ۲۱] اور ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ [محمد: ۳۳] اور ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء: ۸۰] جب کہ ہر معاملہ میں آں حضرت ﷺ کی اتباع ضروری ہے تو آپ کی عصمت ضروری

→ المطالب العالية في الأصول (یہ بھی چار جلدوں میں ہے)، كتاب الأربعين، المحصل، المعالم في أصول الدين والفقه، البيان والبرهان في الرد على أهل الزيغ والطغيان، المحصول في أصول الفقه، اس کے علاوہ بھی کئی کتابوں کی تصنیف کی ہے، عیدالفطر کے روز ۶۰۶ھ کو ہرات میں آپ کی وفات ہوئی۔ (معجم الأدباء للحموي رحمہ اللہ، ج۶، رقم الشخصيات: ۱۰۹۴)

ہوئی، ورنہ معصیت میں بھی اتباع ماننا ہوگی اور وہ محال ہے، چوں کہ وہ خدا کا حکم ہو نہیں سکتا اور جو مستلزم ہو کسی محال کو وہ بھی محال، لہٰذا معصیت انبیاء محال ہے۔

اس پر اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض امور میں انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو متنبہ فرمایا ہے جیسا کہ حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام سے جو کہ اول الانبیاء وابوالانبیاء ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ [البقرۃ: ۳۵] لیکن حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام نے اس کے خلاف کیا اور شجرۂ ممنوعہ کا اَکل فرمایا، جیسا کہ خود کلامِ حق کا بیان ہے: فَاَكَلَا مِنْهَا [طٰہٰ: ۱۲۱]، اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حکم کے خلاف کیا، نافرمانی کی اور اسی کو غلطی، خطا اور معصیت کہتے ہیں، اور یہ ہم بلا دلیل نہیں کہتے اس کی دلیل خود ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾﴾ [طٰہٰ: ۱۲۱]، اس آیت میں صاف موجود ہے کہ آدم نے اپنے رب کی معصیت کی، پس معصومیت ثابت نہ رہی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کا جو سرسری اور ظاہری مطلب آپ نے سمجھا، اس کا یہ مطلب صحیح نہیں، اس لیے کہ پہلے معصیت کے معنیٰ متعین ہونا چاہئے کہ معصیت کس کو کہتے ہیں؟ درحقیقت معصیت کہتے ہیں بہ شرارتِ نفس قصداً وارادۃً خلافِ حکم کرنے کو، اس سے واضح ہو گیا کہ اگر خلاف حکم کام نسیاناً وسہواً بلاعزم وارادہ صادر ہو یا محبت وعظمت کے غلبہ میں مخالفت حکم ہو جائے، وہ معصیت نہیں ہے، اور ہم نے یہ بات بلا دلیل نہیں کہی بلکہ اس پر دلیل صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے کہ صلح نامہ لکھا جانے لگا، حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ اس کو لکھ رہے تھے، اس کے شروع میں من محمد رسول اللہ لکھا تو اس پر کفار ومشرکین مکہ نے شور وشغب کیا کہ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے، اسی پر تو ہمارا آپ کے ساتھ اختلاف ہے۔ چوں کہ صلح نامہ بین الطرفین ہے، اس میں ایسے الفاظ ہرگز نہیں ہوں گے جو اختلافی ہوں، اس

لے من محمد بن عبد اللہ لکھوایا جائے، اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کو فرمایا کہ اس کو کاٹ دیجئے اور من محمد بن عبد اللہ لکھئے، جس طرح یہ کہہ رہے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے عرض کیا کہ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے نہ لکھا(۱)۔

مگر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ پر کوئی عتاب نہیں فرمایا، اگر یہ نافرمانی ہوتی تو ضرور اظہار نا گواری فرماتے، وجہ یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے ہوائے نفس یا نعوذ باللہ عداوتِ رسول سے خلاف نہیں کیا بلکہ غلبۂ عظمتِ رسول کے باعث لفظِ رسول کے آپ کے نام نامی سے محو یا تغیر کی ہمت نہیں ہوئی؛ اس لیے آں حضرت ﷺ نے بھی عتاب نہیں فرمایا اور نہ ہی کوئی آیت اس سلسلے میں ایقاظ وتنبیہ کی خاطر نازل ہوئی، پس معلوم ہوا کہ مطلق خلافِ حکم کے صدور کو معصیت نہیں کہا جاتا۔

اسی طرح حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے بھائیوں کا واقعہ ہے کہ انھوں نے حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ کیا اور پھر آ کر یہ کہا کہ ابا جی ان کو تو بھیڑیا کھا گیا۔ باوجود اس سب کے حق تعالیٰ نے ان کی شان میں فرمایا: ﴿وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ۝٢٠﴾ [یوسف]، مِنَ الظَّالِمِينَ وغیرہ نہیں فرمایا، حالاں کہ یہاں حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کو کنویں میں ڈالنا پھر حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ والسلام کے سامنے خلافِ واقعہ بات بیان کرنا، سبھی کچھ موجود ہے، بہ این ہمہ اس کو حق تعالیٰ نے معصیت نہیں فرمایا۔

چوں کہ یہ سب غلبہ میں کیا تھا، یہ چاہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کمال ورسوخ

(۱) صحيح البخاری، عَنِ البَرَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، بَابُ المُصَالَحَةِ عَلَى ثَلاثَةِ أَيَّامٍ، أَوْ وَقْتٍ مَعْلُومٍ، رقم الحديث: ۳۱۸۴.

کے ساتھ رضائے حق حاصل ہو، نفس کا تزکیہ ہو، اور بدرجۂ کمال اصلاح باطن کا حصول ہو، اور وہ ابا کی توجہ اور نظر التفات اور مزید درمزید عنایات کے ہمارے حال پر ہونے سے ہوسکتا ہے، اوراس وقت یوسفؑ کی طرف غالب توجہ ہے تو ان کی تو علمی وعملی زندگی مکمل ہوجاوے گی اور ہماری ناقص رہ جائے گی، اس لیے ایسی صورت ہو کہ ابا کی توجہ ہماری طرف منعطف ہوجائے تو ہمارا یہ مقصد جیسا کہ آیت کریمہ ﴿ يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ [یوسف] اس پر شاہد ہے، تو اس طرح ﴿ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ۝ ﴾ کے مصداق ہوئے، عاصین نہ ہوئے۔ چوں کہ یہ معاملہ تحاسداً نہ تھا بلکہ تنافساً تھا ،اس سے معلوم ہوا کہ اگر خلافِ حکم اچھی نیت سے ہوتو درحقیقت وہ معصیت نہیں، معصیت تو جب ہوتی ہے جب کہ ہوائے نفس سے ارادۃً وقصداً خلافِ حکم کا ارتکاب ہو۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام سے جو صدور ہوا، اس میں غور کر کے دیکھنا چاہئے کہ وہ خلافِ حکم خواہش نفس سے اور ارادۃً وقصداً ہوا یا نسیاناً اور غلبۂ حب الٰہی سے ہوا، سوخود باری تعالیٰ فرماتے ہیں :فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۝ ﴾ [طٰہٰ] اس میں حق تعالیٰ نے صدور فعل ارادۃً کی نفی فرمائی ہے اور جو صدورِ خلاف بلاارادہ ہوتا ہے، وہ معصیت نہیں، لہٰذا آدم علیہعلیہ الصلوۃ والسلامسے خلاف صدور میں آنا معصیت نہیں، پس آپ کی عصمت ومعصومیت ثابت رہی۔

نیز ارشاد ہے :وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ۝ ﴾ [الأعراف] ابلیس نے قسم کھا کر کہا کہ اس درخت کے کھا لینے سے ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی جنت سے جو قرب الٰہی کی جگہ اور محل ہے نکلنا نہیں ہوگا، حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کو وہم بھی نہیں ہوا اس کے جھوٹے ہونے کا، ادھر امر الٰہی سے

نسیان، ادھر حق تعالیٰ کی قسمیں کھا کر عادتاً کسی کے کلام پر یقین کا آجانا، نیز اس کے خلاف قسموں کا کذباً کبھی ظہور نہ ہونا، ادھر حق تعالیٰ کا قرب ومعیت۔ یہ سب چیزیں اس طرح جمع ہوگئیں کہ غلبۂ محبت وحصول قرب الٰہی، معیت حق سے تخصیصاً اکل شجرہ پر مجبوراً معذور ہوئے جو کہ یہ مأ زور (گنہگار) ہونا نہیں ہے: لہٰذا یہ معصیت نہیں بلکہ معصومیت ہے۔

اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِهٖ خود سچے تھے، اس کو بھی سچا سمجھا، پھر جب اپنے محبوب اور معظم کی قسم کے ساتھ بیان کر رہا ہے، ایسے عاشق کو خلاف کا ذرا وہم بھی نہیں ہوتا، خصوصاً جبکہ قرب الٰہی کے دوام بلکہ ترقی وقرب کے ساتھ یہ قسم مقرون ہو، یہ سب امور بیک وقت جمع ہوگئے جس سے شیطان کی عداوت اور اس کے کذب وخداع اور حق تعالیٰ کی ممانعت کا مطلق تصور نہ رہا، اور اس طرف التفات یکسر منعدم ومستور ہوگیا، اس سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام سے حکم الٰہی کی مخالفت محض ظاہراً وصورتاً تھی، ازروئے حقیقت مخالفت نہ تھی، جیسا کہ معلوم ہوا کہ محبت وعظمت الٰہی کے غلبہ میں امر ونہی کا خیال والتفات تک نہ رہا، ذہول ونسیان طاری ہوگیا تھا۔

دوسرا جواب حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے کہ فی الحقیقت یہ مخالفت نہیں تھی، اس کو مخالفت کہنا خاص درجۂ نبوت کے اعتبار سے واقع ہوا، چوں کہ مقربین کے ساتھ معاملہ جداگانہ اور نرالا ہوتا ہے، حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ (۱)، علوشان نبوی کے اعتبار سے اتنی بات بھی گویا گوارا نہیں فرمائی،

(۱) هو من كلام أبي سعيد الخراز كما رواه ابن عساكر في ترجمته، وهو من كبار الصوفية مات في سنة مائتين وثمانين وعده بعضهم حديثا، وليس كذلك، وقال النجم رواه ابن عساكر أيضا عن أبي سعيد الخراز من قوله وحكى عن ذي النون انتهى، وعزاه الزركشي في لقطته للجنيد. (كشف الخفاء، ج ۱ ص ۴۱۱)

جو چیز دوسروں کے لیے مخالفت ومعصیت شمار نہ ہو، وہی چیز عالی مرتبہ شخصیت کی رفعت اور خصوصیت کے لیے عیب وغلطی شمار ہوتی ہے تو اس سے تو حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کی غایت نزہت اور بلندی مرتبت ثابت ہوئی، جیسا کہ معمولی دھبہ اور خفیف سا میل کچیل کوئی لائق عیب شمار نہیں کیا جاتا، لیکن چمکدار اور صاف وشفاف شے کے لیے بوجہ اس کے انتہائی صفائی اور گرد وغبار میل وکچیل سے بہت زیادہ محفوظ ہونے کے وہ خفیف سا غبار اور ادنیٰ درجہ کا میل بھی نمایاں داغ معلوم ہوتا ہے، اس لیے حضرت آدمؑ کی یہ بات گو ان کی شان وعظمت کے شایاں نہ ہونے کے اعتبار سے مناسب نہ تھی، لیکن شرعاً کوئی معصیت وغلطی نہ تھی بلکہ تکویناً تو مصلحت اور حسنہ ہی تھی (۱)۔

تیسرا جواب وہ ہے جس کو مولانا قاسم نانوتوی (۱) رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام سے جو لغزشیں صادر ہوتی ہیں، وہ اندر سے نہیں ہوتیں، صرف باہر سے ہوتی ہیں، جس کی دلیل حق تعالیٰ کا ارشاد عالی ہے: ﴿كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَالۡفَحۡشَآءَ﴾ [یوسف: ۲۴] کہ یہ اس واسطے تا کہ ہم یوسف علیہ الصلوۃ والسلام سے سوء اور فحش، چھوٹی بڑی بُرائیاں ہٹادیں، اس سے

(۱) مرقاة المفاتيح، ج ۱ ص ۱۴۹، باب الإيمان بالقدر، الفصل الأول، تحت حديث أبي هريرة قال: قال رسول الله - ﷺ -: احتج آدم، وموسى عند ربهما، فحج آدم موسى؟ الحديث.

(۲) مولانا قاسم نانوتویؒ: مولانا عبدالحی لکھنویؒ نزہۃ الخواطر میں فرماتے ہیں: "الشيخ الإمام العالم الكبير محمد قاسم بن أسد علي بن غلام شاه بن محمد بخش الصديقي النانوتوي، أحد العلماء الربانيين"۔ آپ ہندوستان کے معروف ومشہور عالم اور دارالعلوم دیوبند کے بانی مبانی ہیں کہ جنھوں نے اس دارالعلوم کو قائم کر کے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے عالمِ اسلام میں مدارسِ دینیہ کے قیام کی ایک سنت قائم کردی اور اہل دنیا پر ثابت کردیا کہ حکومت وسلطنت کے تعاون کے بغیر بھی علومِ دین کی نشر واشاعت کس طرح کی جاسکتی ہے۔ آپ

←

معلوم ہوا کہ وہ اندرونی چیز نہ تھی، چوں کہ ہٹانا فرمایااور ہٹانا بیرونی چیز کے لیے فرمایا جاتا ہے، جیسا کہ حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے، بعد نماز حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو فرمایا کہ تم اچھی طرح طہارت نہیں کرتے جس سے مجھ پر قرأت قرآن میں التباس ہوجاتا ہے(۱)۔

← ۱۲۴۸ھ میں نانوتہ میں پیدا ہوئے اور صغرِ سنی میں سہارنپور جا کر شیخ محمد نواز سہارنپوریؒ سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد دہلی جا کر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے تمام درسی کتابیں پڑھیں اور وہیں پر حضرت مولانا شیخ عبدالغنیؒ سے علمِ حدیث میں مہارت پیدا کی اور ان کی خدمت میں ایک مدت تک رہے اور راہِ سلوک میں شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہو کر فیوضِ کثیرہ حاصل کیے۔ آپ اس قدر بڑے اور جلیل القدر عالم ہونے کے باوجود بالکل سادگی پسند طبیعت کے مالک تھے، آپ کی وضع قطع بھی علماء کی وضع قطع سے ہٹ کر عام لوگوں جیسی تھی جس کی وجہ سے نو واردتو آپ کو پہچان بھی نہیں پاتا تھا، حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہؒ نے آپ کو خلافت دے کر آپ کی شان میں بڑا عجیب جملہ کہا تھا کہ قاسم جیسی شخصیت پہلے زمانے میں پائی جاتی تھی اور یہ واقعہ تھا، گویا آپ نجومِ صحابہؓ سے علیحدہ ہونے والے ایک ستارے تھے کہ جو اس آخری دور میں طلوع ہوئے تھے۔ الغرض آپ نے اپنے شیخ کے حکم سے انگریزوں کے ساتھ جہاد کیا اور جہادِ شاملی میں شرکت کی جس کی وجہ سے آپ کو انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بھی بننا پڑا اور بالآخر ان ہی انگریزوں کی سازشوں سے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے دیوبند میں دارالعلوم کا قیام فرمایا جس کے فیوض وبرکات آج تک دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ تا قیامت جاری رہیں گے۔ آپ نے اپنی زندگی میں ہنود اور نصاریٰ سے میدانِ مناظرہ میں بڑے معرکے سر کیے ہیں اور اس سلسلے میں آپ کے کئی مناظرے شائع بھی ہو چکے تھے۔ آپ کی تصنیفات میں: قبلہ نما، تقریر دل پذیر، حجۃ الاسلام، آبِ حیات، تحذیر الناس، ہدیۃ الشیعہ، الدلیل المحکم وغیرہ وہ عظیم تصانیف ہیں اور ان میں وہ علوم پنہاں ہیں کہ ان کو حل کرنا ہی آج کل علماء کے لیے مشکل مرحلہ ہے، بروز جمعرات ۴/ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ میں دیوبند میں آپ کی وفات ہوئی ہے۔ رحمه الله تعالى رحمةً واسعةً وجزاه الله عنا بما هو اهله ونفعنا بعلومه وفيوضه إلى يوم الدين (آمين)۔ (نزهة الخواطر ج۷ ص ۱۰۶۸ بتغييريسير)

(۱) مشكوٰة شريف ص ۳۹/، كتاب الطهارة، الفصل الثالث، عن شبيب بن أبي روح عن رجل من أصحاب رسول الله ﷺ.

اس مقام پر علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عدم تحصیل طہور خارجی چیز تھی، داخلی نہ تھی، انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو خارجی اثرات سے کچھ پیش آجاتا ہے، ان کی ذات میں وہ چیز نہیں ہوتی، لہٰذا ان کی ایسی چیزوں کو لغزش کہتے ہیں، معصیت نہیں کہتے، لہٰذا اس قسم کی چیزیں انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی منقصت اور عدمِ معصومیت پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ یہ تو بہ جائے خود ان کی نزہت پر دلالت کرتی ہیں کہ باوجود بشر ہونے کے ان کی ذات شر اور سوء سے بَری ہوتی ہے اور بعض خارجی اثرات سے تاثّر یہ ان کی بشریت کو محکم اور مضبوط کرتا ہے، اس لیے کہ تاثّر سے مطلق برآت شانِ الوہیت ہے(۱)۔

بہر حال! صدور زلات ولغزشات شان نبوت کے منافی اور خلاف عصمتِ انبیاء ہرگز نہیں، اسی وجہ سے ابومنصور ماتریدیؒ نے فرمایا کہ انبیاء کی معصومیت ملائک کی عصمت سے بڑھ چڑھ کر ہے، چوں کہ قرآن پاک میں ملائک کی متابعت کا حکم نہیں فرمایا، اور انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی متابعت کا حکم فرمایا گیا ہے، اور ان کی متابعت کو حق تعالیٰ نے اپنی متابعت قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ [النساء:۸۰] اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ [النساء:۶۴]۔

الحاصل انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی معصومیت بے داغ ہے، جو کہ نہایت اکمل طریقہ پر ثابت ہوگئی، اور جب انبیاء کی معصومیت ثابت ہوگئی تو ان سے

(۱) ثم إن في ضمن هذا الحديث تنبيها على أن الأنبياء عليهم الصلاة والسلام وإن كانوا من الله بمكان لا يشاركهم فيه أحد، فإنهم بشر يطرأ عليهم من الأحوال ما يطرأ على البشر، فلا تعدوا ذلك منقصة ولا تحسبوه مسبة. (الكاشف عن حقائق السنن، ج ۱۱ ص ۳۶۰۷، باب بدء الخلق وذكر الأنبياء عليهم الصلاة والسلام، الفصل الأول)

اقوال وافعال کا جو بھی صدور ہوگا، وہ سب منجانب اللہ اور وحی ہوگا، پس معلوم ہوا کہ منام واجتہاد سب وحی ہوتا ہے اور وحی معصوم عن الخطا ہوئی تو اجتہاد نبی کا خطاو غلطی سے محفوظ ہونا لازماً ثابت ہوا(۱)۔

❁ ❁ ❁

(۱) غور فرمائیے کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے اہل سنت والجماعت کس درجہ مدافعت کررہے ہیں تو خاص حضور اکرم ﷺ کی طرف سے کیوں نہ مدافعت کریں گے، پھر اہل بدعت کا علمائے دیوبند کے متعلق یہ الزام کہ ان کے دل میں حضور اکرم ﷺ کی محبت اور عظمت نہیں یہ محض افتراء ہے، اگر محبت نہ ہوتی تو مدافعت کیوں کرتے، محبت ہی تو مدافعت پر لاتی ہے کہ محبوب کا ہر کام بھلا اور اچھا معلوم ہوتا ہے، اسی لئے اس کا عمدہ اور بہتر محمل صاف نظر آتا ہے۔علماء دیوبند کا تو مذہب ہی یہ ہے۔

یاصاحب الجمال ویاسید البشر ❁ من وجهك المنير لقد نورالقمر
لایمکن الثناء کما کان حقهٔ ❁ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(نصیراحمدغفرلہ)

الدرس الخامس

رسول کے لغوی واصطلاحی معانی کا بیان

وحی سے متعلق جملہ مباحث کا بیان ختم ہو گیا، آج لفظِ رسول کے متعلق کلام ہوگا، سواس میں چار بحثیں ہیں: ایک رسول کے لغوی معنیٰ سے متعلق ہے اور دوسری بحث اس کے معنیٰ اصطلاحی سے متعلق ہے، تیسری بحث معنیٰ اصطلاحی کے یہاں مراد ہونے سے متعلق ہے اور چوتھی بحث رسول سے خاص ذاتِ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مراد ہونے سے متعلق ہے۔

پہلی بحث : لغت میں رسول کے معنی قاصد اور ایلچی کے ہیں، رسول پیغام پہنچانے والے کو کہتے ہیں، خواہ وہ کوئی بھی ہو: نبی ہو، یا غیر نبی، انسان ہو یا فرشتہ یا حیوان ہو، تحریری پیغام پہنچانے والا ہو یا زبانی پیغام پہنچانے والا ہو، چنانچہ رسول کے معنیٔ لغوی کے بیان میں کہا گیا ہے : **کل من أرسل الیٰ جهة مّا، سواءٌ كان نبياً أو ملكًا أو حيوانًا** (۱)۔

نبی اور فرشتہ کے ذریعہ پیغام رسی تو سب کو معلوم ہے مگر حیوان کے ذریعہ پیغام پہنچانا شاید آج آپ کو اب معلوم ہو رہا ہوگا، حالاں کہ ایک زمانہ میں اس کا رواج رہا ہے، چنانچہ غالباً آپ حضرات نے سنا ہوگا کہ پہلے زمانے میں کبوتروں کے ذریعہ پیغام رسانی کا دستور تھا، کبوتروں کو خاص طور سے اس پیغام رسانی کی خاطر پالا جاتا تھا، اور ان کو اس کی تربیت دی جاتی تھی، اور کبوتروں کے علاوہ بعض دیگر حیوانات مثلاً کتوں وغیرہ سے بھی یہ کام لیا جاتا تھا۔ چوں کہ اس زمانے میں

(۱) والرسول هو المرسَل من جهة إلى جهة، وأي إنسان تبعثه إلى جهة ما؛ اسمه رسول. (تفسير الشعراوي، ج ۱۱ ص ۶۵۴۷، تحت هذه الآية: وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا.)

تار، وائرلیس یا ریڈیو، ای میل، ٹیلی فون وغیرہ نہ تھے، جلدی کے پیغامات پہنچانے کے لیے کبوتروں سے ہی کام لیا جاتا تھا۔

چنانچہ میں نے حضرت والا دامت برکاتہم (حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ) کی زبانی سنا ہے کہ ایک عالم زنجبار [zanzibar] سے ہندوستان تشریف لائے تھے، ہندوستان میں ان کا تعاقب کیا گیا، جھنجھانہ کے گردونواح میں ان کو گھیر لیا گیا تو اس وقت انھوں نے ایک کبوتر کے ذریعہ شہزادۂ زنجبار کے نام ایک خط بھیجا، جس وقت وہ کبوتر وہاں پہنچا، اس وقت شہزادہ شادی کی تیاری میں غسل کر رہے تھے، کبوتر ان کے سامنے جا بیٹھا، انھوں نے کہا : ٹھہر جاؤ! ابھی غسل نہیں کروں گا، استاذ کا کبوتر آیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مصیبت استاذ کو پیش آئی ہے، پہلے میں اس کو دیکھتا ہوں کہ اس میں کیا لکھا ہے، شہزادہ کو ہر چند بھلایا اور سمجھایا گیا مگر انھوں نے کہا : ابا جان میری شادی ابھی نہیں ہونی چاہئے، پہلے استاذ کی مدد کروں گا، بعد میں اگر زندہ رہا تو دیکھا جائے گا، چنانچہ شہزادہ استاذ کی مدد واعانت کے لیے فوج لے کر روانہ ہو گیا اور جب ہندوستان آیا اور جھنجھانہ پہنچا تو ان کے استاذ شہید ہو چکے تھے، شہزادہ نے بھی مقابلہ کیا اور وہ بھی شہید ہو گئے، ان شہزادہ صاحب کا نام محمود ہے، ان کا مزار جھنجھانہ میں موجود ہے۔

بحث لفظِ رسول کے متعلق چل رہی تھی کہ لفظ رسول کے معنیٰ لغوی کے اعتبار سے حیوان، انسان اور مَلَک سب کو عام ہے، لغت میں ہر پیغام بر کو رسول کہتے ہیں، اسی طرح پیغام بھی عام ہے، خواہ پیغام تقریری ہو یا تحریری، یہ پہلی بحث لفظِ رسول کے معنیٰ لغوی سے متعلق تھی جو ختم ہو گئی۔

اب دوسری بحث رسول کے معنیٰ اصطلاحی میں ہے، سو اصطلاحِ شریعت میں رسول کی تعریف میں مختلف اقوال ہیں : بعض کے نزدیک رسول نبی کے مترادف اور ہم معنیٰ ہے، یعنی وہ برگزیدہ انسان جس کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں

تک اپنے فرامین واحکام وقوانین پہنچانے کے لیے مقرر ومنتخب مخصوص ومتعین فرمایا ہو، اور بعض کے نزدیک رسول اور نبی کے معنیٰ میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے، پھر اس میں بھی بعض نے نبی کو خاص اور رسول کو عام کہا ہے، چوں کہ نبی انسان ہی ہوتا ہے، اور رسول انسان بھی ہوتا ہے اور فرشتہ بھی ہوتا ہے، اور بعض نے نبی کو عام اور رسول کو خاص کہا ہے اور وہ اس طرح کہ رسول وہ بشر ہوتا ہے جس کو مستقل کتاب یا مستقل شریعت دے کر بھیجا گیا ہو، اور نبی اس سے عام ہے، خواہ اس کو کتاب اور شریعت جدیدہ دی گئی ہو یا نہ دی گئی ہو، بلکہ پہلی شریعت وکتاب ہی کی دعوت وتبلیغ کا اس کو مامور بنایا گیا ہو، اس معنیٰ کے اعتبار سے ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں (۱)، یہ دوسری بحث رسول کے معنیٰ اصلاحی میں تھی جو ختم ہوگئی۔

اب تیسری بحث یہاں پر رسول کے بمعنیٰ اصطلاحی مراد ہونے کے بیان میں ہے کہ یہاں پر رسول بمعنیٰ لغوی مراد نہیں بلکہ بمعنیٰ اصطلاحِ شرع مراد ہے، گو معنیٰ اصطلاحی میں معنیٰ لغوی بھی ملحوظ ہوتے ہیں، سو یہاں پر رسول کے معنیٰ اصطلاحی مراد ہونے کی دلیل لفظ رسول کی اللہ کی طرف اضافت ہے، پھر اگرچہ اللہ کا رسول اور قاصد فرشتہ بھی ہوتا ہے مگر یہاں وہ مراد نہیں، اس لیے کہ اضافت میں اصل عہد ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اضافت کی مثل الف لام کے چار قسمیں

(۱) والفرق بين الرسول والنبي ان الرسول من بعث لتبليغ الاحكام ملكا كان او إنسانا بخلاف النبي فانه مختص بالإنسان. (روح البيان، ج۵ ص ۳۳۶، تحت هذه الآية: وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا [مريم]) والفرق بين الرسول والنبيّ أن الرسول أخصّ. فكل رسول نبي وليس كل نبيّ رسولاً. فإنّ الرسول يختص بمن جعله واسطة بينه وبين عباده لتبيين أحكامٍ بوحيٍ مسموع عن مَلَكٍ. والنبيّ قد يقال لمن يجدد علىٰ الناس شريعة من تقدمّه وإن كان يوحى إليه بإلهام أو منام. (تفسير الراغب الأصفهاني، ج۳ ص ۱۳۱۰)

ہیں: (۱) جنسی (۲) استغراقی (۳) عہد ذہنی (۴) عہد خارجی اور چوں کہ ان تمام اقسام میں اصل عہدیت ہے، اس لیے جب تک کوئی اس کے خلاف کا قرینہ نہ ہوگا، اس سے عدول واعراض نہ کیا جائے گا، پس یہاں رسول سے عام معنی مراد نہیں جو فرشتہ کو بھی شامل ہوں، بلکہ یہاں پر بطور عہد ذہنی رسول از جنس بشر ہی مراد ہے۔

اب چوتھی بحث یہ ہے کہ رسول سے یہاں خاص ذاتِ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہے، سواس کی ایک دلیل تو رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ کا لفظ ہے، چوں کہ ان الفاظ کے ساتھ صلوٰۃ وسلام عرف مسلمین میں صرف سردارِ دو جہاں، محبوبِ رب العالمین محمد خاتم النبین ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے، دیگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو شامل نہیں، چنانچہ ہر فن اور طبقہ کی کچھ اصطلاحات مخصوص ہوتی ہیں، جیسا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کے ذکر میں شیخین سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ مراد ہوتے ہیں، اور محدثین کے ذکر میں شیخین سے حضرت امام بخاری اور حضرت امام مسلم رحمہا اللہ تعالیٰ مراد ہوتے ہیں، اور فقہ میں شیخین سے مراد امام اعظم اور امام ابو یوسف رحمہا اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں، اور منطق اور فلسفہ میں شیخین سے مراد بوعلی سینا اور بونصر فارابی ہوتے ہیں، طب میں شیخ سے مراد شیخ الرئیس ابن سینا اور نحو میں شیخ سے مراد سیبویہ ہوتے ہیں، پس اسی طرح محدثین وعامۃ المسلمین کی اصطلاح میں ﷺ کا اطلاق خاص ذات محمدی ﷺ ہی پر ہوتا ہے، لہٰذا رسول بقرینۂ صلی اللہ علیہ وسلم لفظِ رسول سے یہاں آپ ہی کی ذات مبارک مراد ہے۔

اور اضافت رسول کی اللہ تعالیٰ کی جانب بھی اس کا قرینہ ہے، چوں کہ اصل اضافت میں بھی عہد ہوتا ہے، مثل الف لام کے جیسا ﴿فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ﴾ [المزمل: ۱۶] میں الف لام عہد خارجی کا ہے، رسول سے مراد موسیٰ علیہ الصلوۃ

والسلام ہیں، حالاں کہ رسول موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، اسی طرح ﴿ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ﴾ [آل عمران:۳٦] میں، ماقبل میں "ذَكَرُ" کا کوئی ذکر نہیں مگر الف لام اشارہ ہے شخص معین کی طرف اور تخصیص بنا برعادت ہے؛ کیوں کہ بنی اسرائیل خدمت مسجد کے لیے مذکر کو رکھا کرتے تھے، لہٰذا ﴿ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا ﴾[آل عمران:۳۵] میں "مَا" سے مراد مذکر ہے؛ کیوں کہ عورت کو حیض نفاس آتا ہے، وہ مسجد کی خدمت کے لیے نہیں رکھی جاتی بلکہ ذکور کے محرر کرنے کی عادت تھی، اس لیے آیت میں بنا برعادت کے معین مذکر مراد ہے تو الذکر کے الف لام کو عہد ذہنی کہا جائے گا، اور اہل معقول واہل علم معانی عہد خارجی پر محمول کریں گے، کیوں کہ یہاں عادۃً شخص معین مراد ہے، جیسا کہ عادۃً رویت ہلال کے وقت الھلال کہتے ہیں تو وہاں مراد عہد خارجی ہی ہوتا ہے۔

نیز یہاں پر آپ کی ذات پاک کے مراد ہونے کی دوسری دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جس کو امام بخاریؒ نے یہاں نقل فرمایا ہے﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ﴾ الآیۃ یہاں اِلَيْكَ سے خطاب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہاں رسول سے مراد آپ ہی کی ذات بابرکات ہے، اور تیسری دلیل اس کتاب بخاری شریف کے جملہ ابواب وفصول کی تفصیلات وبیانات ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے کلام کو استدلالاً ذکر کیا ہے، اس سے بھی ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی تعیین ہوتی ہے۔

بہر حال! ان مذکورہ بالا دلائل سے ثابت ہو گیا کہ اگر چہ رسول کا نام مذکور نہیں مگر مراد خاص ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں، چوں کہ بعض دفعہ ذکر میں اطلاق ہوتا ہے مگر قرائن سیاق وسباق سے تخصیص وتعیین ضروری ہوتی ہے، جیسا کہ یہاں کی گئی ہے۔

لفظ رسول سے متعلق جو مباحث تھے وہ ختم ہوئے ، اب آگے لفظ اللہ سے متعلق بیان ہے۔

لفظِ اَللّٰہ اور ﷺ کے متعلق بیان

اللہ، علم ہے ذاتِ واجب الوجود ازلی وابدی کا جو جامع ہے تمام صفاتِ کمالیہ کو اور منزہ ہے جملہ نقائص وعیوب سے (۱)، اس اسم کے علاوہ تمام اسمائے حُسنیٰ اسمائے صفات ہیں، لفظ اللہ کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں کیا جا سکتا۔

ﷺ یہ خبر بمعنی انشاء ہے یعنی محض صورتاً اخبار ہے، فی الحقیقت اس سے کسی چیز کی خبر دینا مقصود نہیں، بلکہ انشائے صلوٰۃ وسلام مقصود ہے، یہ جملہ دعائیہ ہے، صلّٰی ،صلوٰۃ سے مشتق ہے اور صلوٰۃ کے معنیٰ لغت میں دعاء، رحمت، عبادات مخصوصہ اور مغفرت ان سب کے آتے ہیں، اس لیے لغۃً صلی اللہ علی زید، علی عمر و بکر بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن امتِ مسلمہ نے اس کو نبی کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے، اس لیے اصطلاح اہل اسلام مقرر ہو جانے کی وجہ سے کسی دوسرے کے لیے ان الفاظ کو استعمال کرنا درست نہیں، البتہ تبعاً للنبی ﷺ دوسروں کے لیے بھی ان الفاظ کا استعمال درست ہے، جیسے: صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلم اور قرآن پاک میں جو صلوٰۃ کا استعمال غیر نبی کے لیے آیا ہے وہاں اصطلاحی معنی مراد نہیں، لغوی معنیٰ مراد ہیں، جیسے: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ﴾ [الأحزاب:۴۳] کہ یہاں پر صلوٰۃ بمعنی رحمت ہے۔

بہر حال! یہ بات خاص طور سے یاد رکھئے کہ فقہاء ومحدثین اور جمیع مسلمین کے عرف واصطلاح میں صلوٰۃ کا مستقلاً استعمال غیر نبی ورسول کے لیے نہیں ہوتا، ہاں البتہ لفظ علیہ السلام بدون ذکر صلوٰۃ ملائکہ کے لیے بھی مستعمل ہے، چنانچہ کہتے

(۱) مسامرہ: ص ۵.

ہیں: جبرئیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام وغیرہ، بخلاف اس کے جبرئیل علیہ الصلوٰۃ، میکائیل علیہ الصلوٰۃ کہنا درست نہ ہوگا، نہ قرأتاً اور نہ کتابتاً، چوں کہ لفظ صلوٰۃ کا استعمال غیر نبی کے لیے درست نہیں ہے۔

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کے بعد سلام کیوں لائے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ چوں کہ قرآن پاک میں دونوں کے لیے فرمایا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ [الأحزاب] اس ارشاد باری کے امتثال میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں پر عمل فرمایا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ صلوٰۃ کے معنی رحمت کے ضرور ہیں، مگر رحمت کی دعاء سلامتی کی دعاء کو مستلزم نہیں، اس لیے کہ بعض دفعہ رحمت تو ہوتی ہے مگر بصورت زحمت ہوتی ہے، جیسے کوئی بیمار ہوتا ہے، مثلاً بخار آتا ہے تو اس سے ایک دن کے بخار میں ۳۶۰ر گناہ معاف ہوتے ہیں، اس لیے کہ بدن میں تین سو ساٹھ اعضاء ہیں اور بخار میں ہر عضو درد میں مبتلا ہوتا ہے، اس لیے ہر عضو کے عوض گناہ کی معافی ہوتی ہے، تو بخار فی الحقیقت رحمت ہے مگر بدن میں سلامتی نہیں ہے، وہ تکلیف وزحمت میں مبتلا ہے، اسی لئے امام بخاریؒ نے صلّٰی کے بعد وسلّم بھی کہا، گویا اشارہ کیا اس بات کی طرف کہ دعائے رحمت کے ساتھ ساتھ دعائے سلامتی وعافیت بھی مطلوب ہے، اور امام بخاریؒ نے اس جملہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے دونوں جہاں میں رحمت وسلامتی کی دعاء فرمائی ہے۔

اسی لیے حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کو آگ میں ڈالے جانے کے وقت ارشاد فرمایا: ﴿قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ﴾ [الأنبياء] ٹھنڈا ہونا رحمت تھا مگر اس کے ساتھ ہی سلامتی کا بھی حکم فرمایا؛ تاکہ زیادہ ٹھنڈی ہو کر باعث تکلیف نہ ہو جائے۔

الحاصل رحمت چوں کہ سلامتی کے ساتھ مطلوب ہے، اس لیے امام بخاریؒ

نے صلّٰی کے ساتھ سلّم کو بھی جمع فرمایا۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بحث ختم ہوئی، اب آگے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡكَ﴾ الآیۃ پر گفتگو ہے۔

قول اللہ عزوجل اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡكَ الآیۃ کی چند بحثیں

وقول الله عزوجل:﴿اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡكَ کَمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلٰی نُوۡحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ﴾ [النساء ۱۶۳:]اس میں چند بحثیں ہیں :(۱) یہ واؤ عاطفہ ہے یا استینافیہ (۲) قول مجرور ہے یا مرفوع (۳) قول کے کیا معنیٰ ہیں (۴) قول کی نسبت اللہ کی طرف کیوں کر صحیح ہے (۵) باب سے یہاں تک ایک ترجمہ ہے یا دو ترجمے ہیں اگر دو ترجمے ہیں تو کس طرح ہیں (۶) اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ دعویٰ ہے یا دلیل (۷) امام بخاریؒ نے اس آیت کو یہاں کیوں اختیار کیا (۸) آیت کو ترجمہ باب سے کیا مناسبت ہے؟۔

اب ان مباحث کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، پہلی بحث واؤ کے متعلق تھی کہ یہ واؤ عاطفہ ہے یا استینافیہ، سو یہاں پر وَقَوۡلِ اللّٰہِ میں واؤ عاطفہ بھی ہوسکتا ہے اور استینافیہ بھی ہوسکتا ہے، واؤ عاطفہ رہنے کی صورت میں قول کا عطف کَیۡفَ کَانَ پر ہوگا اور باب کے تحت ہوگا، اور بعض نے کہا کہ قول کَیۡفَ کے تحت ہے، ان دونوں صورتوں میں قول مجرور ہوگا، اور معطوف، معطوف علیہ سے مل کر باب مضاف اور مابعد مضاف الیہ ہوگا، مضاف ومضاف الیہ مل کر مبتدا اور یثبت بہ کذا خبر، یہ ایک پورا جملہ ایک ہی ترجمہ وعنوان ہوگا، اوراحادیث ستہ اس کی دلیل ہوں گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ واؤ مستانفہ ہو۔ اس صورت میں قول مرفوع ہوگا مبتدا ہونے کی وجہ سے اوراس کی خبر اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ الآیۃ ہوگی، اس صورت میں یہ دو ترجمۂ باب ہوں گے (۱)۔

(۱) کرمانی: ۱۳/۱، ارشاد الساری: ۴۸/۱.

تیسری بحث یہ تھی کہ قول کے کیا معنیٰ ہیں؟ سو قول کے کئی معنی آتے ہیں، اول معنی **القول ما ینطق به اللسان تاما کان أو ناقصا** یعنی زبان سے جو بھی نکلے وہ قول ہے، خواہ وہ تام ہو یا ناقص، دوسرے معنیٰ یہ ہیں: **یطلق علی الکلام والکلم والکلمة ویطلق مجازا علی الرأي والاعتقاد**(١) الحاصل قول کے دو اطلاق آتے ہیں :**ماصدر باللسان وماصدر بغیر اللسان** تو جب قول کا اطلاق کلام بغیر اللسان پر بھی ہوتا ہے تو قرآن پاک پر کہ وہ کلام بغیر اللسان ہے قول کا اطلاق صحیح ہے(٢) پس قول کی نسبت اللہ کی طرف صحیح ہے، اس پر کوئی شبہہ اور اشکال وارد نہیں ہوتا۔

ہاں اگر یوں کہا جاتا کہ قول صرف زبان ہی سے ہوتا ہے تو اشکال لازم آتا کہ جب قول کے لیے زبان لازم ہے اور زبان کے لیے منہ اور منھ کے لیے چہرہ اور چہرے کے لیے جسم ضروری ہے تو نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کے لیے جسم لازم آتا ہے اور ہر جسم کے لیے ترکیب لازم ہے، اور مرکب کے لیے حدوث لازم ہے تو نعوذ باللہ حق تعالیٰ کے لیے حدوث لازم آوے گا جو کہ محال ہے اور جو مستلزم محال ہو، وہ خود بھی محال ہے، لہٰذا اس قول کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جو کہ محال کو مستلزم ہے، محال ہوئی، مگر جب پہلے یہ بتلا دیا گیا کہ قول کے لیے زبان ضروری نہیں ہے تو اب یہ اشکال وارد نہیں ہوسکتا۔

---

(١) عمدة القاری ١/٤٨.

(٢) لطیفہ :ایک مرتبہ حضرت شیخ الہندؒ کا ایک عیسائی پادری سے مناظرہ ہوا، جس میں پادری نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے قرآن میں کلمۃ اللہ کہا ہے اور محمد ﷺ کے لیے نہیں کہا، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت محمد ﷺ سے افضل ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ آپ پہلے بتائیے کہ کلمہ کسے کہتے ہیں اور اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اس پر وہ عیسائی مبہوت وساکت رہ گیا، راہِ فرار اختیار کرنے کی صورت یہ کی کہ میم صاحبہ صاحب بہادر کو بلا رہی ہیں، اس لیے مناظرہ موقوف کردیا جائے۔ (نصیر احمد غفرلہ)

فی الحقیقت جس کے ذریعہ کلام ہوتا ہے، وہ ایک قوت ہے، جہاں بھی وہ رکھ دی جائے، اسی جگہ سے کلام پیدا ہوگا، چنانچہ قیامت میں ہاتھ اور پیر بھی کلام کریں گے(۱)، حالاں کہ ان کی زبان نہ ہوگی، اور آج کل تو لکڑی اور پتھر اور دیگر دھاتوں میں بھی کلام پیدا ہورہاہے کہ آلۂ گراموفون[gramophone] اور ٹیپ ریکارڈر[recordertape]

اس کی کھلی مثالیں موجود ہیں، حالاں کہ ان کے لیے زبان ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا، توجس ذات مقدسہ نے اپنی قدرت سے بغیر زبان کے اپنی مخلوقات میں گویائی اور کلام پیدا فرمادیا، وہ اگر خود بغیر زبان کے کلام کرے تو اس میں کیا استحالہ لازم آتا ہے۔

رہا انسانوں سے کلام کرنا، سو یہ ایک محض امر عادی ہے، ورنہ اگر غور کیا جائے تو کلام کے لیے زبان کا شرط ہونا یہاں بھی ثابت نہیں ہوتا، اس لیے کہ انسان تو زبان سے کلام کرتا ہے مگر خود زبان جو کلام کرتی ہے، اس کے لیے کون سی زبان ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ بلا کسی زبان کے کلام کرتی ہے، ورنہ اگر اس زبان کے لیے زبان مانا جائے تو پھر اس زبان کے لیے بھی ایک زبان ہوگی، ھلم جرًا، اسی طرح تسلسل لازم آئے گا، جو کہ محال ہے اور جو مستلزم محال ہو، وہ خود محال ہے تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خود زبان بلا کسی زبان کے کلام کرتی ہے تو جب زبان جو کہ ایک بے چاری مخلوق ہے، وہ بلا زبان کلام کرسکتی ہے تو اللہ رب العزت جس نے زبان کو گویائی بخشی ہے، بطریق اولیٰ اس کا بلا زبان کے محض اپنی قدرت سے کلام کرنا ثابت ہوگیا۔

اب یہ جاننا ضروری ہے کہ وقول اللہ کے مجرور ہونے کی صورت میں کیف

---

(۱) باری تعالی ارشادفرماتے ہیں:﴿ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝۶۵ ﴾[یٰس: ۶۵]۔

پر عطف ہو کر باب کے تحت ہونے کی صورت ہی راجح ہے، چوں کہ اگر کیف کے تحت مانیں، اور کان پر عطف کیا جائے تو قول اللہ کے لیے کیفیت کا ہونا ثابت ہوگا، اور جس شئے کے لیے احوال وکوائف ہوتے ہیں، وہ شئے بوجہ تغیر احوال وکوائف کے حادث ہوتی ہے، اس لیے قول اللہ کا حادث ہونا لازم آوے گا، اور کلامِ الٰہی صفت الٰہی ہے، اور صفات قدیم ہیں، اس لیے کلام الٰہی قدیم ہے، حدوث اس کے منافی ہے، لہٰذا قول کیف کے تحت ہونا صحیح نہیں (۱)۔

یہ دوسری بات ہے کہ جو لوگ کیف کے تحت قول کو مانتے ہیں، وہ اس میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ کیف سے مراد کیفِ مطلق نہیں بلکہ کیفِ عرض مراد ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: کیف انت، کیف عرض مراد ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ باب قول کے حالات میں ہے، اب رہی یہ بحث کہ اس آیت کو یہاں کیوں منتخب کیا؟ اس کا بیان طول کو مقتضی ہے جس کے لیے اب وقت مساعد نہیں، لہٰذا اس کا بیان ان شاء اللہ کل کیا جائے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

❁ ❁ ❁

(۱) عمدة القاری ۱/۴۹.

الدرس السادس

آیت کوترجمہ الباب میں لانے کی وجہ

کل عرض کیا گیا تھا کہ ’’قول‘‘ کا اعراب رفع اور جر دونوں ہو سکتے ہیں اور یہ عنوان، باب ایک ترجمہ بھی ہوسکتا ہے اور دوترجمے بھی ہو سکتے ہیں، جیسا کہ امام بخاریؒ کی عادت ہے کہ بعض دفعہ دودوتین تین ترجمے لاتے ہیں، جیسا کہ کتاب الایمان میں معلوم ہوگا۔

نیز ان کی عادت ہے کہ ترجمہ باب کو بہ منزلہ دعویٰ ذکر فرماتے ہیں، پھر اس پر کبھی کوئی آیت دلیل کے طور پر لاتے ہیں اور پھر احادیث باب کو بھی اس کی دلیل ٹھہراتے ہیں اور کبھی دلیل میں صرف احادیث ہی کو لاتے ہیں، پس یہاں آیت اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ الآیة وقول اللہ عزوجل سے مل کر مبتدا ہے اور شبت بہ کذا لک اس کی خبر ہے، مبتدا خبر سے مل کر ایک جملہ ہوا، جس کی بحث کل گذر گئی۔

آج کی بحث یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اس آیت کو یہاں کے لیے کیوں منتخب کیا؟ آیات تو اور بھی تھیں، پھر ان سب میں سے اسی آیت کو یہاں کیوں ذکر کیا؟ اس کا ایک جواب سیدھا سادا بچوں کا سا ہے کہ یوں تو امام بخاریؒ اس باب کے تحت جس آیت کو بھی ذکر فرماتے، اس کے متعلق یہی سوال ہوسکتا تھا، پس یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جو دعویٰ کیا ہے، وہ اس سے ثابت ہوتا ہے یا نہیں، چوں کہ دعویٰ کے ثبوت کے لیے مطلق شہادت کافی ہے، کسی خاص شہادت کا پیش کرنا ضروری نہیں ہوتا، اسی وجہ سے کسی خاص دلیل کا طلب کرنا غلط ہوتا ہے، اس کا کسی کو حق نہیں ہوتا، ہاں اگر کسی کو دلیل میں کلام ہوتو وہ پیش کرے۔

اسی لیے اگر عدالت میں مقدمہ پیش ہو، اور مدعی کی شہادت پر مدعیٰ علیہ یہ مطالبہ کرے کہ میں تو جب تسلیم کروں گا، جب فلاں جج صاحب آ کر گواہی دیں تو اس کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اس کو یہی کہا جائے گا کہ ثبوتِ دعویٰ کے لیے مطلق شہادت کافی ہے، کسی خاص شخص کی شہادت طلب کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔

اس لیے یہ کوئی سوال نہیں ہے کہ اس آیت کو یہاں امام بخاریؒ کیوں لائے؟ تاہم اس کا بھی جواب دیا ہے، امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جس وقت حضور اکرم ﷺ نے دعوت وتبلیغ شروع فرمائی تو اہل کتاب نے یہ اعتراض کیا کہ جب آپ رسول ہیں تو ضروری تھا کہ آپ پر کتاب نازل ہوتی، جیسے آپ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام پر کتابیں نازل ہوئیں اسی طرح آپ پر بھی کتاب نازل ہو تو ہم آپ کا نبی ہونا تسلیم کریں، ورنہ تو ہم آپ کی رسالت ونبوت تسلیم نہیں کرتے۔

امام رازیؒ — جو بڑے پایہ کے محقق ہیں — فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے یہ آیت اس اعتراض کے جواب میں نازل فرمائی ہے، اس آیت میں ان کے مقدمہ کو ہی تسلیم نہیں کیا گیا، یعنی تمہارا یہ کہنا کہ تم مدعی رسالت ہو، اور رسول کے لیے کتاب ہونا ضروری ہے، یہ ہم تسلیم نہیں کرتے، تمہارا نبوت کو وحی بصورت کتاب ہی میں منحصر کر دینا غلط ہے، ثبوتِ نبوت کے لیے مطلق وحی کا نزول ضروری ہے، خواہ وہ مکتوب کی شکل میں آوے یا دوسرے طُرق سے آئے، صرف کتابی صورت ہی میں نبوت کے لیے وحی آنا ضروری نہیں اور اگر تم دعویٰ کرتے ہو تو اس کا ثبوت پیش کرو کہ بدون وحی مکتوبی کے وحی نہیں ہوتی یا مکتوبی وحی ہی نبی کے لیے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل کتاب کے اس دعویٰ کا پایۂ ثبوت کو پہنچانا نا

ممکن ومحال ہے، لہٰذا یہ بات اپنی جگہ صحیح وثابت رہی کہ نبی کے لیے مطلق وحی کا نزول ثبوت نبوت کے لیے کافی ہے، خواہ وہ نزول وحی کسی طور پر ہو۔

نیز مخالفین ومعترضین ومنکرین رسالت کو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تم نے حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہما الصلوۃ والسلام کا ذکر کیا ہے کہ جس طرح ان کے پاس کتابی وحی آتی تھی، اسی طرح آپ پر بھی آتی تو ہم مانتے تو ہم پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا میں صرف یہی دو نبی آئے ہیں یا اور بھی بے شمار نبی آئے؟ ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے انبیاء آئے تو کیا ان سب پر بھی وحی کتابی شکل میں ہی آتی تھی؟ مثلاً حضرت ہارون علیہ الصلوۃ والسلام بھی نبی تھے، حالاں کہ ان پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی، پھر آں حضرت ﷺ کی نبوت ہی کو کتابی وحی کے ساتھ مشروط ومحدود کرنے کا تم کو کیا حق حاصل ہے(۱)۔

بہرحال منکرین نبوت ورسالت محمدیہ کے اعتراض وانکار وجواب کے لیے اس آیت کا نزول ہوا، اس آیت میں ثابت فرمادیا کہ جس طرح نوح علیہ الصلوۃ والسلام اور ان کے بعد نبیوں پر ہم نے وحی بھیجی، آپ پر بھی وحی بھیجی ہے، پھر جب یہ منکرین ان سب پہلے انبیاء کو تسلیم کرتے ہیں تو آپ کی نبوت ورسالت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ تو اس آیت میں ان کے اعتراض کا جواب بھی ہوگیا اور اثباتِ نبوت بھی ہوگیا، نیز آپ کی جامعیت اور افضلیت واکملیت بھی ثابت ہوگئی، اس لیے کہ آپ کی نبوت کو تشبیہ دی گئی ہے جملہ انبیاء سابقین کی وحی ونبوت کے ساتھ جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن قسموں اور کیفیتوں وصفتوں کی وحی کے وہ سب انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام الگ الگ حامل تھے، آپ کی ذات ان سب اقسام وحی کی جامع ہے۔

چوں کہ جملہ اقسام وحی منامی، کلامی، اسماعی، بواسطۂ ملکی وبلاواسطہ سب

(۱) تفسیر کبیر: ۸۵/۱۱.

قسم کی وحی کا آپ پر نزول ہوا، تو حاصل آیت شریفہ کا یہ ہوا کہ اے اہل کتاب منکرین ومعترضین! تمہارا یہ کہنا کہ جب آپ پر مثل موسیٰ وعیسیٰ علیہما الصلوۃ والسلام کتاب نازل نہیں ہوئی تو آپ نبی کیوں کر ہوئے؟ محض باطل ہے، نبی ہونے کے لیے مطلق نزول وحی ضروری ہے، کسی خاص طریقے سے نزولِ وحی کو مقید ومخصوص سمجھنا محض باطل ہے جس پر کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے، لہٰذا یہ اعتراض کرنے کا تمھیں کوئی حق نہیں کہ خاص کتابی صورت ہی میں وحی کیوں نہ نازل کی گئی، اس لیے کہ نہ ہماری ذات مقید ہے اور نہ ہمارا فعل مقید ہے، ہم پوری طرح مختار ہیں، جس طرح چاہیں وحی نازل کریں، خواہ کتاباً، خواہ خطاباً، اسماعاً بالملک یا بغیر الملک، الہاماً، پھر خواہ مناماً ہو خواہ یقظاً۔

مناماً وحی کی مثال حضرت یوسف وحضرت ابراہیم علیہما الصلوۃ والسلام پر وحی ہے، چنانچہ حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام پر نزول وحی منامی ہوئی، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ○﴾ [یوسف] اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے متعلق ﴿يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ط﴾ [الصافات: ۱۰۲] میں وحی منامی کا ذکر ہے، نیز دیکھو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما الصلوۃ والسلام سے پہلے بہت سے نبی بھیجے گئے، ان سب کی وحی ایک ہی قسم کی نہ تھی بلکہ کسی پر ایک طرح تھی تو کسی پر دوسری طرح، پس اگر کسی ایک طرح بھی وحی کا نزول ثابت ہو جائے تو نبوت کا ماننا اور یقین کرنا ضروری ہے تو جب کہ ہمارے نبی محمد ﷺ پر وحی نازل ہونا بالکل ظاہر وثابت ہے، پھر تمہارا نہ ماننا محض عناد اور شرارت نہیں تو کیا ہے؟ اور اگر غور وانصاف سے کام لیں تو آپ کی نبوت کا جامع النبوت السابقہ اور آپ کا اکمل النبیین ہونا بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا، یہ امام رازیؒ کے جواب سے تقریر تھی جس سے آیت

باب کا ترجمہ باب کے مطابق ہونا بالکل واضح ہو گیا۔

اس کے بعد اس آیت کے ترجمۃ الباب کے ساتھ انطباق اور اس آیت کے خاص طور پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے انتخاب کے متعلق امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب کے علاوہ دو جواب اور عرض کئے جائیں گے، ایک جواب ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا اور دوسرا جواب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا، ان حضرات کے جوابات اسی آیت کریمہ سے اخذ شدہ ہیں، یہ آیت ہی ان کا ماخذ ہے، ان حضرات کے جوابات ان شاء اللہ کل عرض کیے جائیں گے، بات تو لمبی نہ تھی، مگر آپ حضرات کے اذہان میں انتشار ہے اور میرا قلب ایسا نہیں ہے کہ اس کے باوجود سلسلۂ درس کو جاری رکھوں، خیر اب کل پر رکھئے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

❁ ❁ ❁

الدرس السابع

ترجمۃ الباب سے آیت کی مناسبت کا بیان

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "باب کیف کان بدء الوحی" قائم فرمایا یعنی بداءتِ وحی کی کیفیت کا اس میں بیان ہوگا، لہٰذا اس باب کے تحت جو ذکر ہوگا، وہ تمام بداءت وحی کی کیفیت سے متعلق ہوگا، چوں کہ جب یہ باب اس وجہ سے قائم کیا گیا ہے تو ضروری ہوگا کہ اس باب کے تحت جو کچھ بھی ہو، اس ترجمۃ الباب کے مطابق اور اس پر دلالت کرنے والا ہو۔

اب دیکھئے! ترجمۃ الباب کے بعد اولاً جس چیز کو امام بخاریؒ بیان فرما رہے ہیں، وہ حدیث نہیں، بلکہ آیت ہے، اس آیت کریمہ کی دلالت ترجمۃ الباب پر ضروری ہے، لہٰذا ہمیں یہ بیان کرنا ہے کہ ترجمہ باب پر آیت کی دلالت کس طرح ہے؟۔

امام بخاریؒ نے پہلے بہ طور دعویٰ کے ترجمہ باب کیف کان بدء الوحی قائم فرمایا، اور اس دعوی کے بعد یہ آیت ذکر فرمائی جو نصاً بداءت وحی کا بیان کر رہی ہے، جس کی کل امام رازیؒ کے قول سے تقریر ہو چکی ہے، اس میں بتلایا تھا کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ نے اعتراض کیا تھا کہ جس طرح حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما الصلوۃ والسلام پر کتاب نازل ہوئی تھی، اسی طرح ہر نبی پر کتاب کا نازل ہونا ضروری ہے، اور جب یہ بات ہے تو اگر محمدؐ نبی ہیں تو ان پر کتاب کیوں نازل نہیں ہوئی؟ کتاب نازل ہوتی تو ہم مان لیتے کہ آپ بھی نبی ہیں اور جب آپ پر کتاب نازل نہیں ہوئی تو ہم بھی معذور ہیں، لہٰذا ہم آپ کو نبی نہیں مانتے۔

اس اعتراض کے جواب میں حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جس میں

مختلف انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کا ذکر ہے، اور ان پر کن کن کیفیات سے وحی کا نزول ہوا، کلاماً یا مناماً، ملکاً یا کتاباً یا ان جمیع طرق کے ساتھ، سو بالتفصیل کل یہ بات امام رازیؒ کے بیان سے آپ کے سامنے آگئی تھی کہ حضرت نوحؑ اور ان کے بعد والے نبیوں پر مختلف طرق سے وحی کا آنا ہوا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ نبی کے لیے وحی کے آنا صرف کتاباً ہی ضروری نہیں، بلکہ کسی بھی قسم سے مطلقاً وحی کا آنا ضروری ہے، خواہ وہ کسی بھی صورت سے ہو، کتاباً ہو، یا ملکاً ہو، کلاماً ہو یا غیر کلاماً، بواسطۂ ہو یا بلاواسطہ، سواس آیت میں جب یہ تمامی طُرق وحی ثابت ومعلوم ہیں اور وہ مشبہ بہ ہیں آپ پر نزول وحی کے، تو مطلقاً آپ پر نزولِ وحی ثابت ہو گیا، اور نزولِ وحی مثبت نبوت ہے تو آپ کا نبی ہونا ثابت وظاہر ہے، لہٰذا اہل کتاب کا جو اعتراض تھا، وہ دفع ہو گیا اور آیت کی ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت بھی معلوم ہو گئی، چوں کہ باب کیفیتِ وحی کی بداءت کا تھا اور کیفیت نزول وحی ہی کو آیت میں ذکر کیا گیا ہے، یہ اس تقریر کا اجمال ہے جو میں نے کل کی تھی اور یہ کہا تھا کہ یہ جواب امام رازیؒ کا ہے۔

دو جواب اس کے علاوہ اور ہیں، ایک حافظ ابن حجرؒ کا اور ایک حضرت شیخ الہندؒ کا۔ علامہ ابن حجر کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ ابن حجر عسقلانیؒ حضرت علقمہؒ سے نقل کرتے ہیں — جو بڑے پایہ کے تابعی ہیں — کہ حضرت علقمہ نے اپنے استاذ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ سے دریافت کیا — جو کہ بڑے فقیہ اور محدث اور اجلّہ صحابہؓ میں سے ہیں — کہ اس آیت میں حضور اکرم ﷺ کی وحی کو حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام اور مابعد کے انبیاء کی وحی کے ساتھ کیوں تشبیہ دی گئی ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ نے ارشاد فرمایا کہ اس آیت میں حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام کا اور ان کی وحی کا اختصار کی وجہ سے ذکر نہیں کیا گیا مگر دوسری آیت میں اس کا ذکر ہے کہ ان پر وحی کا نزول مناماً

ہوا تھا، دیکھئے ارشاد باری ہے :اِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَاأَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سٰجِدِيْنَ۝ [یوسف] یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے والد صاحب سے کہا تھا کہ اے والد صاحب! میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کرر ہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کسی سے کہنا مت ۔ چنانچہ وہ خواب صادق ہوا، فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام پر وحی کی ابتداء مناماً ہوئی اور ابتداءً وحی تمام انبیاء پر مناماً ہی ہوتی ہے، چنانچہ آپ پر وحی کا آغاز مناماً ہی ہوا، اور چھے ماہ تک یہ سلسلہ مناماً جاری رہا، آپ پر ۲۳ رسال تک وحی کا نزول ہوا، اور چھے ماہ سال کا آدھا ہوتا ہے، اس طرح مناماً وحی کا زمانہ آپ پر وحی کے نزول کا چھیالیسواں حصہ ہوا، اسی لیے آپ پڑھیں گے کہ مؤمن صالح کا خواب وحی کا چھیالیسواں حصہ ہوتا ہے(۱)۔

غرض آپ کی نبوت ورسالت کی ابتداء وحی منامی سے ہوئی ، اس سے کفار کے اعتراض کا جواب ہو گیا کہ وحی کا نزول کتاب کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مناماً بھی ہوتا ہے۔

یہ جواب حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے (۲) ،جس سے آیت کی مناسبت ترجمۃ الباب کے ساتھ ثابت ہوگئی ،آیت کریمہ﴿ اِنَّآ اَوْحَيْنَا ﴾ کوترجمۃ الباب کے ساتھ کیا مناسبت ہے اس کا تیسرا جواب حضرت شیخ الہند کا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحيِ کا مقصد عظمت وعصمت وطاعتِ وحی کا بیان کرنا ہے اورترجمۂ باب امام

(۱)　صحيح البخاری،عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی الله تعالى عنه،بَابٌ : الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ،رقم الحديث:٦٩٨٧.

(۲)　فتح الباری:ج ۱ ص ۱۱.

بخاریؒ نے جو باندھا ہے، اس کی ماتحت الباب پر صرف دلالت مطابقی ہی مراد نہیں بلکہ دلالت التزامی و تضمنی بھی مراد ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی ایک قسم کی دلالت کا پایا جانا کافی ہے بَابٌ كَيْفَ كَانَ الخ ایک عام عنوان ہے، جس میں بدلالت التزامی مبادی ثلثہٗ وحی، مرسل، رسول، مرسل الیہ، اور مقاصد ثلثہٗ وحی عظمت، عصمت وطاعت وحی کو امام بخاریؒ بیان فرمارہے ہیں (۱) جیسا کہ وحی کے بیان میں گذر چکا، وحی کے مقاصد ثلثہ ہی کو آیت ﴿ اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ ﴾ میں بیان کیا گیا ہے؛ لہٰذا اس آیت کریمہ کی مناسبت ترجمۂ باب سے بدلالت التزامی ثابت ہے۔

آیت کریمہ سے مبادیٔ ثلثہ ومقاصدِ ثلثہ اور وحی کا بیان

اب اس آیت کریمہ سے مقاصد ثلثہ کے ثبوت کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، پہلے مقاصد ثلثہ وحی، عظمت وعصمت وطاعت کے معنیٰ سنئے! عصمت کے معنی ہیں حفاظت عن الخطا کے، حفاظت کے معنی کمی بیشی سے محفوظ رہنا اور طاعت کے معنیٰ ہیں فرماں برداری، کمالِ انقیاد (بہ درجۂ کمال منقاد ہوجانا)۔

اب ان مقاصد ثلثہ کا اس آیت کریمہ سے بیان سنئے! چنانچہ سب سے پہلے لفظ اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ سے اللہ تعالیٰ عظمت وجلالت شان وحی کو بیان فرمارہے ہیں، چوں کہ اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ کے معنیٰ ہیں ''ہم نے وحی بھیجی'' اور ہم کا لفظ جلالت وشوکت کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے، چنانچہ پہلے سلاطین کا دستور تھا کہ وہ اپنے حکم ناموں میں جمع کا صیغہ استعمال کرتے تھے، جیسا کہ ہم حکم فرماتے ہیں، مابدولت می

(۱) الأبواب والتراجم: ص ۱۳.

فرمایند، دیکھئے ”ما“ کا لفظ ہے پھر دولت کا پھر صیغہ جمع، اس سے مقصود اظہارِ جلالت فرمان شاہی ہے، شاہانِ دہلی کے فرامین اٹھا کر دیکھ لیجئے!، اسی عظمت وشان، جاہ وجلال کے الفاظ بصیغۂ جمع ان کے فرامین میں آپ کوملیں گے۔

بیضاوی شریف میں بھی آپ نے پڑھا ہوگا، علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب جمع کا صیغہ فرماتے ہیں، جیسا کہ ”ہم نے نازل کیا“ یا ”ہم نے وحی بھیجی“ تو اس میں ملائک کا شمول مقصود ہوتا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ ملائک کا فعل میرا فعل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم مہتمم صاحب سے آکر شکایت کرے کہ فلاں استاذ صاحب نے مجھے خارج کردیا، اس پر مہتمم صاحب کہتے ہیں: انھوں نے کیا تو سمجھو کہ ہم نے ہی خارج کردیا۔ حالاں کہ اصل خارج کیا مدرس صاحب نے مگر مہتمم صاحب اس کو اپنا فعل ظاہر کررہے ہیں، چوں کہ اس سے مقصود عظمت وقوتِ ادارہ کا اظہار ہے۔

الغرض صیغۂ جمع سے اللہ تعالیٰ یہ ظاہر فرماتے ہیں کہ ملائکہ کا کیا ہوا ہمارا ہی کیا ہوا ہے، اسی اظہارِ عظمت کے قصد سے بعض دفعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ستر، ستر ہزار فرشتے بھیجے گئے، چنانچہ **بسم اللہ الرّحمن الرّحیم** کا نزول ہوا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے دائیں طرف اور ستر ہزار فرشتے بائیں طرف تھے۔ حالاں کہ ضرورت نہ تھی، مگر داب شاہی کے طور پر اظہار عظمت وشوکت، جلالت وصولت کے لئے ایسا فرمایا گیا۔

نیز حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جمع کے صیغے سے کبھی ذات کے ساتھ شمولِ صفات ملحوظ ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس بندۂ خاص پر ہماری خاص توجہات وعنایات مبذول ہیں، اس توجیہ کے مطابق اِنَّآ اَوْحَيْنَآ کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ ہم نے ذاتاً وصفاتاً اس وحی کو نازل کرنے میں آپ پر پوری توجہات وعنایات خاص منعطف فرمادیں، پس لفظِ اِنَّا اور صیغۂ جمع اَوْحَيْنَا

سے عظمت وجلالتِ وحی کا ثبوت ہو گیا، اور جو شئے با عظمت ہو، وہ با عصمت بھی ہوتی ہے، اور جو با عظمت و با عصمت ہو، وہ واجب الطاعت ہے، لہٰذا قطع نظر دوسرے دلائل کے صرف اِنَّآ اَوۡحَيۡنَا سے بھی عظمت وعصمت وطاعت وحی ثابت ہے۔

عصمت وحی پر شیخ الہندؒ کی تحقیق

نیز عصمت وحی کے متعلق حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، سورۃ النجم کی ابتدائی آیات سے استدلال فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمۡ وَمَا غَوٰى ۚ﴿۲﴾﴾ اس میں اللہ تعالیٰ نجم کی قسم کھا کر فرماتے ہیں، اور یہاں قسم بہ منزلہ دلیل ہے اور اس کا مابعد بہ منزلہ دعویٰ ہے، اب نجم کو دیکھئے! اس میں کئی وصف ہوتے ہیں، اس میں نور ہوتا ہے اور وہ ظلمت سے خالی ہوتا ہے، دوسرے ستاروں میں ہر ایک کی ایک مخصوص رفتار ہوتی ہے، تیسرے ہر ستارہ کی ایک منزل طے شدہ ہوتی ہے، جسے وہ بدل نہیں سکتا، چوتھے اس میں جو نور ہوتا ہے، اس میں کمی بیشی نہیں کرتا، ہر ایک کو برابر اپنے نور سے مستفیض کرتا ہے، اور اس طرح تمام مسافر اس کی روشنی میں راستہ پاتے ہیں، اگر ستارہ اپنے افق میں جا کر چھپنے والا ہو تو مسافر اپنی رفتار تیز کر دیتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ غروب ہو جائے اور میرا سفر کھوٹا ہو۔

اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بھی نورِ نجم کی طرح ہے کہ آپ کی ذات میں نورِ ہدایت ہے جس میں کماً کیفاً کبھی بھی کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں ہو سکتا، نیز دیکھو! جب ستارہ افق میں جانے لگتا ہے تو مسافر اپنی رفتار میں منزل کی جانب تیزی اختیار کرتا ہے، ایسے ہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بھی اب افق میں ہے، اور تم اے کفار ومشرکین! ابھی تک ردو انکار، عار وعناد ہی میں مبتلا ہو، اور یہ ستارۂ نبوت غروب ہونے والا ہے، یہ اس کا آخری وقت ہے، لہٰذا تم جلد سے جلد جہالت کی

ظلمتوں سے نکلو! اور اس نورِ نبوت سے ہدایت حاصل کرو، ورنہ یاد رکھو کہ اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا، مگر تم جہالت کی اندھیریوں میں گمراہ بھٹکتے پھروگے اور اس نور ہدایت کے بغیر کبھی منزل حقیقی تک نہیں پہنچ سکو گے، تو اس طرح ﴿وَ النَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ﴾ سے قسم کھا کر اللہ تعالیٰ نے دلیل پہلے بیان فرمادی، اور دعویٰ بعد میں بیان فرمایا۔

اب آگے بطور دعویٰ فرماتے ہیں: مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمۡ وَمَا غَوٰی ۝۲ ''صاحب'' کا لفظ فرما کر ذہن ادھر منتقل کرادیا کہ دیکھئے! یہ نبی محمد ﷺ بچپن سے تمہارے اندر پلے ہیں اور تمہارے ہی اندر آج تک ان کی تمام زندگی گذری ہے، تم خوب جانتے ہو کہ یہ کبھی کسی مکتب میں نہیں پڑھے، کسی ادیب کی مجلس میں نہیں بیٹھے، نہ انھوں نے اہل کتاب میں سے کسی کی ہم نشینی اختیار کی، اُمّی ہیں مگر اس کے باوجود سب اگلے اور پچھلے واقعات کو من وعن بیان کرتے ہیں اور نہایت اعلیٰ تہذیب اور عمدہ اصولِ انسانیت کی تعلیم فرماتے ہیں، انھوں نے نہ کبھی جان کر غلط راہ اختیار کی اور نہ کبھی غلطی سے راہِ حق کو چھوڑا، آپ کی مثال بالکل ستارے کی سی ہے، جیسا کہ وہ کبھی نہ راستہ گم کرتا ہے، نہ اپنے نور میں کمی کرتا ہے، اسی طرح آپ نے بھی کبھی ضلالت اختیار نہیں کی، اور ضلالت تو کیا غوایت بھی نہیں کی، یعنی غلط کو صحیح جان کر بھی اختیار نہیں کیا، اس لیے کہ غوایت کے معنی غلط کو صحیح سمجھ کر اختیار کرنے کے ہیں، اور ضلالت کے معنی غلط راہ کو بغیر صحیح سمجھے اختیار کر لینے کے ہیں، پس مطلب یہ ہوا کہ آپ غلط کو غلط سمجھتے ہوئے بھی کبھی صحیح راستے سے نہیں ہٹے اور غلط کو صحیح جان کر بھی اختیار نہیں کیا تو اس طرح آپ سے نہ کبھی ضلالت ہوئی نہ غوایت، صَاحِبُكُمۡ: تمہارے ساتھ رہنے والا ہے جسے تم خوب جانتے ہو، ﴿وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ۝۳ ﴾ اور نہ کبھی خواہش نفسانی سے کوئی بات کہتا ہے۔

الغرض حق تعالیٰ نے آپ کی عصمت کو بیان کرنے کے لیے تین جملے مَا ضَلَّ ، مَا غَوٰی، مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ارشاد فرمائے ، چوں کہ ضلالت تین قسم پر ہے :(۱) ضلالت فی العلم (۲) ضلالت فی العمل (۳) ضلالت فی الکلام، تو گو یا ان تین جملوں میں اللہ تعالیٰ نے تینوں قسم کی ضلالتوں کی نفی فرما دی، مَا ضَل سے علماً ضلالت کی نفی اور مَا غَوٰی سے عملاً ضلالت کی نفی اور مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی سے کلاماً ضلالت کی نفی مقصود ہے، جس سے ثابت ہوا کہ آپ کی ذاتِ پاک ان تینوں قسم کی ضلالتوں سے پاک اور بالکل منزہ ہے۔

تو گو یا حاصل کلام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ ان میں نہ ضلالت علمیہ ہے، نہ ضلالت عملیہ ہے اور نہ ضلالت کلامیہ ہے، پھر کچھ تو خیال کرو! تم اہل لسان ہو، نبوت کے بعد تو ان میں ضلالت کیا ہوتی، ان کے اندر تو قبل از نبوت بھی ضلالت نہ تھی۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے ماضی کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ کبھی بھی ان سے علماً، عملاً، کلاماً کسی بھی قسم کی ضلالت نہیں ہوئی ، اور اے کفار! تم اس وقت کے متعلق گفتگو کر رہے ہو، ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ نہ ان سے پہلے ضلالت کا صدور ہوا، اور نہ اس وقت ہوا، نہ آئندہ کبھی ہوگا؛ کیوں کہ یَنۡطِقُ مضارع کا صیغہ ہے جو تجدد اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ نہ سابقاً و حالاً ان سے گمراہی ہوئی ، نہ کبھی مستقبل میں ہوگی۔ ﴿اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۝۴﴾ :ان کا علمی، عملی، کلامی سب کا سب حال وحی ہے، خواہش نفسانی سے ان کی کوئی بات نہیں ہے، لہٰذا علماً، عملاً، لساناً جو کچھ بھی آپ سے صادر ہوگا ، وہ سب کا سب وحی ہے، اور جب آپ کا ہر قول و فعل و حال وحی ہے، تو آپ کا ہر قول و فعل و حال واجب الاتباع ہے۔

یہاں تک آپ کا علماً، عملاً، کلاماً و حالاً معصوم ہونا بیان کیا گیا ، آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿ مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝۱۱ ﴾ یعنی ان کا قلب بھی

نہایت درجہ پاک اور منزہ ہے، پس آپ ہر طرح سے نہایت منزہ اور پاک ہیں، لہٰذا آپ کا ظاہرًا وباطناً، قلباً وقولاً وفعلاً وعملاً وحالاً ہر طرح سے معصوم ہونا ثابت ہوگیا، اور جب آپ تمامی احوال میں معصوم ہیں تو اب آپ جو کچھ کریں گے یا کہیں گے یا سمجھیں گے اور سوچیں گے، لامحالہ وہ سب کا سب معصوم ہوگا، لہٰذا ہر قسم کی وحی ہر طرح سے ہمیشہ معصوم ہوگی، خواہ وہ وحی بالا جتہاد ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ وحی اجتہادی کی معصومیت کو پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، یہاں تک وحی اور صاحب وحی کا معصوم ہونا معلوم ہوگیا۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معصومیت پر ایک نظر

اب مزید معصومیت وحی کے اثبات کے لئے قاصدِ وحی یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معصومیت پر بھی ایک نظر ڈالئے، آگے ان کی معصومیت کو حق تعالیٰ ان الفاظ سے بیان فرماتے ہیں:﴿ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ۝۵ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۙ۝۶ ﴾ یعنی ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے، جو بڑا طاقتور ہے، پیدائشی طاقتور ہے، اشارہ ہے کہ اس کی طرف کہ اے کفار ومشرکین! تمہیں معلوم ہے کہ ہم نے پچھلی امتوں کے شہر کے شہر ہلاک کردئے؟ قوم عاد وثمود کے حالات تمہارے علم میں ہیں؟ وہ جبرئیل علیہ السلام ہی تو ہیں جن کے ذریعہ ان قوموں کو ہلاک کیا گیا اور ان کے شہر اور آبادیاں الٹ دی گئیں (چنانچہ ایک روایت میں ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے قوم لوط علیہ السلام کی بستیوں کو جڑ سے اکھاڑ کر آسمان کے قریب ان کو لے جا کر چھوڑ دیا (۱) تو جب ایسی قوت والا فرشتہ ہماری وحی لے کر آپ کے پاس آرہا ہے تو پھر کسی جن یا شیطان کی کیا مجال ہے کہ وہ ان سے وحی کو چھین لے یا کسی قسم کا خیالی تصرف اس

(۱) تفسیر ابن کثیر: ج ۷ ص ۴۸۰.

ہیں کر سکے۔ چوں کہ فرشتہ کی قوتِ تصرف وقوتِ مدافعت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کسی جن وغیرہ کی قوتِ تصرف اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

چنانچہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی (۱) رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، اس کو حضرت عزرائیل علیہ السلام نے آ کر گھور کر دیکھا تو اس سے وہ شخص نہایت متأثر ہوا، اور گھبرا کر شیخ سے عرض کیا کہ میں فلاں جگہ دور مقام پر پہنچنا چاہتا ہوں، شیخ نے اس کو کافی تسلی تشفی دی، مگر آناً فاناً اس کی گھبراہٹ بڑھتی ہی چلی گئی، بالآخر جب اس نے اصرار کیا تو شیخ نے فرمایا کہ اپنی آنکھ بند کر! اس نے آنکھ بند کر لی پھر فرمایا کہ کھولو! اس نے جو آنکھ کھول کر دیکھا تو دیکھا کہ اپنے مطلوب مستقر پر ہے، وہاں جاتے ہی اس کی روح قبض کر لی گئی، چوں کہ اس کی روح کا قبض کیا جانا اسی مقام پر

(۱) شیخ عبد القادر جیلانیؒ: آپ کا نام عبد القادر بن عبد اللہ اور کنیت ابو محمد ہے، آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، عالم اسلام، خصوصًا برصغیر ہند و پاک کا بچہ بچہ آپ کو پیرانِ پیر، پیر دست گیر، غوث پاک جیسے القاب سے یاد کرتا ہے۔ آپ سادات حسینی میں سے ہیں، آپ کا تعارف کرتے ہوئے علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں: **الشيخ، الإمام، العالم، الزاهد، العارف، القدوة، شيخ الإسلام، علم الأولياء، محيي الدين، أبو محمد عبد القادر ابن أبي صالح عبد الله بن جنگي دوست الجيلي، الحنبلي، شيخ بغداد.** ۴۷۰ھ یا ۴۷۱ھ میں جیلان میں پیدا ہوئے جو طبرستان کے ورے ایک موضع ہے اور ۴۸۰ھ میں بغداد آ کر ابوسعید مخرمی، ابن عقیل، ابوالحسین فراء وغیرہ سے علم فقہ حاصل کیا اور اپنے وقت کے محدثین سے علم حدیث میں تبحر حاصل کیا، حنبلی المذہب تھے، ۳۳ سال درس وتدریس اور فقہ وفتاوی میں گذارنے کے بعد خلق خدا کی اصلاح اور صحیح راستہ دکھلانے میں مصروف رہے، آپ بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے، ابو الحسین علی بن محمد کہتے ہیں کہ میں نے شافعی المسلک فقیہ شیخ عبد العزیز بن عبد السلام سے سنا کہ سوائے شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے کسی اور کی کرامات نقل تواتر کے ساتھ ہم نے نہیں سنی۔ آپ سرخیل اولیاء اور تاج الصالحین تھے، آپ کی تصانیف میں غنیۃ الطالبین معروف ہے، آپ نے ۹۰ سال کی عمر پائی اور ۱۰ ربیع الاول ۵۶۱ھ میں وفات پائی اور خلق کثیر نے آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کی اور بغداد کے اندر اپنے مدرسے میں مدفون ہوئے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج ۲۰ ص ۴۳۹)

طے تھا، حضرت عزرائیل علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو یہاں بیٹھا ہوا ہے اور اس کی روح فلاں مقام پر قبض کرنی ہے تو اس پر تصرف کیا، جسے وہ شخص برداشت نہ کرسکا(۱)۔

اب دیکھئے! ملک الموت کی جب اتنی قوت ہے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی قوت تو ان سے بھی کہیں زیادہ اعلیٰ واقویٰ ہے، پھر ان پر کسی جن یا شیطان کا تصرف کس طرح چل سکتا ہے؟، سو جب یہ بیچ کا قاصد ورسول حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی اتنی شدید قوت والا ہے تو اثنائے راہ میں قبل از ابلاغِ وحی الی رسول اللہ ﷺ کسی بھی قسم کا اختلال وحی میں عقلاً محال ہے، نیز یہ جبرئیل علیہ السلام ذاتاً بھی امین ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ [التکویر] تو بالذات بھی بوجہ وصف امانت خود بھی وحی میں کسی قسم کا تصرف ہونا ان کی طرف سے محال ہے، الحاصل مبدأً ومنتہا اور واسطہ ہر سہ لحاظ سے وحی کا ذاتاً وصفاتاً معصوم ہونا محقق وثابت ہو گیا، اور الحمدللہ تعالیٰ کہ اپنے پورے مالہٗ وماعلیہ کے ساتھ بیان کردیا گیا۔

اصل گفتگو آیت کریمہ ﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ﴾ کی ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت کے سلسلے میں چل رہی تھی، اس آیت کریمہ کے اندر مقاصد ثلثۂ وحی عظمت وصفت وطاعت وحی مبادی ثلثہ مرسِل، مرسَل الیہ اور رسول کا بیان کیا گیا ہے۔

اور انھیں مبادی ومقاصد وحی کا بیان کرنا امام بخاریؒ کا بدلالتِ التزامی ترجمۃ الباب سے مقصود تھا، لہٰذا اس تقریر سے آیت کریمہ کی مناسبت ترجمۃ الباب کے ساتھ واضح ہو گئی اور عدم مناسبت کا اشکال بھی رفع ہو گیا، آیت کی ترجمۃ الباب سے مناسبت کے سلسلے میں یہ تین جواب ہوئے: پہلا امام رازیؒ کا، دوسرا حافظ ابن حجر

(۱) بعینہ اسی جیسا واقعہ حضرت سلیمانؑ کے یہاں بھی پیش آیا۔

عسقلانیؒ کا اور تیسرا حضرت شیخ الہندؒ کا، یہ تمام تقریر اس وقت ہے جب کہ یہاں ایک ترجمہ قرار دیں اور آیت ﴿إِنَّآ أَوْحَيْنَآ﴾ کو اس کی دلیل قرار دیا جائے۔

اور اگر آیت کو دوسرا ترجمہ قرار دیں، جیسا کہ امام بخاریؒ کی یہ عادتِ شریفہ ہے کہ بعض بعض جگہ دو دو تین تین ترجمے لاتے ہیں، مثلاً کتاب الایمان میں بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ :بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ وَهُوَ قَوْلٌ وَفِعْلٌ، وَيَزِيدُ وَيَنْقُصُ (۱)، میں ایک ہی جگہ تین ترجمے لائے ہیں جس کی تفصیل اس کے موقع پر ان شاء اللہ کی جائے گی، تو پھر آیتِ کریمہ ﴿ إِنَّآ أَوْحَيْنَآ﴾ سے مستقل دوسرا ترجمہ باب ہوگا، جس میں بطریق دعویٰ آپ کی وحی کو نوح علیہ الصلوۃ والسلام اور مابعد نوح علیہ الصلوۃ والسلام کے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی وحیوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح ان انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام پر مختلف طرق کے ساتھ وحی کا نزول ہوا ہے (۲) اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی نزول وحی ہوا ہے، اس میں آپ پر بداءتِ وحی کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے بطریق تشبیہ ایک خاص لطیف وعجیب طریق پر ترجمۃ الباب بطور دعویٰ کے قائم فرمایا ہے، جو دعویٰ ہونے کے ساتھ ساتھ ثبوتِ دعویٰ پر خود ہی دلیل وشہادت بھی ہے، تو یہاں امام بخاریؒ حسبِ قاعدہ إِذَا الشَّيْءُ إِذَا ثَبَتَ ثَبَتَ بِلَوَازِمِهِ ترجمہ باب قائم فرمایا ہے۔

آیت کریمہ پر ایک اشکال اور اس کا جواب

اب یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ آیت کریمہ میں نوح علیہ الصلوۃ والسلام اور مابعد کے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی وحی کے ساتھ ہی آپ کی وحی کو

(۱) صحیح البخاری، ج ۱ ص ۵، کتاب الإیمان.
(۲) فتح الباری، ج ۱ ص ۱۱.

تشبیہ کیوں دی گئی؟ جب کہ حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے قبل بھی بہت سے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام آئے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے قبل وحی زیادہ تر معاش سے متعلق تھی اور نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے آں حضرت ﷺ تک دوسری قسم یعنی معاد سے متعلق تھی جس میں انذار وتبشیر تھا، چوں کہ یہ زمانۂ کفر کا تھا، چنانچہ حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام سے حضرت شیث وحضرت ادریس علیہما الصلوۃ والسلام وغیرہ حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے قبل انبیاء کے ذریعہ تعمیر عالم مقصود تھی، جیسے کسی مقام پر سکونت کے لیے ضروریات زندگی کے واسطے قیام گاہ کے مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بعد اس میں دیگر لوازمات زندگی کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہی صورت اس عالم کی قیام گاہ کے متعلق کی گئی کہ اولاً اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو آباد کرنے کا سامان فرمایا، احکام اس وقت اختصاراً ثانیاً وبالعرض رکھے، زراعت، خیاطت، کتابت وغیرہ کا نشوونما کیا جاتا رہا۔

چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کو جنت سے بھیجا گیا تو تمام مزروعات کے بیج عطا کیے گئے، یہاں آکر زراعت کرنے کا طریقہ سکھلایا گیا، اسی طرح تعمیر عالم ہوتی رہی اور نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے قبل ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ [البقرة: ۲۱۳] کا زمانہ رہا، حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے میں نشوونما کے بعد اختلاف ونزاع ہونے لگا، اس کے مٹانے کے لیے احکام کی تعلیم شروع ہوئی، چنانچہ پہلے بچے کو پالتے ہیں، جب جوان ہوجاتا ہے تو اس کو پڑھایا جاتا ہے، مکلف بنا کر کام میں لگایا جاتا ہے (۱)۔

اسی طرح عالَم ایک شخص اکبر ہے جس میں طفولیت، شباب اور شیخوخت

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فیض الباری ۱: ۷۔

ہے، حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے قبل کا زمانہ طفولیت کا زمانہ ہے اور حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام تک شباب کا زمانہ ہے اور حضرت ابراہیمعلیہ الصلوۃ والسلام سے حضور اکرم ﷺ تک شیخوخت کا زمانہ ہے۔ جب عالم بلوغ کو پہنچ گیا تو اس کے مکلف ہونے کا وقت آ گیا جو حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے شروع ہوتا ہے؛ اس لیے فرمایا: ﴿ اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ۚ ﴾ [النساء: ۱۶۳] کہ جس قسم کی وحی تکلیفاتِ شرعیہ کی آئی، ایسی ہی آپ پر آئی ہے، اس نزول وحی کے مختلف طرق ہیں، جو حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے لے کر آپ کے زمانے تک عمل میں آئے، کبھی مناماً، کبھی کتاباً، کبھی بواسطۂ ملک ، کبھی باسماعِ کلام، کبھی تبشیراً، کبھی انذاراً، چنانچہ ﴿ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۚ﴾ [النساء] میں وحی بالکتاب کا ذکر ہے اور ﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا ۚ﴾ [النساء] میں وحی بالکلام ہے، ﴿ اِنِّىۡۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَيۡكَ ۚ﴾ [طٰهٰ: ۱۲] میں باسماع کلام ہے، ﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ ﴾ [النساء : ۱۶۵] میں تبشیر وانذار ہے، غرض اس رکوع میں تمام اقسام وحی مذکور ہیں، اس لیے امام بخاریؒ نے اس رکوع کو ذکر کے ساتھ مخصوص کیا۔

الحاصل ترجمۃ الباب قائم فرما کر اب امام بخاریؒ آگے احادیثِ ستہ کو مستقل استشہاداً ثبوت میں لارہے ہیں، جن میں سب سے پہلے إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ والی حدیث ہے، اس کے اندر چند مباحث ہیں، جوان شاء اللہ کل عرض کیے جائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

الدرس الثامن

حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیّاتِ

۱ - حَدَّثَنَا الحُمَيْدِيُّ قَالَ :حَدَّثنا سُفْيَانُ، قَالَ :حَدَّثَنا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الأَنْصَارِيُّ، قَالَ :أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيُّ، أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ، يَقُولُ :سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى المِنْبَرِ قَالَ :سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ :إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَالِامْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا، أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ.

اس حدیث کی قرأت کے بعد فرمایا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کیفیت بداء وحی کا باب قائم فرمایا، اوراس کیفیت بداءت وحی کے سلسلے میں سب سے پہلے آیت لائے ،جس کی مفصل تقریر گذر چکی، اس کے بعد اس حدیث مسند کو لائے ہیں، یہ حدیث ”إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ اہم احادیث میں سے ہے، اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس حدیث سے اجمع ، انفع ، اغنیٰ کوئی حدیث نہیں (۱) ، اجمع اس لیے کہ بعض فقہاء نے اس سے ایک سو مسائل مستنبط کیے ہیں ، اور انفع اس لیے کہ دین ودنیا کے اعمال کا مدار خلوص پر ہے اور اس میں اسی کو بیان کیا گیا ہے، اور اغنیٰ اس لیے کہ یہ حدیث سب سے زیادہ کار آمد ہے، چنانچہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چار حدیث ایسی ہیں کہ جن پر اسلام کا دارومدار ہے،:ایک یہی ”إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ والی، دوسری الحلالُ بَيِّنٌ،

(۱) فتح الباری، ج ۱ ص ۱۱ .

وَالحَرَامُ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا أُمُورٌ مُشْتَبِهَة (۱) ،تیسری حدیث مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ (۲) چوتھی حدیث لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ (۳) اور بعض لوگوں نے چوتھی حدیث یہ ذکر کی ہے:ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّك اللهُ وَازْهَدْ فِيمَا فِي أَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّك النَّاسُ (۴) شمار کیا ہے(۵)(۶)۔

امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ یہ حدیث ثلث اسلام ہے(۷)اور یہ بھی منقول ہے کہ نصف دین ہے(۸) پہلے قول کی توضیح یہ ہے کہ علامہ بدرالدین عینیؒ شارح بخاری فرماتے ہیں کہ اسلام کا مدار تین چیزوں پر ہے، تصدیق بالجنان، اقرار باللسان، عمل بالارکان، اورتصدیق بالجنان ہی کا نام نیت ہے(۹) اور دوسرے

(۱)صحیح البخاری،عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ،بَابٌ :الحَلاَلُ بَيِّنٌ، وَالحَرَامُ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ،رقم الحدیث: ۲۰۵۱.

(۲) سنن الترمذی،عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ تعالی عنہ،ابو اب الزهد،رقم الحدیث :۲۳۱۷.

(۳)صحیح البخاری،عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تعالی عَنْهُ،بَابٌ :مِنَ الإِيمَانِ أَنْ يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ،رقم الحدیث:۱۳ .

(۴)سنن ابن ماجة،عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ ضی الله تعالی عنہ،باب الزهد في الدنيا،رقم الحدیث :۴۱۰۲.

(۵) عمدة القاری،ج ۱ ص ۵۹.

(۶) حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ نے درسِ بخاری میں اوراسی طرح اوجز المسالک جلدسادس میں تحریرفرمایا ہے کہ امام ابوداودؒ کی بعینہ ان احادیث کاانتخاب ان سے پہلے امام اعظم ابوحنیفہؒ کر چکے ہیں،البتہ امام اعظمؒ نےان چار کے علاوہ ایک اورمزید حدیث کا بھی انتخاب فرمایا ہے؛لہٰذا کل پانچ ہوئیں اوروہ یہ ہے :الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ (صحیح البخاری، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا،رقم الحدیث:۱۰)،حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ یہ بھی فرماتے تھے کہ اس پانچویں حدیث کوغالباً امام ابوداودؒ نےاس لیےنہیں لیا کہ اس کامضمون اورمعنی حدیث ۳ سے مستفادہورہاہے۔(الدر المنضود علی شرح سنن أبی داود: ۳۸/۱)

(۷)مرقاة المفاتیح شرح مشكاة المصابیح: ۴۳/۱.

(۸) أیضًا.

(۹)عمدة القاری،ج ۱ ص ۵۹.

قول کی توضیح یہ ہے کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو عبودیت قلب سے ہو، اور دوسرے وہ جو عبودیت قالب سے ہو، اور عبودیتِ قلب ہی کا نام نیت ہے (۱) اس حدیث شریف کے اندر چند بحثیں ہیں۔

حدیث إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ پر بیس بحثیں

(۱) امام بخاریؒ نے بصیغۂ حدثنا روایت کیوں شروع فرمائی (۲) تحدیث کس کو کہتے ہیں (۳) بیانِ احادیث میں کن کن الفاظ کے ساتھ روایت کی جاتی ہے (۴) جن الفاظ کا استعمال بیانِ احادیث میں ہوتا ہے، کیا ان کو تحقیقاً بھی ذکر کر سکتے ہیں (۵) تحقیقاً بیان کرنے کی کیا کیا صورتیں ہیں (۶) امام بخاریؒ اپنے استاد حمیدیؒ ہی کی روایت کو اس جگہ کیوں لائے، جب کہ ان کے اور بھی اساتذہ ہیں (۷) سفیان دو ہیں : سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ، یہاں کون سے مراد ہیں (۸) علقمہ تابعی ہیں یا صحابی (۹) یقول مضارع حال پر دلالت کرتا ہے، اور سمعت ماضی پر دلالت کرتا ہے، ان دونوں کو کیسے جمع کیا؟ یہ تو اجتماع ضدین ہے (۱۰) علی المنبر کا اضافہ کیوں کیا گیا ہے (۱۱) اِنَّمَا تاکید کے لیے ہے یا حصر کے لیے (۱۲) لفظ اِنَّمَا بسیط ہے یا مرکب (۱۳) اعمال کیوں فرمایا گیا، افعال کیوں نہیں فرمایا (۱۴) نیات جمع کے صیغے کے ساتھ کیوں لائے، جب کہ بصیغۂ واحد بالنیت بھی یہ حدیث مروی ہے، اور نیت کی لغوی واصطلاحی کیا تعریف کیا ہے (۱۵) إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ کے بعد وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوى کیوں فرمایا گیا (۱۶) اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مختصراً کیوں بیان فرمایا جب کہ حدیث مفصل ہے، اس کا ایک حصہ کیوں ذکر فرمایا اور ایک کیوں ترک فرمایا (۱۷) إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا جب کہ پہلے لفظ إِلَى

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح: ۱/۴۳.

دُنْيَا يُصِيبُهَا، میں داخل ہے، تو پھر اس کو خاص طور پر کیوں ذکر فرمایا، ذکر خاص بعد العام کی کیا وجہ ہے (۱۸) ہجرت کی حقیقت کیا ہے (۱۹) اس حدیث کی تخریج کس کس نے کی ہے (۲۰) اس حدیث کو ترجمۃ الباب کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اب ان مباحث کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

پہلی بحث یہ تھی کہ امام بخاریؒ نے بصیغۂ حَدَّثَنَا روایت کیوں شروع فرمائی؟ سواس کا جواب یہ ہے کہ روایت حدیث کے اندر مختلف الفاظ اختیار کیے جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں : **حدثنا، أخبرنا، أنبأنا، حدثني، أخبرني، أنبأني، قرأتُ، قال لي، قال فلان، ذكر لي فلان، ذكر فلان، روىٰ لي فلان، روىٰ فلان، كتب إليّٰ فلان، كتب فلان عن فلان، سمعت فلاناً** وغیرہ۔

یہاں امام بخاریؒ نے تحدیث کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، تحدیث کے معنیٰ لغت میں بات کرنے کے آتے ہیں، چاہے استاذ شاگرد سے بات کرے یا شاگرد استاذ سے، یا کوئی بھی شخص کسی دوسرے سے بات کرے، اس کو لغت میں تحدیث کہتے ہیں، اور اصطلاحِ محدثین میں **قرأة الشيخ على التلميذ** کو تحدیث کہتے ہیں، **أنبأ، مناولة الشيخ للتلامذة** کو کہتے ہیں یعنی شیخ اپنی کتاب دے کر روایت کی اجازت سے دے، حدثنا متعدد تلامذہ کی صورت میں اور حدثني ایک تلمیذ کی صورت میں کہتے ہیں، اسی طرح أخبرنا وغیرہ کو قیاس کیا جائے۔

سمعت : اگر شیخ سے سننے کی صورت ہو تو سمعت فلاناً کہتے ہیں، یہ الفاظ اتصال سند پر نص ہوتے ہیں، یعنی شیخ اور تلامذہ کے درمیان کوئی فاصلہ راوی کا نہیں ہے، ان الفاظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک نے دوسرے سے ملاقات کی ہے، البتہ جب روایت بہ لفظ عَنْ اور قال ہوتی ہے، جیسے : عن فلان اس کو مُعَنْعَنْ کہتے ہیں، یہ اتصال پر نص نہیں ہوتی، ممکن ہے کہ جن سے روایت کی ہے ان سے خود سنا ہو یا خود نہ سنا ہو، اسی طرح قال بھی اتصال پر نص نہیں (۱)۔

(۱) نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر ص ۹۶، ۹۷.

یہاں امام بخاریؒ نے حدثنا کے ساتھ حدیث کی روایت کی، کیوں کہ امام بخاریؒ کے نزدیک صحتِ سند کے لیے اتصال ضروری ہے، یعنی شیخ اور تلمیذ میں لقا ہونا، گو امام مسلمؒ امکانِ لقا ہی پر متصل قرار دیتے ہیں (۱)، حدثنا بفتح ثاء ہے، حمیدی حدثنا کا فاعل ہے، اس کے بعد قال محذوف نکال کر اس طرح پڑھا جائے گا: قال حدثنا سفیان ان جگہوں میں قال پڑھا جاتا ہے، لکھا نہیں جاتا ہے (۲)

الحاصل یہاں امام بخاریؒ نے تحدیث کا صیغہ لاکر یہ بتلادیا کہ ہمارے استاذ حدیث کی روایت فرما رہے تھے اور ہم سن رہے تھے کہ اور صیغہ جمع سے یہ بتلا دیا کہ اس حدیث کو اپنے استاذ سے سننے والا صرف میں تنہا نہیں تھا بلکہ میرے ساتھ اور بھی بہت سے تلامذہ تھے۔

اس حدیث کی سند میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالی عنہ سے لے کر یحییٰ بن سعید تک تفرد ہے اور یحییٰ بن سعیدؒ کے بعد تفرد نہیں ہے، چوں کہ سب نے حدثنا جمع کا صیغہ بیانِ حدیث کے وقت استعمال کیا ہے، اسی لیے شراحِ بخاری فرماتے ہیں کہ سفیانؒ سے اوپر تلامذہ کی تعداد ڈھائی سو، تین سو بلکہ سات سو رہی

---

(۱) وَجَائِزٌ أَنْ يَكُونَ الْحَدِيثُ الَّذِي رَوَى الرَّاوِي عَمَّنْ رَوَى عَنْهُ قَدْ سَمِعَهُ مِنْهُ وَشَافَهَهُ بِهِ غَيْرَ أَنَّهُ لَا نَعْلَمُ لَهُ مِنْهُ سَمَاعًا، وَلَمْ نَجِدْ فِي شَيْءٍ مِنَ الرِّوَايَاتِ أَنَّهُمَا الْتَقَيَا قَطُّالخ (مقدمة صحيح مسلم، ج ١ ص ٢١، مقدمة ابن الصلاح ص ٥٦.)

(۲) حضرت صاحبِ درس کے سامنے موجود نسخے میں الحمیدی کے بعد قال مذکور نہیں ہوگا، اس لیے حضرت نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے، ورنہ موجودہ نسخوں میں اس مقام میں قال موجود ہوتا ہے۔ یہاں طلبۂ عزیز کے لیے ایک اور بات بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں جہاں "حدثنا یا أخبرنا" آجائے، وہاں اس سے پہلے وَبِهِ قَالَ پڑھا جاتا ہے جو "بالسند المتصل منا إلى الإمام الهمام الحافظ الحجة أمير المؤمنين في الحديث محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة الجعفي البخاري قال" کا مخفف ہے، بہتر یہ ہے کہ جب سبق شروع ہو تو ایک مرتبہ یہ پوری عبارت پڑھی جائے، اس کے بعد ہر حدیث میں "وَبِهِ قَالَ" پر اکتفا کیا جائے۔ (اشرف الباری، مصنفہ : مولانا محمد منیر احمد منور صاحب)

ہے، امام بخاریؒ بھی فرماتے ہیں کہ ہم ڈھائی سو تین سو کی تعداد میں تھے(۱)۔

نیز امام بخاریؒ کے **حدثنا** فرمانے میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ میں نے اس حدیث کو اپنے استاذ حمیدیؒ سے لقاءً سنا ہے، جیسا کہ میرا اصول ہے کہ راوی کی لقاء اپنے استاذ سے بوقت سماعت حدیث ضروری ہے، لہٰذا اس سے ثابت ہو گیا کہ حدیث کی سند متصل ہے۔

الحاصل اس تقریر سے امام بخاریؒ کے بصیغۂ جمع لفظ **حدثنا** کے ساتھ روایت بیان کرنے کی حکمت ظاہر ہو گئی۔

اب یہ بحث ہے کہ روایت حدیث کے لیے جن جن الفاظ کو بطور اصطلاح کے استعمال کیا جاتا ہے، کیا ان کو تخفیفاً بھی لکھا جا سکتا ہے؟ اور تخفیفاً ذکر کرنے کی صورت میں کس لفظ کے لیے کیا اصطلاح مقرر ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ان صیغوں کو تخفیفاً لکھنا بھی محدثین کے نزدیک درست ہے، چنانچہ جب سند میں نا یا ثنا آتا ہے تو حدثنا کا مخفف ہوتا ہے اور أنا، أخبرنا کا اور ثنی، حدثنی کا مخفف ہوتا ہے۔

اب یہ بحث ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنے استاذ حمیدیؒ کی روایت کو مقدم کیوں فرمایا جب کہ امام بخاریؒ کے دوسرے بھی ان کے علاوہ اساتذہ ہیں؟ حمیدیؒ کی حدیث کی وجہ ترجیح کیا ہے؟ سو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حمیدیؒ مکی ہیں اور خاندانِ قریش سے ہیں، چوں کہ بداءتِ وحی بھی مکہ ہی سے ہوئی ہے، اس لیے مکی راوی کی روایت کے ساتھ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کی ابتداء فرمائی، نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان سے ہونا بھی تقدیم کو مقتضی ہے، اس لیے حدیث بیان کرتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرب ہوتا ہے اور قربِ نبی قرأت نبی کی رعایت کو چاہتا ہے، اس لیے قریشی راوی کی روایت کو مقدم کیا۔

(۱) فتح الباری، ج ۱ ص ۱۴.

دوسری حدیث امام بخاریؒ امام مالک کی لائے ہیں جو اہل مدینہ سے ہیں، چوں کہ بداءتِ وحی مکہ سے ہوئی ہے اور وحی کا نشر وشیوع مدینہ میں سے ہوا ہے، چوں کہ مکہ میں رکاوٹوں کی وجہ سے پوری طرح نشر واشاعت نہ ہوسکی اور مدینہ میں آنے کے بعد اطراف واکناف میں خوب نشر واشاعت ہوئی، لہٰذا پہلے امام بخاریؒ نے اہل مکہ سے رایت کو ذکر فرمایا اور اس کے بعد اہل مدینہ کی روایت کو لائے تا کہ وحی کے ابتدائے نزول وابتدائے نشر دونوں کی طرف اشارہ ہوجائے (۱)۔

اس کے بعد یہ بحث تھی کہ یہاں سفیان سے کون سے سفیان مراد ہیں؟ چوں کہ سفیان دو ہیں: سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہؒ، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں سفیان بن عیینہؒ مراد ہیں، چوں کہ حمیدیؒ کے استاد یہی سفیان ہیں، یہ سفیان بھی مکی ہیں اور نہایت جلیل القدر تبع تابعین میں سے ہیں، امام شافعیؒ کے اساتذہ میں سے ہیں، ان کی وفات ۱۹۸ھ میں ہو (۲)۔

اس کے بعد حضرت علقمہؒ کے متعلق بحث تھی کہ یہ صحابی ہیں یا تابعی؟ تو ان کے بارے میں اختلاف ہے، بعض حضرات ان کو صحابی کہتے ہیں، اور بعض حضرات تابعی کہتے ہیں، اور ابوعمرو بن مندہؒ اور صاحب مشکوٰۃ حضرت خطیب تبریزیؒ نے ان کو صحابی قرار دیا ہے، چنانچہ صاحبِ مشکوٰۃ اِکمال میں ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ علقمہ بن وقاص لیثی حضور اکرم ﷺ کے عہد میں پیدا ہوئے، غزوہ خندق میں شریک رہے اور عبدالملک بن مروان کے زمانے میں مدینہ طیبہ میں ان کی وفات ہوئی، ان کے پوتے عمر اور محمد بن ابراہیم لیثی نے ان سے روایت کی ہے و(۳)۔

---

(۱)　فتح الباری، ج ۱ ص ۱۲.

(۲)　عمدة القاری، ج ۱ ص ۵۲.

(۳)　فتح الباری، ج ۱ ص ۱۲.

اس کے بعد یہ بحث تھی کہسمعت ماضی کا صیغہ ہےاور یقول مضارع کا جو کہ حال واستقبال پر دلالت کرتا ہے، ان دونوں کو کیسے جمع کیا گیا؟ یہ تواجتماعِ ضدین ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ کبھی زمانۂ ماضی کی بات کوبھی فعل مضارع سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں، تاکہ زمانۂ ماضی کا حال کے اندر استحضار کیا جائے (۱) اس سے یہ بتلانا مقصود ہوتا ہے کہ جو بات میں زمانۂ ماضی کی کہہ رہا ہوں وہ ایسی مضبوط ومحفوظ ہے جیسا کہ ابھی میرے سامنے ہورہی ہے توحضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے ماضی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث سنی تھی، اس کے بالکل محفوظ ہونے کے اظہار کی خاطر بہ جائے قال کے یقول فرمادیا اس تقریر سے سمعت اور یقول کے صیغوں کے اجتماع کی حکمت بھی معلوم ہوگئی، اور تضاد کا اشکال بھی رفع ہوگیا(۱)۔

اب یہ بحث ہے کہ حضرت علقمہؒ بن وقاص لیثی نے علی المنبر کا اضافہ کیوں فرمایا؟اس میں کیا حکمت ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علقمہؒ علی المنبر فرما کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ سماعتِ روایت کے ساتھ ساتھ حضرت فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کی رویتِ بصری بھی ان کے منبر پر ہونے کی وجہ سے مجھے بہ خوبی ہورہی تھی، میں نے آپ کی صوت کی سماعت کے ساتھ ساتھ آپ کی صورت اور ہیئتِ بیان کو بھی دیکھا ہے،جس سے کہ معنی کی حقیقت اوراس کی معرفت اور منشا کو پہنچنا اوراخذ کرنا مثل بداہت کے ہوجاتا ہے، نیز امام بخاریؒ کے اصول کے مطابق سماع برویت ولقاء کی طرف بھی اشارہ ثابت ہورہا ہے، نیز برفع احتمال بعید یہ بتلانا بھی مقصود ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ رفع صوت کی صفت کے ساتھ متصف ہونے کے ساتھ ساتھ چوں کہ ممبر پرتشریف فرما تھے، اس لیے

---

(۱) ملاحظه هو: دروس البلاغة، ص/ ٦٥.

(۲) إرشاد الساري، ١/ ٥٢.

آواز پوری طرح صاف سنی جارہی تھی جس سے مجھے بعینہٖ آپ کے وہ الفاظ جن کو آپ روایت فرما رہے تھے، سنائی دے رہے تھے اور انھیں الفاظ کو بعینہٖ میں روایت کررہا ہوں، اس طرح لفظ **علی المنبر** کے اضافے سے روایت کی کامل توثیق ہوگئی، یہ فوائد ہیں علی المنبر کے اضافے میں۔

لفظ اِنَّمَا کی بحث

اب اس کے بعد اِنَّمَا کی بحث ہے کہ لفظ اِنَّمَا تاکید کے لیے ہے یا حصر کے لیے؟ مرکب ہے یا بسیط؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ اِنَّمَا بالاجماع تاکید وتحقیق کے لیے آتا ہے اور حصر کے لیے بھی آتا ہے، اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مذکور کے لیے اثبات ہے اور غیر مذکور کے لیے نفی، اس کے بعد اس میں کلام ہے کہ یہ حصر کے معنیٰ حقیقتاً ہیں یا مجازاً، منطوقاً ہیں یا اشارۃً؟ علمائے جمہور کے نزدیک اِنَّمَا حصر کے لیے حقیقتاً ہی ہے، اور ابن عتبہ معاصر علامہ تفتازانی کی رائے یہ ہے کہ اِنَّمَا کی اصل وضع تاکید کے لیے ہے، کبھی بقرینہ مقام حصر کے لیے بھی آجاتا ہے۔

دوسرا کلام اِنَّمَا میں ہے کہ یہ مرکب ہے یا بسیط؟ علامہ سکاکیؒ — جو علم بلاغت کے امام ہیں وہ — فرماتے ہیں کہ اِنَّمَا "اِنَّ" اور "مَا" سے مرکب ہے، اس قول کے اعتبار سے کلمہ اِنَّمَا باعتبار اپنے مدلول ومنطوق کے تاکید در تاکید کے لیے ہے اور بعض منطقیوں نے اس "ما" کو مائے نافیہ قرار دیا ہے، مگر اس صورت میں ایک ہی کلمہ میں اثبات ونفی کا اجتماع ضدین ہونا لازم آوے گا جو کہ محال ہے، نیز مَا نافیہ صدارتِ کلام کو مقتضی ہے، لہٰذا یہی کہا جاوے گا کہ یہ تاکید در تاکید کے لیے ہے، کبھی حصر کے لیے، کبھی غیر حصر کے لیے (۱)۔

(۱) فتح الباری، ج ۱ ص ۱۵، ۱۴.

اعمال وافعال میں کیا فرق ہے

اس کے بعد یہ بحث ہے کہ حدیث میں اعمال کیوں فرمایا، افعال کیوں نہیں فرمایا؟ اعمال اور افعال میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فعل اور عمل میں یہ فرق ہے کہ عمل میں قصد وارادہ کو دخل ہوتا ہے، چوں کہ اس کا صدور قصد اور ارادہ ہی سے ہوتا ہے اور فعل عام ہے، اس کے لیے قصد وارادہ شرط نہیں (۱)، چنانچہ مثال کے طور پر ایک شخص نے بندوق چلائی، کسی کے مارنے کا اس کا ارادہ نہیں تھا لیکن اتفاق سے گولی کسی آدمی کو لگ گئی اور وہ مر گیا تو یہ فعل ہوا عمل نہیں ہوا، چوں کہ اس شخص کو مارنے کا اس کا قصد وارادہ نہیں تھا۔

الحاصل عمل اختیار کو مقتضی ہے اور فعل بلا اختیار بھی ہوتا ہے، اور گفتگو حدیث شریف میں انسانی اعمال سے ہے، چوں کہ انسان اختیاری امور ہی کا مکلف ہوتا ہے جن کو اعمال کہا جاتا ہے، غیر اختیاری امور کا بندہ مکلف نہیں ہوتا، اور بیان اعمال اختیاریہ ہی کا مقصود ہے؛ اس لیے بہ جائے افعال کے حدیث شریف میں اعمال فرمایا گیا۔

خود نیت کا لفظ بھی اس کو بتلا رہا ہے، چوں کہ حدیث شریف میں نیت پر اعمال کو موقوف فرمایا ہے اور نیت قصد کو کہتے ہیں اور قصد کا تعلق اعمال سے ہے، لہٰذا افعال کے بہ جائے اعمال فرمایا۔ چوں کہ اگر افعال فرماتے تو نیت کے ساتھ اس کا جوڑ نہ ہوتا، اس لیے فعل کا مدار نیت پر نہیں؛ اس کا صدور بلا نیت وقصد بھی ہوتا ہے (۲)۔

دوسری وجہ بہ جائے افعال کے اعمال فرمانے کی یہ بھی ہے کہ عمل مادہ ع،

(۱) إرشاد الساری، ۱/۵۴.
(۲) فیض الباری، ۱/۸۱.

م اور ل ہے اور یہی حروف علم کا بھی مادہ ہیں، اس میں اس کی طرف اشارہ ہو گیا کہ صحیح اور مقبول عمل وہی ہوتا ہے جو علم کے ساتھ ہو، بلاعلم کے یا تو عمل کا صدور ہی نہ ہوگا اور اگر صدور ہوگا تو وہ غیر صحیح و نامقبول ہوگا، اس لیے بھی بہ جائے افعال کے اعمال فرمایا گیا، ان کے علاوہ اور بھی چند وجوہات بہ جائے افعال کے اعمال فرمانے کی ہیں جو ان شاء اللہ العزیز کل عرض کی جائیں گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

الدرس التاسع

لفظ اعمال اختیار کرنے کی وجوہ

قرآتِ حدیث کی سماعت کے بعد فرمایا کہ لفظ اعمال کے متعلق بحث چل رہی تھی کہ بہ جائے افعال کے اعمال کیوں فرمایا گیا؟ اس کی کل چند وجوہ بیان کی گئی تھیں اور فعل اور عمل کے فرق کو بھی واضح کیا گیا تھا، اس سلسلے میں عرض کیا گیا تھا کہ فعل کے لیے قصد واختیار شرط نہیں ہے، اس لیے ارادی، غیر ارادی، اختیاری، غیر اختیاری ہر قسم کے افعال پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، برخلاف عمل کے کہ اس میں ارادہ ونیت کو دخل ہے، بلا نیت وارادہ کے جو عمل صادر ہو، اس کو عمل نہیں کہا جاتا اور اس حدیث میں انھیں کاموں کو بیان کرنا مقصود ہے جن کا تعلق نیت سے ہوتا ہے، لہٰذا اگر بہ جائے اعمال کے افعال فرماتے تو نیت کے ساتھ اس کا جوڑ صحیح نہ ہوتا، اب آج ان وجوہِ مذکورہ کے علاوہ لفظ اعمال کی ترجیح کی دوسری وجوہ ذکر کی جاتی ہیں۔

سو! من جملہ اور وجوہ کے ایک تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ عمل دوام واستمرار کو مقتضی ہے اور فعل میں دوام واستمرار ضروری نہیں (۱)، چنانچہ ناغہ کے ساتھ بھی اس کا صدور ہوتا ہے کہ ایک کام کو کبھی کیا، کبھی نہ کیا اس کو فعل کہا جاتا ہے، برخلاف عمل کے کہ اس کے لیے دوام واستمرار عرفاً بھی لازم ہے اور شرعاً بھی لازم ہے۔

چنانچہ دیکھ لیجئے! اس عالِم کو عرف میں باعمل نہیں کہا جاتا جو کہیں شریعت کے مطابق چلے اور کہیں شریعت کو چھوڑ کر اپنی طبیعت اور ہوائے نفس کی موافقت کرے، عالم باعمل عرف عام میں اسی عالم کو کہا جاتا ہے جو ہمیشہ شریعت کی پابندی

(۱) فیض الباری، ۱/۱۸.

کرے، شریعت کو چھوڑ کر ہوائے نفسانی کی اتباع نہ کرے، حرص وطمع، غضب وغصہ پر غالب رہے، صبر واستقلال، ہمت وحوصلہ کے ساتھ سنت نبوی پر جمار ہے، دوسرے احباب اعزہ واقرباء، کنبہ وبرادری، اہل ثروت ودولت، یا صاحب منصب وحکومت کسی سے بھی طریق سنت کے مقابلے میں مرعوب ومغلوب نہ ہو۔

اسی طرح ایک دوسری موٹی سی مثال سے یوں سمجھ لیجئے کہ جو شخص کبھی نماز پڑھنے لگتا ہے اور کبھی چھوڑ دیتا ہے، ہمیشہ نماز کی پابندی نہیں کرتا، عرف عام میں لوگ اس کو نمازی نہیں کہتے، نمازی اسی کو کہا جاتا ہے جو ہمیشہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتا ہو، اسی پر دوسرے اعمال کو بھی قیاس کر لیجئے، پس اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ عرفِ عام میں عمل اسی کو کہا جاتا ہے جس پر مداومت کی جائے۔

اسی طرح شریعت میں بھی دیکھ لیجئے، حدیث شریف میں ہے: خَيْرُ الْعَمَلِ أَدْوَمُهُ، وَإِنْ قَلَّ (۱) یعنی وہی عمل بہتر اور پسندیدہ ہے جس پر صاحب عمل مداومت کرے، اگر چہ وہ قلیل ہی ہو، ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے: إِنَّ أَحَبَّ الأَعْمَالِ إِلَى اللهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ (۲) یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ اعمال سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں جن پر مداومت کی جائے، اسی طرح قرآن پاک میں ارشاد ہے: إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿۲۲﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿۲۳﴾ اس آیت میں نماز پر مداومت کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے۔

الحاصل ان احادیث اور آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ شریعت میں عمل پر دوام واستمرار محبوب ومطلوب ہے اور دوام واستمرار پر دلالت کرنے والا لفظ عمل ہے؛ لہٰذا حدیث شریف میں بہ جائے افعال کے اعمال فرمایا گیا، تاکہ اس

(۱) سنن ابن ماجة، ص ۳۱۰، عن أبي هريرة رضى الله تعالى عنه، أبواب الزهد، باب المداومة على العمل، رقم الحديث: ۴۲۴۰.

(۲) صحيح البخارى، عَنْ عَائِشَةَ رضى الله تعالى عنها، بَابُ القَصْدِ وَالمُدَاوَمَةِ عَلَى العَمَلِ، رقم الحديث: ۶۴۶۴.

حدیث سے عمل پر دوام واستمرار کی ضرورت واہمیت بھی ظاہر ہوجائے۔

نیز علاوہ ان مذکورہ وجوہ کے ایک چوتھی وجہ لفظ اعمال فرمانے کی یہ بھی ہے کہ فعل قول کے مقابل استعمال ہوتا ہے، تو اگر بہ جائے اعمال کے افعال فرمایا جاتا تو مطلب حدیث شریف کا یہ ہوتا کہ صرف جوارح سے تعلق رکھنے والے افعال کا تعلق نیت سے ہے، حالاں کہ حدیث کا منشاء تعمیم ہے کہ انسانی تمام اعمال کا تعلق نیت سے ہے، خواہ وہ اعمال متعلق بالقلب ہوں، خواہ متعلق بالقالب ہوں، یعنی جوارح سے متعلق ہوں، لہٰذا اگر بہ جائے اعمال کے افعال فرمایا جاتا تو صرف اعضائے ظاہری کے ساتھ حدیث خاص ہوجاتی اور وہ اعمال اس حکم سے نکل جاتے جن کا تعلق قلب سے ہے تو اس تعمیم کے اظہار کی غرض سے بھی بہ جائے افعال کے اعمال فرمایا(۱)۔

علم وعمل کا باہمی ربط

اب ان چار وجوہ کے ذکر کرنے کے بعد دوسری وجہ یعنی علم وعمل میں باہمی ربط سے متعلق کچھ ضروری تفصیل بیان کی جاتی ہے، دوسری وجہ میں بیان کیا گیا تھا کہ عمل کے مادہ میں تین حرف ہیں، **عین، میم، لام**، اور یہی تین حرف علم کا مادہ ہیں، اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ علم اور عمل میں گہرا ربط اور شدید تعلق ہے، لہٰذا عملِ صحیح کے لیے پہلے علم کی اہمیت اور اقدمیت کو ظاہر فرمایا ہے اور جہل سے نفرت دلائی ہے۔

بعنوانِ دیگر یوں سمجھئے کہ انسانی زندگی عملی زندگی ہے، چنانچہ عمل ہی سے انسان کی زندگی بنتی اور سنورتی ہے اور بے عملی، سستی اور آرام طلبی سے زندگی بگڑتی ہے، اسی لیے بے عمل آدمی دوسروں کے لیے باعثِ ایذا ونفرت بن جاتا ہے۔

(۱) العمل إحداث أمر قولاً كان أو فعلاً بالجارحة أو بالقلب الخ. إرشاد الساري، ج ۱ ص ۵۳.

شانِ زندگی

اسی وجہ سے محققین کہتے ہیں: **الفراغ من شأن الأموات والإشتغال من شأن الأحياء** (۱) یعنی عمل سے خالی رہنا بے کار بن جانا مردوں کی حالت اور موت کی علامت ہے، جب کہ عمل میں مشغول رہنا زندوں کی شان اور زندگی کا نشان ہے اور ظاہر ہے کہ مردوں کے مردہ جسموں سے کسی کو تعلق نہیں رہتا، مردہ جسم سے وحشت ہونے لگتی ہے اور اس کے گلنے سڑنے کے خوف سے کوئی اس کو اپنے پاس نہیں رکھتا، ہر ایک اسے دور رہنا چاہتا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ بے عمل رہنا مثل مردوں کے نفرت اور وحشت وتکلیف کا باعث بنتا ہے یہی وجہ ہے کہ بے عمل اور بے کار آدمی سب کو بھاری اور بوجھ معلوم ہوتا ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے، دیکھا جاتا ہے کہ بڑھاپے میں جب آدمی کام کے قابل نہیں رہتا تو خود اس کے گھر والے بھی اس کو بوجھ اور وبالِ جان سمجھنے لگتے ہیں، اسی لیے اس کی ہر حالت دوسری نظر سے دیکھی جاتی ہے، اس کا کھانا، پینا، اوڑھنا، بچھانا، اٹھنا، بیٹھنا، بولنا، بلانا سب ناگوار ہوتا ہے۔

غرض! بڑھاپا ارذل عمر ہوجاتا ہے، اسی لیے بڑھاپے کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی، جیسا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجرِ مکی قدس سرہٗ (۲) فرماتے ہیں: ؎

ہے افسوس عمرِ جوانی چلی	جوانی تو کیا زندگانی چلی

(۱) محاضرات الأدباء ومحاورات الشعراء والبلغاء للراغب الأصفهانی، ج ۱ ص ۵۷۵، باب مدح الشغل وذمّ الفراغ.

(۲) حاجی امداد اللہؒ: شیخ المشائخ، عارف باللہ، فن تصوف کے مجدد، اجلّ علماء کے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہؒ مہاجرِ مکی ۲۲ رصفر المظفر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۴ء نانوتہ ضلع سہارن پور (یوپی، الہند) ←

اور صرف بڑھاپے کی مثال ہی میں کیا انحصار ہے، بے عملی کی جو بھی زندگی ہوگی، اس کا یہی انجام ہوگا۔اب غور کرو کہ جب بے عملی بھی آدمی کی زندگی کو بے کار بنا دیتی ہے اوراس کی وجہ سے اس آدمی سے دوسرں کونفرت ووحشت ہو جاتی ہے تو بدعملی تو اس سے بھی کہیں زیادہ بدترین چیز ہے، اس سے تو انسانی زندگی اور زیادہ تباہ و برباد ہوتی ہے، یہ تو انسانیت کے لیے بالکل سمِ قاتل اور زہرِ ہلاہل ہے۔

حیوانیت اور انسانیت

بدعملی سے انسانیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اوراس کے بہ جائے حیوانیت اور شیطانیت آجاتی ہے، اور حالت یہ ہوتی ہے کہ گو صورت اور شکل انسانوں جیسی ہوتی ہے لیکن اس کے سارے کام کھانا، پینا، دیکھنا، سونا، جاگنا، چلنا، پھرنا، پکڑنا، چھوڑنا محض حیوانات اور جانوروں کے حرکات بن کر رہ جاتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :﴿ يَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ ﴾ [محمد : ۱۲] یعنی ان کا کھانا چوپایوں کے مثل ہے ، جیسے جانوروں کے کھانے کا حال ہے، ان لوگوں کے کھانے اور پیٹ بھرنے کا بھی

← میں پیدا ہوئے۔آپ کا سلسلۂ نسب اوپر حضرت ابراہیم بن ادہمؒ سے جاملتا ہے۔آپ نے مروجہ نصاب کے مطابق درسیات کی تکمیل نہیں کی یعنی آپ مروجہ طور پر عالم نہیں تھے لیکن اس سے بھی زیادہ عالم گر تھے، چنانچہ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشیداحمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ آپ ہی کے خلفاء اور خوشہ چیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی جو غدر کے لفظ سے معروف ہے، شاملی کے میدان میں آپ ہی کی زیرِ قیادت لڑی گئی جس میں وقت کے بڑے بڑے علماء نے شرکت کی۔اس کے بعد آپ مکہ مکرمہ ہجرت کر کے چلے گئے اور وہیں پر جمادی الاخری ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء کو وفات پائی اور جنت المعلی میں سپردِ خاک کیے گئے، آپ کی تصانیف میں ضیاء القلوب، جہادِ اکبر اور تحفۃ العشاق معروف ہیں۔ (ضربِ کلیم ص ۱۹۴)

وہی حال ہے، حرام وحلال، خدا کی مرضی ونامرضی کا لحاظ کیے بغیر بس اپنی طبیعتوں کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو، بس پیٹ بھر جائے، حدود وقیود، قوانین واحکام کا انھیں کچھ پاس ولحاظ نہیں ہوتا جو کہ انسانیت کے بالکل خلاف ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۝۱۷۹﴾ [الأنفال] یعنی یہ لوگ نہ اپنے دلوں سے سمجھنے کا کام کر لیتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیزیں دیکھتے ہیں اور نہ کانوں سے انسانی سننے کی چیزیں سنتے ہیں، اور یوں محسوسات وما دیات کو بغیر عبرت ونصیحت لیے جانور بھی دیکھتے ہیں اور آوازیں تو ہر قسم کی جانوروں کے کانوں سے بھی ٹکراتی رہتی ہیں، جب یہ اپنے خالق ومالک کی پسند ونا پسند میں تمیز ہی نہیں کرتے تو ان لوگوں کے سننے، دیکھنے اور جانوروں کے دیکھنے، سننے میں کیا فرق باقی رہا؟ اور ان کے اور جانوروں کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہا، تو یہ لوگ اپنی تمام حرکاتِ زندگی میں جانوروں کے برابر ہیں اور انھیں کے درجہ میں ہیں۔

بل کہ حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو یہ لوگ تو جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ اور بدتر ہیں، چوں کہ جانوروں کے اندر صلاحیتیں نہیں ہیں، صرف طبیعتیں ہیں، اور اپنی طبائع کے تقاضوں کے حدود ہی میں وہ رہتے ہیں، اس سے باہر نہیں جاتے، برخلاف انسان کے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کی قابلیتیں اور صلاحتیں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں جن کو صحیح مصرف میں استعمال کر کے وہ اللہ برتر کا خلیفۃ بن سکتا ہے، پھر بھی اگر اس انسان نے غفلت اختیار کر کے ان استعدادوں سے کام نہ لیا اور اپنی صلاحیتیں

برباد کردیں یاان کوغلط استعمال کر کے حدودِ انسانیت سےنکل کرحیوانی راہ اختیار کی اور اپنی انسانیت کو غارت وبرباد کردیا تو یہ جانوروں سے بھی بدتر ہوگیا، چوں کہ جانورتو اپنی فطری حدود سے باہرنہیں ہوا اور یہ لوگ غافل اور جاہل ہوکر اپنی فطری صلاحیتوں کو غارت کر کے دین فطرت سے باہر ہوگئے، اس لیے یہ جانوروں سےبھی گئےگذرے ہوگئے۔

اس تفصیل سے آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ بےعملی اور بدعملی انسانیت کے لیےنہایت مضراورمہلک ہے، قدم قدم پراس انسان کے سامنے حیوانیت اورشیطانیت کی راہیں کھلی ہوئی ہیں، جہاں ذراغفلت ہوئی اورقدم راہِ انسانیت سے پھسلا، پھر یا توحیوانیت میں داخل ہوا یا شیطانیت میں گھسااور پھر بالکل ع ؎اے بسا ابلیس آدم روئے ہست، کا مصداق ہوجاتا ہے اس لیے انسانیت کی حفاظت کے لیےضروری ہے کہ بڑی ہوشیاری،تیقظ وبیداری کے ساتھ رہاجائے اور بڑےغور وفکراوراعلیٰ تجسس وتفحص سے کام لیا جائے اورطبیعت اورنفس کے تقاضوں اوران کی خاصیتوں سے اورنفس واہل نفس کے بنانے اور بہکانے اوران کی خطرات ومہلکات سے ہروقت ہرآن چوکنّا اورہوشیاروخبردار رہاجائے،نفس وشیطان کے مکائداوران کی چالیں سمجھ لیناہرایک کا کام نہیں،قدم قدم پرخطرات ہیں،ہرطرف جال پھیلے ہوئے ہیں،لہٰذا بجزکسی شیخ محقق ومبصر کے دامن کےان خطرات سے پناہ نہیں مل سکتی۔

جب تک اپنی رائے وتجویز کو چھوڑکرکسی شیخ کامل کی کامل اتباع نہ کی جائے،اس وقت تک نفس وشیطان کے مکائد سےحفاظت وسلامتی نہایت دشوار اورسخت مشکل ہے،نفس وشیطان کی ماتحتی سےاوران کے پنجے سے نجات کی بس یہی ایک شکل ہے کہ کسی محقق کےسامنےاپنےآپ کو پامال کردیا جائے۔

مَنْ لَا شَیْخَ لَہٗ فَشَیْخُہٗ الشَّیْطَانُ کی تحقیق

یہی حاصل ہے محققین کے اس مشہور قول من لاشیخ له فشیخه الشیطان (١) کا، اور ہمارا یہ زمانہ تو ظاہر ہے کہ کس قدر آزادی اور خود رائی اور اتباع ہویٰ کا چل رہا ہے، گمراہیوں اور گمراہ کرنے والوں کی ہر طرف کثرت ہے، نہایت ہی فتنوں کا زمانہ ہے، الامان والحفیظ! اس زمانے میں ایمان کا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے، اس زمانے میں تو ایمان کی درستگی کی سوائے شیخ کامل سے وابستگی کے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔

اس لیے اس زمانے میں تو اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا کہ اپنی اصلاح و درستی کے لیے کسی کامل کو اپنا مصلح بنالے اور اس کی کامل ماتحتی کے دامن میں پناہ لے، اب مصلح بنانا ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔

بات اگرچہ طویل ہو گئی لیکن حضرتِ والا (حکیم الامت) کی برکت اور حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے نہایت ضروری اور کام کی بات آ گئی، بات انسانی زندگی کے سلسلے میں تھی کہ انسانی زندگی ایک عملی زندگی ہے، بے عملی اور بد عملی انسانیت کے لیے موت ہے، اس لیے کہ حیاتِ انسانی کا بقا عملی زندگی پر موقوف ہے۔

اور اعمالِ انسانی کی درستی کا مدار غور و فکر پر ہے تو عملِ انسانی کا تقاضا غور وخوض ہے اور تفکر و تفحص اس کے لیے لازم ہے، بدون غور وخوض اور بغیر تفکر و تفحص کے زندگی ایک حیوانی و شیطانی زندگی ہوگی، انسانی زندگی نہیں ہو سکتی۔

---

(١) قال في الرسالة المكية :من لا شيخ له فالشيطان شيخه(نزهة الخواطر، ٥ / ٥٠٨، فی أحوالِ الشیخ أبو القاسم الأكبر آبادي.)

فکر ہی حقیقی علم ہے

میرے عزیزو! یہ غور وخوض اور فکر عجیب چیز ہے، حقیقی علم یہی غور وفکر ہے، اسی غور وفکر کا نام مطالعہ ہے، مطالعہ طالبِ علم کے لیے نہایت ضروری ہے، بغیر مطالعہ علم حاصل نہیں ہوتا، جتنا گہرا مطالعہ ہوگا، اسی قدر علم بڑھتا جائے گا، علم میں تبحر اور تعمق مطالعہ ہی سے پیدا ہوتا ہے، بلا مطالعہ کے گو کچھ معلومات اور جزئیات کا حصول ہو جائے مگر حقیقتِ علم اس میں غور وفکر کے بغیر نہیں آسکتی۔

پس غور وخوض اور تفکر و تفحص و تجسسِ علم کا بھی تقاضا ہے اور عمل کا بھی تقاضا ہے، اس عنوان کے پیشِ نظر یہ حدیث **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** غور وفکر کی ضرورت اور اس کے حاصل کرنے کی ترغیب اور اس سے خالی رہنے پر ترہیب اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

بہر حال! ان مختلف وجوہ کے بیان اور مختلف عنوانات سے جو تقریر کی گئی ہے، اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ بہ جائے افعال کے اعمال لانے میں کس قدر اسرار ونکات ہیں، اور آپ کا یہ فرمان کس قدر معانی ومطالب پر مشتمل ہے، اس سے آپ کی وہ شانِ جامعیت ظاہر ہو رہی ہے، جس کو آپ ﷺ نے **أُعْطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ** (۱) سے بیان فرمایا ہے کہ مجھ کو منجانب اللہ ایسے کلمات عطا ہوئے ہیں، جن میں الفاظ کم ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود معانی کثیرہ کے جامع ہوتے ہیں، اب وقت زیادہ ہو چکا، باقی بیانات انشاء اللہ تعالیٰ کل عرض کئے جائیں گے، حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور ذوق صحیح عطا فرماویں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

---

(۱) صحيح مسلم، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضى الله تعالى عنه، كِتَابُ الْمَسَاجِدِ وَمَوَاضِعِ الصَّلَاةِ.

الدرس العاشر

لفظ نیات کی تحقیق اور لغوی معنی

حدیث إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کے سلسلے میں آپ حضرات کے سامنے الفاظ حدیث إِنَّمَا اور الأَعْمَالُ پر بالترتیب مباحث اور تفصیلات کا بیان ہو چکا، چنانچہ کل لفظ الأَعْمَالُ پر بحث کرتے ہوئے بہ جائے الافعال کے الأَعْمَالُ فرمانے کی متعدد وجوہ تفصیل کے ساتھ ذکر کی جا چکی، اعمال کے بعد بِالنِّیَّاتِ کا لفظ آتا ہے، آج اس کے متعلق مختلف پہلوؤں سے بحث ہے، جس میں نیت کے لفظی واصطلاحی معنی کی تحقیق بیان کی جائے گی اور یہ بتلایا جائے گا کہ نیت اعمال کے لیے کہاں بمنزلہ علت ہوتی ہے اور کہاں بمنزلہ شرط ہوتی ہے، نیز امام بخاریؒ کے نزدیک یہاں نیت کے کون سے معنیٰ مراد ہیں۔

اب پہلے نیت کے معنئ لغوی بیان کیے جاتے ہیں:

نیات، نیت بتشدید الیاء کی جمع ہے، اور نیت کو بتخفیف الیاء بھی بولا جاتا ہے(۱) قول مشہور کے مطابق نیت کے لغوی معنیٰ قصد وارادہ کے ہیں (۲)، اور شارح متنبی ابوالبقاء فرماتے ہیں کہ اس کے دو معنیٰ آتے ہیں: ایک لغوی، دوسرے شرعی، مطلق قصد و ا ر ا د ہ کا نام نیت ہے، نیز امام غزالی (۳) نے

(۱) عمدة القاری ۱/۲۱.

(۲) معجم مقاییس اللغة ۵/۳۶۶، بدائع الصنائع ۱/۱۲۷.

(۳) محمد بن محمد بن احمد، الطوسی، ابوحامد، الغزالی. اسلام کے مشہور مفکر اور متکلم تھے، ولادت ۴۵۰ھ میں طاہران (خراسان کے قصبہ طوس) میں ہوئی، ابتدائی تعلیم طوس اور نیشاپور میں ہوئی، ۴۸۲ھ میں مدرسہ بغداد میں مدرس کی حیثیت سے مامور ہوئے، ۴۸۸ھ میں بغداد چھوڑ کر تلاشِ حق میں نکل پڑے، مختلف ممالک کا دورہ کیا، مشہور تصانیف میں احیاء العلوم، تحافة الفلاسفة، کیمیائے سعادت اور مکاشفة القلوب ہیں۔ ۵۰۵ھ میں طہران (طوس) ہی میں انتقال ہوا۔ (معجم المؤلفین ۱۱/۲۶۶)

نیت کے معنیٰ **انبعاث القلب إلى ما يراه موافقاً للغرض** (۱) کے بیان فرمائے، اور غرض دو قسم کی ہوتی ہے: جلب المنفعۃ اور دفع المضرۃ یعنی اپنے خیال کے مطابق کسی جلب منفعت یا دفع مضرت کے لیے قلب میں حرکت اور ولولہ وتقاضا ہونا، کشش اور شوق اور لپک کا ہونا۔

اس معنی کے لحاظ سے حدیث **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** کا مطلب یہ ہوگا کہ اعمال یعنی افعال اختیاریہ کا صدور کسی غرض وغایت کو لیے ہوئے ہوتا ہے، چوں کہ ظاہر ہے کہ انسان جس کام کو بھی کرتا ہے، ایک نہ ایک غرض اس کے اندر ضرور ہوتی ہے کوئی بھی کام کسی عاقل وبالغ کا جلب نفع یا دفع ضرر کی غرض سے خالی نہیں ہوتا۔

ابتدائی کتابوں میں آپ پڑھ کر آئے ہیں کہ عاقل کا کوئی کام بھی غرض وغایت سے خالی نہیں ہوتا ہے، ہر کام کے کرنے سے پہلے آدمی کے ذہن میں اس کا کوئی فائدہ ونفع آتا ہے، اس کے بعد ولولہ اور جذبہ وشوق پیدا ہوتا ہے، اور پھر قلب اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، چنانچہ امام غزالیؒ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام سے پہلے شئ متحرک الیہ کا وجود بھی ضروری ہوتا ہے، اس کے بعد پھر انبعاثِ قلب ہوتا ہے، جیسے : نماز وحج، جنت ودوزخ، ہاں یہ ضروری نہیں کہ وہ شئے محسوس ومبصر ہی ہو، بلکہ اس کا وجود قطعی ہونا کافی ہے، خواہ برویت ہو یا عقلاً اس کا وجود ثابت ہو یا نقلاً بروایت صادق قطعیہ اس کا وجود خارجی ثابت ہو، اسی لیے عدمِ محض کی طرف کسی کو کشش نہیں ہوتی، اور موجود صاحبِ کمال کی طرف باوجود غیر مبصر ہونے کے بھی انجذاب ہوتا ہے، خواہ اختیاراً ہو خواہ اضطراراً، چنانچہ حق تعالیٰ کو کسی نے نہیں دیکھا مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف اضطراراً بھی اور

---

(۱) إحياء علوم الدين ۳۸۵/۴، ۳۸۴، كتاب النية والاخلاص والصدق، بيان حقيقة النية.

اختیاراً بھی کشش ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مشرک اور کافر ملحد بھی بسااوقات اپنے بعض حالات میں اضطراراً اپنے خالق کی طرف متوجہ ہونے اور اس جو پکارنے پر مجبور ہوتا ہے، یہی ایک دلیل ذاتِ خالق واجب تعالیٰ کے وجود خارجی موجود بوحدانیت کے لیے کافی ووافی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ انبعاثِ قلب کے لیے کسی شئے کا محسوس ہونا ضروری نہیں ہے، بس اس چیز کا ذہن میں آجانا ضروری ہوتا ہے، شئے مبصر کی بھی اولاً رویت بصریہ ہوتی ہے، اس کے بعد ذہن میں وہ چیز حاصل ہوتی ہے اور اس چیز کا علم ہوتا ہے، اس علم کے بعد کسی غرض کا اس کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو دل اس کی طرف اٹھتا وجھکتا ہے اور اس میں اس شئے کی طرف حرکت ہوتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محض کسی چیز کا چاہنا ارادہ نہیں، یہ تو آرزو اور تمنا ہے جو بالکل ابتدائی چیز ہوتی ہے، اس کے بعد جب اس چاہنے میں قوت آتی ہے تو قلب میں کشش وشوق کی شدت کے ساتھ اس شئے کی جانب حرکت ہوتی ہے، اس کو ارادہ کہتے ہیں جو طلب کے مرادف ہوتا ہے، اب ہم نے آرزو ہی کا نام ارادہ یا طلب رکھ چھوڑا ہے جو بالکل غلط ہے، طلب کے آثار ولوازم الگ ہوتے ہیں جو محض تصور اور خیال، آرزو تمنا اور معمولی وسرسری چاہنے کے ساتھ نہیں ہوتے، جیسے جی تو چاہتا ہے پڑھنے کو اور وقت لہو ولعب میں، فضولیات میں دوستانے میں، سست پڑے رہنے میں، لاپرواہی سے ادھر ادھر گھومنے میں گذارتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں طالب علم ہوں، حالاں کہ ہم اس کے ان حالات سے علم کے لیے اس کے دل میں کوئی طلب اور تڑپ نہیں دیکھ رہے ہیں، بس داخلہ لے لیا، طالب علموں میں نام لکھا لیا اور بے فکر ہوگئے، معلوم ہوا کہ ابھی تک اس نے نیت وارادہ ہی کو نہیں کیا، محض خیال وآرزو ہی تک پہنچ کر رہ گیا ہے ورنہ اگر حقیقی طلب ہوتی تو لازماً علم کے تجسس، فکر ومحنت، مطالعہ ومذاکرہ میں محو ومستغرق رہتا۔

عزیزو! طلب عجیب چیز ہے، جب حقیقی طلب ہوتی ہے تو سوائے مطلوب

کے دوسری طرف التفات ہو ہی نہیں سکتا، اسی کو تو کہا ہے، ع ؎ چو شمع از پئے علم باید گداخت (۱)، اس شعر میں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ تمنا اور ارادہ میں کیا فرق ہے، اور یہ کہ ارادہ اور نیت طلب ہی کے مرادف ہیں، تو اب اصل بات کی طرف آئیے!، اصل بات یہ تھی کہ نیت کے معنیٰ امام غزالیؒ نے انبعاث القلب نحو مایری لغرضه لجلب منفعة او دفع مضرة (۲) بیان فرمائے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اپنے خیال کے مطابق کسی نفع کے حاصل کرنے یا ضرر و نقصان کو دفع کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کا قلب متحرک ہوتا ہے اور اس میں ایک داعیہ اور تقاضا پیدا ہوتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ تحریک اور انبعاثِ قلبی کسی نہ کسی غرض و غایت کے باعث ہوتی ہے، اور یہ غرض و غایت خیر بھی ہوسکتی ہے اور شر بھی ہوسکتی ہے۔

تو نیت کے لغوی معنیٰ خواہ قصد و ارادہ کے لیے جائیں یا انبعاث القلب کے لیے جائیں، ہر اعتبار سے یہ معنیٰ اپنے اندر عموم و شمول کو لیے ہوئے ہیں، یہاں تک نیت کے لغوی معنیٰ کی بحث تھی۔

نیت کے شرعی و مرادی معنیٰ

اب نیت کے شرعی معنیٰ سنئے! شرعاً نیت کی حقیقت قاضی بیضاوی (۳) نے

(۱) کریما سعدی، ص ٦۔

(۲) یہ تعریف علامہ بیضاویؒ نے بیان کی ہے (دیکھئے: تحفة الأبرار شرح مصابيح السنة للبیضاوی، ج ۱ ص ۱۹) اور امام غزالیؒ کی بیان کردہ تعریف کے الفاظ وہ ہیں جو ما قبل میں بیان کردئے ہیں۔

(۳) مفسر قرآن عبداللہ بن عمر بن محمد بن علي شیرازی، ناصرالدین بیضاوی، بیضا (فارس) میں پیدا ہوئے، آپ نے قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور شیراز کے قاضی مقرر ہوئے پھر تبریز میں مقیم ہوگئے اور وہیں پر ان کا انتقال ہوگیا، آپ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کی تفسیر "أنوار التنزیل و أسرار التاویل" ہے، جسے عموماً تفسیر بیضاوی کہتے ہیں، ٦٨٥ھ مطابق ۱۲۸٦ء میں انتقال ہوا۔ (مقدمہ تفسیر بیضاوی ۱/ط: مکتبہ مدینہ دیوبند)

الْاِرَادَة الْمتوجهة نَحْوَ الْفِعْلِ لِابْتِغَاءِ رِضاء اللّٰهِ و امتثالاً لحكمه (۱) بیان فرمائی ہے یعنی ارادہ کا کسی فعل کی طرف حق تعالیٰ کو راضی کرنے اور اس کے حکم کی تعمیل کی غرض سے متوجہ ہونا، اسی کو حسن نیت اور اخلاص کہتے ہیں۔

یہ حسنِ نیت اور اخلاص وہ چیز ہے جس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ تقویٰ و اخلاص کے ساتھ کوئی ادنیٰ عمل بھی قلیل نہیں رہتا اور جو عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہو، اس کو قلیل کیسے کہہ سکتے ہیں (۲) اس لیے عمل کے ساتھ اس کی دعا کر کہ عمل مقبول ہو جائے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے: **إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ، وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُم** (۳) یعنی اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں اور صرف ظاہری اجسام کو نہیں دیکھتے بلکہ اصل تمہارے قلوب اور نیتوں کو دیکھتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ کی نظر حسن نیت اور اخلاص پر ہوتی ہے؛ لہٰذا جس عبادت میں بھی غرض فاسد کی آمیزش ہو، نیت خالص نہ ہو، ایسی عبادت عند اللہ نامقبول ہے، لہٰذا اس کا وجود و عدم برابر ہے۔

صورت دین داری

افسوس آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہم لوگ اعمال خیر کرتے ہیں، بہ ظاہر شعائر اسلام کے پابند ہیں، مگر ان میں بھی ہماری اغراض فاسدہ ملی ہوئی ہیں، بیشتر ان میں اخلاص نہیں ہوتا، اس لیے یہ ہماری دین داری محض صورتاً ہے حقیقتاً نہیں، ہماری

(۱) تحفة الأبرار شرح مصابيح السنة للبيضاوي، ج ۱ ص ۱۹.
(۲) تفسير الدر المنثور، ج ۳ ص ۵۵، تحت هذه الآية: ﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ م اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا الآية﴾.
(۳) صحيح مسلم، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضى الله تعالى عنه، بَابُ تَحْرِيمِ ظُلْمِ الْمُسْلِمِ، وَخَذْلِهِ، وَاحْتِقَارِهِ وَدَمِهِ، وَعِرْضِهِ، وَمَالِهِ، رقم الحديث: ۳۳، ۲۵۶۴.

دین داری کی یہ حالت ہے کہ اعمال خیر کے اختیار کرنے اور اعمالِ سوء کے اجتناب میں بھی وضع اور رسم ورواج کے پابند بن گئے ہیں، چنانچہ بعض اعمال کی ہم پابندی کرتے ہیں، اور بعض کی نہیں کرتے، جن اعمال کی عادت ہے اور عرفاً وہ موجب ذلت بھی نہیں ہیں یا وہ موجب استخفاف سمجھے جاتے ہیں، ان کے ہم پابند نہیں، بس ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ [البقرة:۸۵] کے مصداق بنتے ہیں۔

حقیقت دین داری

تو ظاہر ہے کہ یہ دین داری کی صورت ہے، حقیقت دین داری نہیں ہے، مثال کے طور پر ایک تو بادام کا ظاہر یعنی چھلکا ہے اور ایک اس کی گری ہے، اصل مقصود چھلکا نہیں ہے بلکہ اس کی گری ہے، جس طرح وہاں صرف چھلکا بلا گری کے مقصود و مطلوب نہیں ہے، مگر ہماری ان صورِ اعمال ہی پر نظر مقصور ہو کر رہ گئی، بس اعمال کی صورتوں کو دیکھ کر ہر شخص بہ جائے خود یہ سمجھ رہا ہے کہ میں دین دار ہوں، میں عالم ہوں، میں حافظ ہوں، حالاں کہ اگر ہم اپنی حالتوں کا محاسبہ واحتساب کر کے دیکھیں تو اپنے اعمال میں ہم اغراضِ نفسانیہ، حب جاہ، ریا وسمعہ وشہرت زیادہ پائیں گے، مگر ہم لوگوں میں حِس نہیں رہی، خدا کرے ہمارے اندر صحیح حِس اور بصیرت پیدا ہو جائے تو پھر معلوم ہو کہ ہمارے اعمالِ خیر کے اندر بھی کتنی اغراضِ نفسانیہ بھری ہوتی ہیں، حالاں کہ اصل مطلوب اخلاص ہے، جس کا بیان إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ میں ہو رہا ہے، اسی اخلاص سے دین میں حقیقت آتی ہے اور اعمال میں جان پیدا ہوتی ہے، اسی سے دین پھیلتا ہے، اسلام تلوار سے نہیں پھیلا بلکہ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اخلاص سے اور ان کے اخلاق سے پھیلا ہے، ان حضرات کے اخلاق اور اخلاص والے اعمال

دیکھ دیکھ کر ہی لوگ مسلمان ہوتے تھے، اسلام قبول کرتے چلے جاتے تھے۔

یہ ہی ان کا اخلاص تھا کہ خلوت میں، غربت میں، امارت میں، محکومیت میں، حاکمیت میں، ماتحیت میں، افسریت میں، صحت میں، علالت میں، قوت میں، ضعف میں، حضر میں، سفر میں، اپنوں میں، غیروں میں، دوستوں میں دشمنوں میں، سکون میں اور معرکہ میں، دربار شاہی میں، غرض ہر جگہ " إنّا كنّا أذلَّ قومٍ **فأعَزَّنا الله بالإسْلامِ**"(۱) اسلام ہی کا اتباع اور اسلام ہی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔

آج سب سے بڑی کمی ہمارے اندر اس اخلاص ہی کی آ گئی ہے، اسی لیے سب علوم واعمال کھوکھلے اور محض خول رہ گئے، اعمال بلا روحِ اخلاص کے مردہ ہو گئے، اور علوم محض الفاظ بلامعنی ہو کر بے جان ہو گئے، اسی لیے بہت لمبی لمبی تقریروں، اور کثیر درکثیر وعظوں اور جلسوں کے باوجود دین وایمان میں روز بروز کمی اور کمزوری ہی بڑھتی چلی جارہی ہے، چوں کہ جو اصلی طاقت اور قوت ہے، وہ اخلاص ہے، اسی سے سارے اعمال میں جان پڑتی ہے۔

پہلے زمانے کے لوگ اس اخلاص کا بڑا اہتمام کرتے تھے، ہمیشہ اپنے اعمال میں اس کا خوف کھاتے تھے کہ کہیں اخلاص ہمارے اندر سے نہ نکل گیا ہو، اور اگر اپنے متعلق ذرا بھی اخلاص میں کمی کا خیال ہو جاتا تو اپنے اعمال کو منافقانہ اعمال خیال کرنے لگتے اور اپنی سیرت اور زندگی کو منافقانہ سمجھتے، جیسا کہ آپ اسی بخاری شریف کی کتاب الایمان میں پڑھیں گے، ابن ابی ملیکہؒ کا بیان ہے کہ میں نے ۳۰/صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ملاقات کی **كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلَى نَفْسِهِ** (۲) سب اپنے اوپر نفاق کا خوف رکھتے تھے، اور مؤمن کی یہی

(۱) المستدرك على الصحيحين، عن طارق بن شهاب عن عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه، كتاب الإيمان، قصة خروج عمر إلى الشام۔رقم: ۲۱۴.

(۲) صحيح البخاري، عَنِ ابْنِ أَبِي مُلَيْكَةَ، كتاب الإيمان، بَابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لاَ يَشْعُرُ.

شان حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ذرا سا گناہ بھی اگر اس سے سرزد ہوجائے تو وہ بہت زیادہ گھبراجاتا ہے، جیسا کہ اس کے اوپر کوئی پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔

ایمانِ خالص کا تقاضا

اس سے معلوم ہوا کہ تیقظ ، بیداری اور اپنی اصلاح کی فکر ایمانِ خالص کے لیے لازم ہے اور اپنی اصلاح سے غفلت و بے فکری صحیح مسلمان کی شان سے نہایت بعید ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو منافقوں کا خاصہ فرمایا ہے، ارشاد ہے کہ منافق سے خواہ کتنا ہی بڑا گناہ سرزد ہوجائے ، وہ اس کو ایسا سمجھتا ہے جیسا کہ مکھی ناک سے اڑادی (۱) یعنی لاپرواہی اور بے اعتنائی سے برائے نام حرکت کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ زبانی اقرار کرلیا اور بس بے فکر ہوگیا، حالاں کہ آپ نے سنا ہے کہ ہمارے اسلاف واکابر اخلاص کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے اور بار بار اپنے اخلاص کی تجدید فرماتے ہوئے جَدِّدُوا إِيمَانَكُمْ بِقَوْلِ :لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ (۲) پر عمل پیرا رہتے تھے اور ایک ہم ہیں کہ اخلاص کی طرف توجہ نہیں کرتے، اس کے حاصل کرنے کا اہتمام تو کیا ہوتا، ہم کو خیال تک بھی نہیں آتا، حالاں کہ خدا تعالیٰ کے یہاں اخلاص ہی مطلوب ہے، اسی کے ساتھ تمام علوم اور اعمال کا اعتبار ہے، تمام کام اسی سے بنتے ہیں، اللہ تعالیٰ اخلاص کو اس دنیا میں بھی ضائع نہیں ہونے دیتے بلکہ اس کے ثمرات وبرکات دنیا میں بھی ضرور عطا فرماتے

---

(۱)إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيَرَى ذُنُوبَهُ كَأَنَّهُ جَالِسٌ فِي أَصْلِ جَبَلٍ يَخْشَى أَنْ يَنْقَلِبَ عَلَيْهِ، وَإِنَّ الْفَاجِرَ لَيَرَى ذُنُوبَهُ كَذُبَابٍ مَرَّ عَلَى أَنْفِهِ، فَقَالَ بِهِ :هَكَذَا.(الزهد والرقائق لابن المبارك، ج ۱ ص ۲۳،عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍرضی اللّٰہ تعالی عنه،بَابُ مَا جَاءَ فِي تَخْوِيفِ عَوَاقِبِ الذُّنُوبِ،رقم الحديث: ۲۹)

(۲)مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ۲/ ۲۱۱ ،عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَرضی اللّٰہ تعالی عنه،بَابُ الِاسْتِسْقَاءِ، رقم الحديث:۳۲۷۷.

ہیں، جس نے بھی اخلاص اختیار کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو ثمرات و برکات سے ضرور نوازا ہے۔

بہر حال اخلاص نہایت اہم اور اعظم شئے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بہت غامض اور باریک بھی ہے، جیسا کہ حضرت ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ اخلاص اتنی گہری چیز ہے کہ بعض دفعہ اس کا فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلتا، کراماً کاتبین بھی اس کو نہیں جانتے، اسی کو کہا ہے، ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزے ست	کراماً کاتبین را ہم خبر نیست (۱)

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ کراماً کاتبین سے فرمائیں گے کہ میرے بندے کے لیے فلاں فلاں اجر لکھ دو، فرشتے عرض کریں گے: اے پروردگار! یہ کام تو اس کے ہم کو یاد نہیں، نہ ہمارے دفتروں میں درج ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اس نے ان اعمال کی نیت کی تھی۔ (مرقاۃ ج ۲، ص ۷۴)

تو دیکھا آپ حضرات نے کہ اخلاص کس قدر باریک چیز ہے، اسی لیے ایک بزرگ امام غزالیؒ علماء کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ اے علماء کی جماعت! اپنے اعمال میں اخلاص کا گمان اور دوسروں پر ناقدانہ نظریہ تو ٹھیک نہیں، کیوں کہ دوسرے کے اندر اخلاص یقینی ہے اور ریا محتمل اور ظنی ہے، اور اپنے اندر تو نفس کی اغراض اور نفسانیات حاضر و مستحضر محقق و معلوم ہیں، اس لیے اپنے کام میں ریا، حبِّ جاہ وغیرہ اغراضِ نفسانیہ کی آمیزش ہو جانے کے باعث غیر اخلاص یعنی ریا وغیرہ یقینی ہیں اور اخلاص مشکوک و محتمل ہے، چنانچہ اگر غور و خوض اور صحیح فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے اعمال میں اکثر اغراض فاسدہ شامل ہوتی ہیں، زیادہ حصہ حب جاہ، حب مال، رضائے خلق، ریا و سمعہ وغیرہ کا ہوتا ہے، تو

(۱) عاشق اور معشوق کے درمیان ایسے اشارات (کوڈ) ہوتے ہیں، جن کی خبر کراماً کاتبین (فرشتوں) کو بھی نہیں ہوتی۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ اپنے یقینی سے بھی

اِعراض اور دوسرے کے محتمل ظنی پر بھی نظر! یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنے کو مخلص اور دوسرے کو غیر مخلص سمجھ رہے ہو، اس حماقت سے بچو،! اب آپ حضرات نے سمجھ لیا کہ اخلاص کیسی باریک چیز ہے، اسی اخلاص کے حاصل کرنے میں صوفیائے کرام عمر بھر جدو جہد کرتے رہتے ہیں۔

لیکن اس سے یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ اخلاص بہت مشکل چیز ہے، اس کا حاصل کرنا تو بہت ہی دشوار ہے، گھبرانے کی بات نہیں، یوں تو دنیا میں ہلکے سے ہلکا کام بھی ابتداءً مشکل ہی ہوتا ہے، چنانچہ جب بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوکر دودھ کا خوگر ہوجاتا ہے، تو اس کا دودھ چھڑانا اور کھانا اختیار کرنا بھی مشکل ہوتا ہے، رفتہ رفتہ پھر سہل وآسان ہوجاتا ہے، اسی طرح اخلاص کا حال بھی ہے کہ اس کے حصول کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بھی آسان ہوجاتا ہے، جب ادنیٰ سے ادنیٰ دنیوی کام میں بھی اولاً کچھ نہ کچھ دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے تو دین کے لیے اخلاص واحسان کی خاطر بھی تھوڑی سی دشواری ہو تو تعجب کی کیا بات ہے؟ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۶۹﴾ [العنکبوت] اول محنت ہے پھر خدا تعالیٰ نصرت ومدد فرماتے ہیں اور ساتھ دیتے ہیں، چنانچہ اس حدیث **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** میں اسی اخلاص کے حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اصلاح نفس کی شرط

ہمارے اندر جو امراض مہلکہ بھرے پڑے ہیں، ان کے علاج کی طرف متوجہ فرمایا ہے اور یہ علاج دو چیزوں سے مرکب ہے اول علم صحیح کی تحصیل، فکر واہتمام بلیغ کے ساتھ ہو، اور اعمال کی اغراض محمودہ ومذمومہ سے واقف ہوا جائے،

اور ہر کام کے کرنے سے قبل یہ سوچا جائے کہ اس میں میرا کیا مقصد اور کیا نیت ہے، آیا محمود ہے یا مذموم؟ یعنی کوئی نفسانی مزہ اور فانی لذت مقصود ہے یا حق تعالیٰ کے راضی کرنے کی نیت ہے، ہر عمل سے پہلے اسی فکر اور سوچ کو کام لایا جائے، اسی کو مراقبہ ومحاسبہ کہا جاتا ہے۔

اصلاح کی علت عادیہ

دوسری چیز نہایت ضروری شرط لابدی بلکہ علت عادیہ ہے کہ اپنے کو کسی مخلص بندے، ماہر نفسانیات، طبیب نفس یعنی شیخ کامل کے سپرد کردے اور اپنے احوال کی وقتاً فوقتاً اطلاع دیتا رہے اور اس کی رائے کا اتباع کرتا رہے، جو کچھ وہ تجویز کرتا رہے، اسی پر عمل کرتا رہے، خواہ اپنی سمجھ میں آوے یا نہ آوے، اس طریق پر گامزن رہے تو بس سمجھو کہ اخلاص حاصل ہوا رکھا ہے، اسی اخلاص کے استحضارِ دائمی کا نام احسان ہے یا بعنوانِ دیگر یوں کہئے کہ اسی اخلاص میں جب دوام آجاتا ہے تو اس کا نام احسان ہے، اسی کا نام اصطلاح خاص میں مشاہدہ ہے۔

الحاصل اخلاص کی حقیقت تصحیح نیت ہے، جیسا کہ معلوم ہو چکا اور ظاہر ہے کہ نیت ایک قلبی اور باطنی چیز ہے، اسی لیے نیت کی درستی بعینہٖ قلب کی درستی ہے، اسی کا نام صفائی قلب، تزکیۂ نفس یا اصلاحِ باطن، جو کچھ چاہے رکھ لیا جائے اور اسی کو ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝٩﴾ [الشمس] میں بیان فرمایا ہے، یہ چیز نہایت ہی اہم واعظم ہے، چوں کہ اندر ہی کی درستی واصلاح سے ظاہر کی اور تمام جسم واعضاء کی درستی اور اصلاح ہے۔

اصلی انسانیت

فی الحقیقت اصلی انسانیت یہی باطن کی اصلاح ہے، اسی لیے جس طریق سے

باطن کی اصلاح متعلق ہے، اس کی عظمت واہمیت کی وجہ سے وہ ایک مستقل فن ہوگیا، جس کا نام بھی پھر مستقل تجویز ہوگیا، اور اس فن کو تصوف وسلوک کے نام سے موسوم کردیا گیا، اس تقریر سے بخاری شریف کی پہلی ہی حدیث سے تصوف کا ثبوت واضح اور ظاہر ہوگیا اور تصوف کو قرآن وحدیث سے جدا کیسے کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ وہ دین کی حقیقت اور روح ہے۔

یہ بات نیت کے بیان میں بسلسلۂ اخلاص آ گئی تھی، اصل کلام نیت کے بارے میں ہو رہا تھا کہ نیت کے لغوی اور اصطلاحی کیا معنیٰ ہیں، بہرحال نیت کے شرعی معنی اخلاص واحسان کے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** میں پوری حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے لغوی یا شرعی معنیٰ میں سے کون سے معنی مراد ہو سکتے ہیں، سوعلامہ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہاں نیت کے شرعی معنیٰ مراد نہیں ہیں، بلکہ لغوی معنیٰ مراد ہیں، چوں کہ یہ جملہ **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** اجمال اور مقسم ہے اور **فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا إلخ** یہ دونوں جملے اس کی تفصیل اور تقسیم ہیں، جن میں نیت کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک إلی اللہ یعنی نیت حصول رضائے الٰہی اور دوسرا الی دُنیا یعنی دنیا کے حصول کی نیت، پس جب نیت کی یہ دو قسمیں ہیں: ایک قصد الی اللہ اور ایک قصد الی الدنیا، اور مقسم اپنے اقسام کو شامل ہوتا ہے تو حدیث **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** ان دونوں قسموں کو شامل ہے، لہٰذا یہاں اگر صرف معنیٰ شرعی مراد لیے جائیں تو لازم آوے گا کہ **فمن كانت إلخ** اس میں داخل نہ ہو، بلکہ اس کا مقابل اور قسیم ہو، اور قسیم کا قسم ہونا محال ہے، پس معنیٰ شرعی کا مراد ہونا محال ہے؛ لہٰذا **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** کی قسم ہونا بھی محال ہے، پس معنیٰ شرعی کا مراد ہونا محال ہے(۱)۔

---

(۱) کرمانی، ج ۱ ص ۱۸ .

چوں کہ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ نیت کے شرعی معنی قصدِ رضائے الٰہی کے ہیں اور یہ محمود ومطلوب ہے، اس کا تقاضا ہے کہ آگے آنے والی دو چیزیں بھی محمود ومطلوب ہوں، حالاں کہ آگے جو چیزیں "إلی اللہ و إلی الدنیا" مذکور ہیں، یہ دونوں محمود نہیں ہوسکتیں، صرف "إلی اللہ" ہی محمود ومطلوب ہے اور "إلی الدنیا" مذموم وغیر مطلوب ہے، ان میں ایک اختیار کرنے کے قابل اور دوسری ترک کردینے کے قابل ہے، لہٰذا یہ دونوں قسم شرعی نیت میں داخل نہیں ہوسکتیں، پس یہاں نیت کے شرعی معنی مراد نہیں ہوسکتے، لغوی معنیٰ ہی یہاں مراد ہوسکتے ہیں، جس میں آگے آنے والی نیت کی دونوں قسمیں "قصد هجرت الی اللہ" اور "قصد هجرت الی دنیا" داخل ہے۔

اس تمام تقریر سے آپ بہ خوبی سمجھ چکے ہوں گے کہ اگر چہ ذکر دو قسم کی نیتوں کا کیا گیا ہے مگر مطلوب ومحمود ان میں سے ایک ہی ہے اور وہ قصدِ رضائے الٰہی ہے جس سے یقینی طور پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ حدیث بیان اخلاص کے لیے ہے، اسی وجہ سے محدثین اپنی کتابوں میں سب سے پہلے اس حدیث کو ذکر فرماتے ہیں؛ تاکہ اخلاص کی اہمیت اور اقدمیت پر دلالت ہو، اور اس کا مدارِ قبولِ اعمال ہونا معلوم ہو، نیز علم حاصل کرنے والے اپنی نیت علم حاصل کرنے سے مقصود صرف رضائے الٰہی رکھیں، چوں کہ جس طرح اور عبادات میں اخلاص ضروری ہے، تحصیل علم میں بھی اخلاص ضروری ہے۔

تحصیل علم میں اخلاص

علم حاصل کرنے سے مقصود منصب، عہدہ، عزت، شہرت، نام ونمود، مناظرہ ومباحثہ میں لوگوں پر غالب آجانا وغیرہ نہ ہو، چوں کہ اس قسم کی نیتوں کا اثر ہوگا کہ صرف چرب لسانی، زبان درازی، لسانیت ولفاظیت پر محنت ہوگی، بس اسی کی

کوشش ہوگی کہ تقریر کرنا اور اچھے انداز میں بولنا آجائے، دل چسپ عنوانات حاصل ہوجائیں، مضمون سازی آجائے، عمل، اخلاق، تزکیۂ نفس وتصفیۂ باطن جو علم سے اصل مقصود ہیں، ان کی طرف بالکل توجہ اور خیال والتفات تک نہ رہے گا، اور لامحالہ جب اپنی اصلاح ودرستی سے غفلت اور بے التفاتی ہوگی تو نفسانیات کا اس پر تسلط ہوجائے گا، جاہ وشہرت، طمع وحرص کا عادی ہوجائے گا، ایسے ہی حریص وطماع علماء کوعلمائے سوء کے ساتھ تعبیر کیاجاتاہے اور یہی **ضَلُّوا وَأَضَلُّوا** (۱) کے مصداق ہوتے ہیں، چوں کہ یہ طمع نفسانی وحرص مالی وحب جاہی کے جال میں باطل کی ضد اور غلط فتاویٰ پر مجبور ومجہول ہوتے ہیں اور غلط رہبری کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے لیے **زَلُّ الْعَالِمِ زَلُّ الْعَالَمِ** (۲) کہا گیا ہے، اللہ تعالیٰ حرص وہوا، نمودوریا طلبِ شہرت، حب مال، وحب جاہ سے محفوظ رکھے۔

علمائے سوء

ایسے علمائے سوء کے متعلق حدیث شریف میں ارشاد فرمایا ہے، یہ لوگ آسمان کے نیچے سب سے زیادہ شر کو لیے ہوئے ہوں گے، **عُلَمَاؤُهُمْ شَرُّ مَنْ تَحتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ مَنْ عِندَهُمْ تَخرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيهِمْ تَعُودُ**: ان کے ظاہر وباطن فتنوں سے لبریز ہوں گے، اور ان کے شر سے عالم میں فساد پھیل پڑے گا (۳)، اسی کو آج مشائخ کاملین محسوس کررہے ہیں، اور یہی غم ان کو بے چین

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ۱۷۹/۱، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ تعالی عنہ، بَابٌ فِي الْقِيَاسِ وَالتَّقْلِيدِ، رق الحدیث: ۸۴۲.

(۲) حضرت عیسیٰؑ کے قول سے ماخوذ ہے جو اس طرح وارد ہے: قِيلَ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ: يَا رُوحَ اللّٰهِ وَكَلِمَتَهُ مَنْ أَشَدُّ النَّاسِ فِتْنَةً؟ قَالَ: زَلَّةُ الْعَالِمِ إِذَا زَلَّ الْعَالِمُ زَلَّ بِزَلَّتِهِ عَالَمٌ كَثِيرٌ. (الزهد والرقائق لابن المبارك، ج ۱ ص ۵۲۰، بَابُ فَضْلِ ذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ.)

(۳) شعب الإيمان، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، فَصْلٌ قَالَ: "وَيَنْبَغِي لِطَالِبِ الْعِلْمِ أَنْ يَكُونَ تَعَلُّمُهُ وَلِلْعَالِمِ أَنْ يَكُونَ تَعْلِيمُهُ لِوَجْهِ اللهِ تَعَالَى، رقم الحديث: ۱۷۶۳.

بنائے ہوئے ہے کہ عوام کی اصلاح سے زیادہ آج ان لکھے پڑھوں کا سنبھالنا مشکل ہورہا ہے۔

بہر حال! اب آپ بہ خوبی سمجھ گئے کہ نیت کی درستی اور اخلاص یعنی نفس کی اصلاح اغراضِ نفسانیہ سے گریز و پرہیز کس قدر اہم اور ضروری ہے، جس کا طریقہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ شیخ کامل کی تربیت حاصل کرنا، اور پورے فکر واہتمام سے اس کی ماتحتی کرنا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے جسمانی مرض میں طبیب جسمانی کے تحت ہوتے اور اس کے بتلائے ہوئے دواو پرہیز میں اس کی کامل اتباع کرتے ہیں، اسی کو کہا ہے۔ ؎

یار باید راہ را تنہا مرو	❁	بے قلاؤ زاندریں صحرا مرو(۱)
ہر کہ تنہا نادریں رہ را بزید	❁	ہم بہ عون ہمت مرداں رسید(۲)

حدیث میں وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى لانے کی وجوہ

اب نیت کی بحث کے بعد یہ بحث ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ کے بعد وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى کیوں فرمایا؟ ذکر خاص بعد العام کی کیا وجہ ہے؟ آج کی تقریر اسی بحث پر ہے، سو اس ذکر خاص بعد العام کی متعدد وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى کو پہلا جملہ إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ کی تاکید کے طور پر فرمایا گیا تو گویا إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ہی کو دوسرے الفاظ میں تاکید کے طور پر وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى سے بیان فرمارہے

(۱) راستہ طے کرنے کے لیے دوست ہونا چاہیے تنہا اس کوچے میں قدم نہ رکھو، بغیر رہبر کے اس صحراء سے گذرنے کی ہمت نہ کرنا۔

(۲) جو کوئی بھی اس راستے میں تنہا پہنچا ہوا نظر آتا ہے، فی الحقیقۃ وہ بھی کسی مرد (قلندر) کی توجہ سے وہاں پہنچا ہے۔

ہیں، پس یہ تکرار مفید ہے، تکرار غیر مفید نہیں ہے کہ یہ اشکال کیا جائے کہ تکرار تو عام عاقل بالغ کے کلام میں بھی عیب شمار ہوتا ہے، پھر حضور اکرم ﷺ جو اکمل الکاملین اور افصح الفصحاء اور ابلغ البلغاء ہیں، ان کے کلام میں تکرار کس طرح ہوا؟ اس جواب سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ تکرار غیر مفید نہیں ہے، بلکہ نہایت مفید اور باحکمت ہے اور ہر تکرار لغو اور فضول نہیں ہوتا، بلکہ بہت سے مقامات پر تکرار ضروری اور باعث خوبی کلام ہوتا ہے، مختصر المعانی میں بھی آپ نے أَنَا أَبُو النَّجْمِ و شِعْرِي شِعْرِي کے اندر اس بحث کو پڑھا ہوگا، اور نحو میر میں بھی تاکید لفظی اور معنوی کا بیان پڑھا ہوگا۔

الغرض! تکرار مفید سے کبھی تو کسی کی عظمت وجلالتِ شان کا بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اور کبھی رفع وہم مقصود ہوتا ہے وغیر ذلک، تکرار سے بہت فوائد ہوتے ہیں، عظمت وجلالتِ شان کے اظہار کی مثال، جیسے : آپ کسی سے کہیں میاں آپ آپ ہیں، یہاں لفظ آپ کو مکرر ہے مگر غیر مفید نہیں، اسی طرح یہاں بھی نیت کے بے انتہا ضروری ہونے اور اس کے مدار اعمال ہونے کی اہمیت کو تاکیداً اوَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى سے بیان فرمایا گیا ہے، اس تقریر سے تکرارِ غیر مفید ہونے کا اشکال بھی رفع ہو گیا، اور تکرار کا فائدہ بھی سمجھ میں آ گیا۔

دوسری وجہ وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى لانے کی یہ ہے کہ إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ سے اعمال کا تعلق نیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور دوسرے جملے وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى سے اعمال کے ثمرہ کو بیان فرمایا ہے، گویا پہلا جملہ علت فاعلیہ کے طور پر ہے، اور دوسرا جملہ بہ طور علتِ غائیہ کے ہے، پس دونوں میں بڑا فرق ہے، کہاں فعل اور کہاں ثمرۂ فعل!، لہٰذا سرسری نظر سے جو تکرار معلوم ہو رہا تھا، عمیق نظر کے ساتھ دیکھنے سے وہ وہم رفع ہو گیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ سے اعمال کے لیے نیت

کا ہونا تو معلوم ہو گیا مگر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ایک عمل میں نیت ایک ہی کی جاسکتی ہے یا ایک عمل میں بہت سی نیتیں کی جاسکتی ہیں؟ تو إنما لامرئ کے عموم سے یہ ظاہر فرمادیا کہ ایک عمل کے لیے عامل بہت سی نیتیں بھی کرلے تو ہر ایک نیت کا الگ الگ مستقل ثواب عطا کیا جاوے گا، مثلاً: دخولِ مسجد کے وقت ادائے نماز کی نیت، دوسرے اعتکاف کی نیت تیسرے بیماروں کی عیادت کی، چوتھے اہل محلہ کے حالات معلوم کرنے کی، پانچویں اہل حاجت کی حاجات معلوم کرکے ان کی حاجت روائی کی، چھٹے نیک بات سننے، مثلاً: ترجمۂ قرآن پاک سننے کی، ساتویں ملائکہ کی دعا لینے کی، چوں کہ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷﴾ پر فرشتے آمین کہتے ہیں، اوران کے مثل دوسرے جتنے اعمال خیر کی نیت کرے گا، اس ایک عمل دخولِ مسجد ہی سے متعدد نیتوں کے اعتبار سے متعدد اعمال کا ثواب ملے گا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ میں نیت بلا قید ہے، اس سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ عمل میں اپنی اپنی نیت کارآمد ہے یا کسی دوسرے کی نیت بھی کام آسکتی ہے تو إِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى سے آپ نے بیان فرمادیا کہ کسی عمل میں عامل کی اپنی ہی نیت کا اعتبار ہوگا، کسی دوسرے کی نیت اس کو سودمند نہ ہوگی (۱)۔

حدیث میں دلیل لِمّی ودلیل إِنّی کا بیان

پانچویں وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ بہ طور قاعدۂ کلیہ دلیل لِمّی کے طریق پر فرمایا اور دوسرا جملہ إِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى بہ طور دلیل إِنّی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ تمھیں بہ طور دلیل لمّی یہ قاعدہ کلیہ معلوم ہوا تھا کہ اعمال نیت کے ساتھ ہوتے ہیں، یعنی جیسی نیت ہوگی، ویسے ہی اعمال کا صدور ہوگا،

(۱) عمدة القاري، ۱/۶۷، ٦٦.

اگر نیت بڑھیا ہوگی تو عمل بھی بڑھیا صادر ہوگا، اور اگر نیت گھٹیا ہوگی تو عمل بھی گھٹیا ہوگا، نیت عمل میں فساد ہے تو صدورِ اعمال میں بھی فساد اور فتنہ ہوگا، نیت سے عمل کا صدور ہوا تو معلول کا علت سے ظہور ہوا، اور اگر علت کا معلول سے ظہور ہو تو اسی کو دلیل إِنّی کہتے ہیں۔

اب اگر آپ یوں کہنے لگیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں منطق نہ تھی تو پھر دلیل لِمّیؔ ورِاِنّیؔ کا عنوان آپ کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟، جواب اس کا یہ ہے کہ ہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ عنوانات اختیار نہیں فرمائے مگر آپ صاحبان نے مرقات پڑھی ہوگی، اس میں لکھا ہے کہ اصحابِ نفوسِ قدسیہ کو معقولات سے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، تمام نظریات ان کو خود بخود معلوم ہو جاتے ہیں، اور نظریات اس کے نزدیک بدیہیات ہوتے ہیں، ان کا کلام بالترتیب ہی ہوتا ہے، گو اصطلاحات بھی استعمال نہ ہوں ، اور گاہے اصطلاحاتِ منطقیہ کا استعمال فرماتے ہیں، جیسا کہ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ اصطلاحاتِ منطقیہ کا استعمال فرماتے تھے اور حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو تعجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ ہاں گاہے گاہے اصطلاحات کا بھی الہام ہوتا ہے۔

الغرض بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق چل رہی تھی کہ آپ نے دلیل لِمّیؔ ورِاِنّی کہاں سے بیان فرمائی؟ آپ کے زمانے میں تو منطق نہ تھی، تو دیکھنا یہ ہے کہ اصطلاح وعنوان گو نہیں تھا مگر اعتبار معنون کا ہوتا ہے اور معنون یہاں موجود ہے، مُعَنْوَن ہی سے عنوان نکلتا ہے، چنانچہ کل بعد جمعہ مجلس میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات پڑھ رہا تھا، اس میں حضرت والا نے فرمایا کہ امور تکوینیہ کی خدمات اکثر مجاذیب کے سپرد ہوتی ہیں جو شرع کے زیادہ مکلف نہیں

ہوتے، ان کے اسرار کا سمجھنا بہت مشکل ہے، اور فرماتے ہیں کہ اس کو میں نے ایک جگہ وعظ میں بیان کیا تو ایک عالمِ خشک نے اعتراض کیا تھا کہ قرآن وحدیث میں تو اس کا کہیں ذکر نہیں۔ میں نے کہا کہ جو اصطلاح وعنوان اہل تصوف استعمال فرماتے ہیں، وہ اگرچہ بعینہٖ قرآن وحدیث میں نہیں ہیں مگر معنون سب کا موجود ہے، اور معنون ہی اصل اور مقصود ہوتا ہے، عنوانات تو معنون ہی سے قائم ہوتے ہیں۔ سو قرآن پاک میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ موجود ہے، اس کو آپ کیا کہیں گے؟ اس پر وہ عالم صاحب خاموش ہو گئے۔

آگے حضرت نے فرمایا کہ جس کے تکوینی امور کی خدمت سپرد ہوتی ہے، اس کا صاحب تشریع سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، افضلیت صاحب تکوین پر صاحب تشریع ہی کو حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ خود اس واقعے میں دیکھ لیجئے! حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو صاحب تشریع تھے حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبِ تکوین پر فضیلت حاصل تھی۔

تو عنوانات اور اصطلاحات کا قرآن وحدیث میں ہونا ضروری نہیں ہے، صرف معنون کا ہونا کافی ہے، یہ سب عنوانات واصطلاحات تو متأخرین نے بہ ضرورت اہل فلسفہ کے مقابلے میں استعمال فرمائے ہیں، دلیل لمّی اور اِنّی کے منطقی اصطلاحی الفاظ اگرچہ حضور اکرم ﷺ نے استعمال نہیں فرمائے مگر علت سے معلول کی طرف آنا اور معلول سے علت کی طرف آنا جو دلیل لمّی اور اِنّی کی حقیقت ہے، وہ حضور اکرم ﷺ کے کلام میں موجود ہے، جیسا کہ یہاں ارشاد ہے: **اِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوٰی** کہ اگر نیت دیکھنا ہو تو اعمال کو دیکھ لو تو اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے ہمیں اعمال کو دیکھ کر بہ طور دلیل اِنّی قضاءً نیت پر حکم جاری کرنے کی اجازت فرمادی۔

چنانچہ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب (۱) رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عاشق تھے، بڑے عجیب انسان تھے، ان کے سامنے ایک صاحب اللہ تعالیٰ سے محبت کا بہت اظہار کر رہے تھے اور بڑی بڑائی اور فخر کی باتیں کر رہے تھے، حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیر تک خاموش سنتے رہے، مگر جب ان صاحب کو ڈینگیں مارتے ہوئے بہت دیر ہوگئی تو فرمایا کہ جی ہاں! آپ کی محبت الٰہی تو آپ کے چہرے اور وضع قطع ہی سے ٹپک رہی ہے، اور یہ اس لیے فرمایا، چوں کہ محبت کے لیے اطاعت لازم ہے اور کمال محبت کے لیے کمالِ اطاعت لازم ہوتی ہے، یہ حضرات صراحتاً تو کسی کو کچھ کہتے نہیں محض اشارہ فرمادیتے ہیں، جیسا کہ یہاں خواجہ صاحب نے اشارہ فرمادیا کہ آپ کی محبت تو آپ کی وضع قطع شکل وصورت سے ہی ظاہر ہو رہی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے مگر تعدیل ارکان نہیں کر رہا ہے، یا گھوڑے کی طرح ایک پیر پر ہی سہارا دے کر کھڑا ہے، حالاں کہ نہ وہ بیمار ہے، نہ بوڑھا ہے، نہ موٹے جسم والا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے دل میں خشوع وخضوع نہیں ہے، ورنہ اس کے اثرات ضرور ظاہر ہوتے، چوں کہ قاعدہ ہے :

---

(۱) حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ: حکیم الامت حضرت علامہ اشرف علی تھانویؒ کے عاشق، مجذوب صفت بزرگ، تقوی وطہارت کے پے کر حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ کی ولادت ۱۲/جون ۱۸۸۴ء کو ہوئی، علیگڑھ کالج میں پڑھ کر ڈپٹی کلکٹر بنے، ۱۳۳۶ھ میں حضرت تھانویؒ کے اِلٰہ آباد تشریف لانے پر وہاں حضرتؒ سے تعلق قائم کیا اور پھر حضرت تھانویؒ کی خدمت اختیار کرلی، کلکٹر کے عہدے کو چھوڑ کر انسپکٹر آپ اسکولر کے عہدے پر فائز ہوئے حضرت تھانویؒ سے تعلق اتنا گہرا تھا کہ فنا فی الشیخ تھے، آپؒ نے حضرت تھانویؒ کی سوانح ''اشرف السوانح'' چار جلدوں میں تصنیف کی ہے، ۱۷/اگست ۱۹۴۴ء کو حضرت تھانویؒ کے یہ عاشق دار البقاء کی طرف کوچ کر گئے، آپ کی تصنیفات میں کشکول مجذوب اور قطعاتِ مجذوب قابلِ ذکر ہیں۔

اذاثبت الشئ ثبت بآثارہ ولوازمه اورخضوع وخشوع کی حقیقت اوراس کے آثار **ماالاحسان** (۱) والی حدیث میں مشکوٰۃ شریف میں آپ حضرات پڑھ کر آئے ہیں، اورمزید جب یہ حدیث بخاری شریف میں آوے گی، ان شاء اللہ وضاحت کردی جائے گی۔

اصل بحث معلول کو دیکھ کرعلت پرحکم لگانے کی چل رہی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے معلول کو دیکھ کرعلت پرحکم لگانے کی قضاءً اجازت فرمادی ہے، اسی کو بطور دلیل لمّی **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** سے اور بطور دلیل إنّی **إِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى** سے بیان فرمادیا، اس تقریر سے بھی جملہ **إِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى** کی تکرار کا فائدہ واضح اور ظاہر ہوگیا کہ **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** سے موافق نیت اعمال کا صدور اور **إِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى** میں اعمال سے نیت کا ظہور بیان فرمایا ہے۔

اس کے بعد فائے تفریعیہ لاکر اب آگے فرماتے ہیں **فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ** الحدیث، اس میں لفظِ ہجرت ہے جس کے معنیٰ جدا ہونے اور الگ ہونے کے ہیں، یہ لفظ لغوی حیثیت سے عموم کو لیے ہوئے ہے، اب اس کی آگے بہت سی شاخیں ہیں، چنانچہ ہجرت تین قسم کی ہوتی ہے : ایک انتقال من مکانٍ الی مکانٍ آخر: ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا، ایک ملک سے دوسرے ملک یا ایک شہر سے کسی دوسرے شہر کو چلے جانا اور شریعت میں دارالحرب سے دارالامن کی طرف جانے کو ہجرت کہتے ہیں، دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف جانے ہی کو ہجرت نہیں کہتے، بلکہ دارالکفر سے دارالامن کو چلا جانا بھی ہجرت میں داخل ہے، جیسا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی، حالاں کہ حبشہ اس وقت دارالکفر تھا مگر وہاں امن موجود تھا؛ لہٰذا یہ بھی ہجرت شمار ہوئی (۱)۔

---

(۱) مشكوة المصابيح، ۱/۱۱، كتاب الإيمان، الفصل الأول.
(۲) فتح البارى، ۱/۲۰.

دوسری قسم ہے ہجرت کی معصیت سے نکل کر طاعت کی طرف آنا، مثلاً نظر ممنوع سے نظر کو ہٹا کر غض بصر کرنا — جو کہ وہ طاعت ہے — ہجرت ہے، جس کا ذکر ﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ [النور: ۳۰] میں ہے، اسی لیے صوفیہ کا طریق نظر برقدم ہے، واقعی پڑھتے پڑھاتے تو ہم ہیں مگر قرآن وحدیث پر عمل صوفیائے کاملین، اہل حق ہی کا ہے۔

تیسرے معنی ہجرت کے ماسوی اللہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہے، اس طرح کہ قلب کو ماسوی اللہ سے بالکل پاک کر کے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی محبت وطاعت دل میں آجائے، چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم أجمعین نے دربار رسالت میں عرض کیا کہ مہاجر کون ہے؟ تو ارشاد ہو: **الْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوب** (۱) اور ایک دفعہ فرمایا: **وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ** (۲) ، ہجرت کے حقیقی معنیٰ یہی ہیں، اس پر صوفیائے کاملین عامل ہیں، اور اس کو ان کی اصطلاح میں تجرید وتفرید کہتے ہیں، چنانچہ دارالکفر سے بھی ہجرت وہی کرے گا جو اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہو، چوں کہ ہجرت سے چار چیزوں کی حفاظت مقصود ہوتی ہے، ایمان، جان، مال، عزت، اور ان کی حفاظت کا اہتمام وہی کرے گا جو علائق دنیوی، ہوائے نفسانی اور اغوائے شیطانی سے پاک ہو چکا ہو، چوں کہ جو ان سے پاک ہو جائے گا، وہ صرف اللہ کا ہو جائے گا، اور تصوف میں ماسوی اللہ سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہی سکھایا جاتا ہے، اور یہ خانہ زاد نہیں، سب قرآن وحدیث میں موجود ہے، پھر اس پر علمائے خشک کا طعن واعتراض کس طرح درست ہوسکتا ہے۔

---

(۱) شعب الایمان للبیهقی ۱۳/ ۴۵۵، عَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ رضی الله تعالی عنه، بَابٌ فِي أَنْ يُحِبَّ الرَّجُلُ لِأَخِيهِ الْمُسْلِمِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ الخ رقم الحديث: ۱۱۰۶۱.

(۲) بخاری شریف ۱/ ۶، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رضی الله تعالی عنهما، کتاب الایمان ، بَابٌ :الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ ، الخ رقم الحديث: ۶۴۸۴.

الحاصل شہوات سے طاعات کی طرف، اغوائے شیطانی سے بقائے روحانی کی طرف، علائق دنیوی سے اللہ کی طرف آنا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہجرت میں داخل ہے، اس ہجرت کا مقصود قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور مشاہدۂ حق کا تقاضا ہوتا ہے، کوئی دوسری مصلحت :جلبِ منفعت یا دفع مضرت مقصود نہیں ہوتی، اسی کو حضور اکرم ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ جب تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے تو خواہ اعمالِ خیر ہوں یا معاصی کا ترک ہو، ہر جگہ نیت کا استحضار ہونا چاہئے۔

ایماناً واحتساباً کا مطلب

اسی کو دوسری احادیث میں جگہ جگہ ایماناً واحتساباً سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس کی تحصیل کا محل خانقاہ ہے، تو مدارس کے وجود کے ساتھ خانقاہوں کا وجود بھی لابدی ہے کہ ایک تعلیمی درس گاہ ہے اور دوسری تربیتی، علم مدارس میں حاصل کیا جائے اور اس علم کا انطباق خانقاہ میں کرایا جائے، اس سے آپ حضرات کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ تصوف شریعت ہی کا ایک اہم جزء ہے، بدون اس کے ایمان، ایمانِ کامل نہیں ہوتا، اور اس کا محل ہے خانقاہ تو بدون خانقاہ کے علم بھی علمِ کامل نہیں ہوتا۔

حدیث کو مختصر لانے کی وجوہ

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ نے حدیث شریف کے ایک حصہ کو — جو کہ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ ہے، اس کو — کیوں ترک فرما دیا؟ حدیث کو اختصار کے ساتھ کیوں ذکر فرمایا ہے؟ پوری حدیث کیوں ذکر نہ فرمائی؟ سو اس کے کئی جوابات ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو بذریعۂ حمیدی یہ حدیث انھیں الفاظ کے ساتھ پہنچی ہے، لہٰذا اتنے ہی الفاظ یہاں نقل فرمادئے (۱)۔

اس پر پھر یہ اشکال ہوتا ہے کہ کتاب حمیدی میں تو یہ پوری حدیث موجود ہے (۲)، اس کے باوجود یہ کہنا کہ امام بخاریؒ کو یہ روایت حمیدی کے واسطے سے اختصار کے ساتھ پہنچی، کیسے قابل تسلیم ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کتاب میں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ زبانی بھی انھوں نے یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پوری نقل کی ہو، ہوسکتا ہے کہ زبانی اختصار کے ساتھ ہی بیان فرمائی ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ امام بخاریؒ اجلّہ محدثین میں سے ہیں، ان کو اس اختصار سے ایک اعتراض واشتباہ کا دفعیہ مقصود ہے چوں کہ بعض حضرات اختصارِ حدیث کو جائز نہیں سمجھتے ہیں تو حضرت امام بخاریؒ نے اپنے عمل سے بتلادیا کہ حدیث کا اختصارًا ذکر کردینا بھی جائز ہے (۳)۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ترغیب کے باب سے ہے، اور ترغیب کے موقع پر احادیث کو مختصراً بیان کرنا، **الكناية ابلغ من التصريح** کے مطابق ابلغ اور انسب ہوتا ہے، جیسا کہ بلغاء کی عادت ہے۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ امام بخاریؒ کو روایت کرتے وقت یہ کھٹک پیدا ہوگئی کہ دوسرا جز نقل کرنے میں اپنی طرف دعویٰ کرنے پر دلالت ہوگی کہ میں بھی اس ہجرت الی اللہ کے ساتھ متصف ہوں، اور وہ اس طرح کہ میں امت کے لیے

---

(۱) وذكر قوم أنه لعله استملاه من حفظ الحميدي فحدثه هكذا فحدث عنه كما سمع. (فتح البارى، ۱/۱۵.)

(۲) ملاحظہ ہو: مسند الحميدي، ۱ ص ۱۳۸، أَحَادِيثُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ.

(۳) وهذا هو الراجح والله أعلم. فتح البارى، ۱/۱۵

احادیث کی اشاعت وترویج شروع کرر ہا ہوں، جو کہ ایک متعدی عبادت ہے اور اس علم حدیث کا حاصل کرنا لازمی عبادت تھی، جس سے فارغ ہو چکا ، اور اب عبادت متعدی یعنی نشر واشاعتِ احادیث کو شروع کرر ہا ہوں اور یہ بھی ایک ہجرت الی اللہ ہی کی قسم ہے، جیسا کہ علامہ ابن قیمؒ تلمیذ علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ قرآن پاک اور حدیثِ رسول کی تعلیم وترویج دونوں کی طرف نکلنا **هجرت الی الله والی الرسول** میں داخل ہے (اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ محض دنیا کی نیت سے کالج اور یونیورسٹی کے لیے نکلنا ہجرت الی دنیا ہے) تو گویا امام بخاریؒ نے خیال فرمایا کہ اب میں لازمی عمل سے متعدی عمل، یعنی نشر واشاعت احادیث شروع کرر ہا ہوں تو حدیث کے دوسرے جز **فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ** کو ذکر کر کے گویا اس بات کا مدعی ہوں کہ میں بھی مخلص ہوں، اور میری یہ ہجرت الی اللہ والی الرسول ہے، اس دعوی سے اجتناب فرماتے ہوئے گویا بتلاتے ہیں کہ اصل تو یہی ہے کہ ہجرت الی اللہ والی الرسول ہو، مگر ایسا بھی کیا کہ مومن کی ہجرت دنیا ہی کی طرف ہو کر رہ جائے (۱)۔

مکائد نفس وشیطان

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اہل اللہ کبھی بھی اپنی اصلاحِ نفس سے غافل نہیں ہوتے، برابر اپنی اصلاح کے لیے بیدار و ہوشیار رہتے ہیں، اس لیے وہ صورتِ دعویٰ وصورت تکبر سے بھی بچتے ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو؟ یہ معاملہ ہے بھی تو نہایت اہم، شیطان کی شرارت اور مکائد کو جان لینا اور ان سے بچنا آسان ہے، مگر مکائد نفس اور اس کی شرارتوں سے بچنا بہت ہی مشکل ہے، یہی راز ہے کہ شیطان کے بارے

(۱) وحاصله أن الجملة المحذوفة تشعر بالقربة المحضة والجملة المبقاة تحتمل التردد بين أن يكون ما قصده يحصل القربة أو لا فلما كان المصنف كالمخبر عن حال نفسه في تصنيفه هذا بعبارة هذا الحديث إلخ (فتح الباری، ۱/ ۱۵ .)

میں تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:﴿ اِنَّ كَيۡدَ الشَّيۡطٰنِ كَانَ ضَعِيۡفًا ﴾ [النساء:٧٦]اور نفس کی چالاکیوں کے باب میں﴿ اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ ﴿٢٨﴾ ﴾ [یوسف] فرمایا، بہرحال! یہ چاروجوہ حدیث مذکورہ کومختصرً الانے پر اشکال کے جواب میں ہوئیں۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ مفصل حدیث میں فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ ہےتواس صورت میں شرط وجزادونوں کے الفاظ متحد ہوگئے کہ جوالفاظ جانب شرط میں مذکورہیں، انھیں الفاظ کا جانب جزامیں اعادہ فرمادیا گیا،اس کی کیاوجہ ہے؟ یہ سوال پیداہوتاہے۔

سواس کی وجہ یہ ہے کہ ہجرت الی اللہ یعنی سیرفی اللہ وسیرالی اللہ کی کوئی انتہا نہیں ہے جیسا کہ صوفیائے کرام کے یہاں یہ سیرالی اللہ وسیرفی اللہ مطلوب ہے اوراس کی کوئی نہایت نہیں، اس لیے تادمِ آخراسی میں مشغول رہتے ہیں اوراپنی نگرانی سے کبھی غفلت نہیں فرماتے،اسی کومولانارومیؒ نے فرمایاہے۔

تادمِ آخردمے فارغ مباش (۱)	اندریں رہ می تراش ومی خراش

توجب سیرالی اللہ کی کوئی غایت ونہایت نہیں تواس کی جزابھی لاالی نہایہ ہوگی، اس کی بھی تعیین نہیں ہوسکتی، چوں کہ شرط جب لامتناہی ہے تو جزا بھی لامتناہی ہی ہونی چاہیے،اس لیے حضوراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے مسئلے میں جانب جزامیں کسی اورچیزکواختیارنہیں فرمایا،چوں کہ ہجرت الی اللہ کی جزااتنی اونچی ہے جواحاطۂ بیان سے باہرہے اورکیوں نہ ہو،مہاجرالی اللہ کامقصودبھی توذاتِ باری تعالیٰ ہےجس کی کوئی نہایت نہیں (۲)۔

(۱) اس کی راہ میں ہمیشہ کانٹ چھانٹ (جستجووترقی) کی کوشش کر، اورآخری سانس تک کسی وقت خالی نہ رہ۔

(۲) عمدۃ القاری، ج ۱ ص ٦٤.

حدیث میں لفظ ما ھاجر لانے کی وجوہ

اس کے بعد یہ بحث کہ **هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا** کی جزا کلمہ "ما" کے ساتھ کیوں بیان فرمائی؟ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ کلمۂ ما یہاں تحقیر کے لیے ہے، جیسا کہ کبھی تعظیم و تفہیم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جس کی مثال قرآن پاک میں ﴿**فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ**﴾ [طٰہٰ] ہے یعنی ان کو ڈھاپ لیا اس سمند نے جس قدر کے ڈھانک لیا، اور تحقیر کے لیے ما کے استعمال کی مثال ﴿**وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ**﴾ [طٰہٰ: ۶۹] ہے یعنی جو تمہارے ہاتھ میں ہے اس کو ڈال دو، اور پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔

چنانچہ یہی ہوا کہ جادوگروں کے جمع غفیر کے پاؤں اکھڑ گئے، جب عصائے موسیٰ نے بہ صورتِ اژدہا سب کے جادوؤں کو نگل لیا، اور پھر اپنا منہ فرعون کی طرف اٹھایا جو اپنے محل پر بیٹھا ہوا تھا، کہنے لگا: حضور معاف فرمائیے!، دیکھئے اب ہوش آیا، واقعی "ڈنڈا چلے تو بندر بھی ناچے" کی مثل خود صادق آئی ہے۔

الغرض ما یہاں حدیث شریف میں تحقیر کے لئے ہے (۱)، چوں کہ یہ دنیا طلبی کی جزا ہے جو کہ حقیر و ذلیل ہے، اس لیے جیسی شرط ویسی جزاء۔

یہاں الفاظِ شرط کا جانبِ جزا میں اعادہ نہیں فرمایا، جیسا کہ **فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ** میں اعادہ فرمایا گیا ہے، اس لیے کہ گندی چیز کا ذکر بار بار نہیں ہوتا، ضرورتاً صرف بقدر ضرورت ہوتا ہے، جیسے گالی دینا اور کسی کو برا کہنا شریف کی زبان پر نہیں آتا اور کبھی اگر آتا بھی ہے تو ایمائی اور کنائی طور پر آتا ہے، صراحتاً نہیں آتا، تو دنیا بھی بوجہ دنائت کے اس قابل نہیں کہ بار بار اس کا ذکر کیا جائے، اسی لیے کہا گیا ہے: **الدنیا مردودٌ والعقبی مقبولٌ** اور حدیث

(۱) عمدة القاری، ج ۱ ص ۶۴.

شریف میں ہے: فَوَ اللهِ لَلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللهِ، مِن هَذَا عَلَيْكُمْ (۱) کہ اللہ کی قسم اللہ کے ہاں یہ دنیا (اس مردار) سے بھی ذلیل ہے۔

اس پر اگر یہ کہا جائے کہ تکرار ذکر دنیا سے بھی پھر بھی حدیث خالی نہیں ہے، کیوں کہ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا میں طلبِ امرآۃ بھی داخل تھی، پھر أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فرمانا اعادہ پر مشتمل ہو گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تین چیزیں مؤمن کے واسطے فتنہ ہیں: زن، زر، زمین، ان تینوں میں سے سب سے بڑا فتنہ زن ہے، اس لیے خاص طور پر اس کی قباحت کی طرف متوجہ کرنا ضروری تھا، تو یہ ذکر الخاص بعد العام کے قبیل سے ہوا (۲) آپ نے کتابوں میں پڑھا ہوگا، اس کی مختلف وجوہ ہوا کرتی ہیں، اس لیے امرآۃ کا ذکر خاص طور پر فرمایا، چوں کہ اس حدیث کا شانِ ورود یہ ہے کہ ایک عورت ام قیس مسلمان ہوگئیں، اور ہجرت کر کے مدینے آگئیں، ایک صحابی نے ان سے نکاح کرنا چاہا تو انھوں نے ہجرت کر کے مدینہ آنے کی شرط لگائی، چنانچہ ان صحابی نے ہجرت اختیار فرمائی، آں حضرت ﷺ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو آپ نے مسجد میں عام عنوان کے ساتھ اخلاص کی دعوت دی اور عدم اخلاص کی مذمت بیان فرمائی، اس وقت سے ان صحابی کا لقب مہاجر ام قیس پڑ گیا، چوں کہ ہجرت آپ نے انھیں کے لیے کی تھی (۳)۔

---

(۱)　صحيح مسلم، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رضى الله تعالى عنهما، كِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، رقم الحديث: ۲۹۵۷.

(۲)　عمدة القارى، ج ۱ ص ۶۴.

(۳)　وإفرادها بعد دخولها في لفظ دنيا من باب ذكر الخاص بعد العامّ لأن الواقعة المذكورة في قصة المهاجر لتزويج امرأة فذكرت الدنيا مع القصة زيادة في التحذير. (ارشاد السارى، ج۸ ص ۹، باب مَنْ هَاجَرَ أَوْ عَمِلَ خَيْرًا لِتَزْوِيجِ امْرَأَةٍ فَلَهُ مَا نَوَى، رقم الحديث: ۵۰۷۰.)

احکام کے درجات

نکاح کا چوں کہ حدیث شریف میں ذکر آیا ہے، اس لیے اجمالاً یہاں بھی سمجھ لینا چاہئے کہ نکاح کرنا بعض حالات میں مستحب ہے اور بعض حالات میں سنت مؤکدہ، اور بعض حالات میں واجب اور فرض اور بعض حالات میں حرام ہوتا ہے۔

اسی طرح اور بھی بہت سے احکام میں درجات ہوتے ہیں جن کا جاننا ضروری ہوتا ہے، ورنہ ناواقفی اور بے خبری میں اپنے اور دوسروں پر تنگی کا ارتکاب اور تعدی حُدود میں پڑ کر بہ جائے طاعت وثواب کے عذاب ومعصیت کا مستحق ہوتا ہے، اور ''نیکی برباد گناہ لازم'' کا مصداق بن جاتا ہے، اور ناحق دوسروں کو مجرم اور گنہگار اور حقیر سمجھتا ہے، حالاں کہ عنداللہ وہ گنہ گار ومجرم نہیں ہوتا، اس لیے ہر طاعت سے پہلے اس کے حدود سے واقفیت بے حد ضروری ہے، من جملہ ان کے تبلیغ کا کام بھی ہے، اس کے کرنے سے پہلے اس کے حدود وشرائط کا جان لینا بھی ضروری ہے، اس کے بھی بہت سے اقسام ہیں وہ ہمیشہ فرض نہیں ہوتی بلکہ کبھی واجب کبھی مستحب اور کبھی حرام بھی ہوتی ہے، تفصیل کا اس وقت موقع نہیں، پھر کبھی دیکھا جائے گا، تو بیان لفظ ینکحھا پر تھا کہ چوں کہ شانِ ورود صحابیؓ کا مکہ معظّمہ سے ام قیس سے نکاح کے لیے ہوا، اس لیے ہجرت الی الدنیا کے ساتھ مخصوص طریق سے ینکحہا کو بھی ذکر فرما دیا۔

اب آگے حدیث میں لفظ یُصِیْبُھَا ہے، یہ اِصَابَۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں تیر چلانا، ٹھیک نشانہ پر تیر پہنچانا، یہاں شہوت نفسانی کو تیر قرار دے کر اس کو پورا کرنا مراد لیا گیا ہے تو نکاح اگر چہ اچھا ہے مگر ہجرت بہت ہی اعلیٰ ہے، اس سے نکاح کا قصد کرنا غیر مقصود کو مقصود بنا لینا ہے، ہجرت کا مقصود تو صرف رضائے حق اور تعمیل حکمِ خداوندی ہونا ضروری ہے، ہجرت کے علاوہ نکاح

وغیرہ کی نیت سے ہجرت کا ثواب حاصل نہیں ہوگا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہجرت باطل ہوجائے گی، ورنہ تو ان صحابی کو اعادۂ ہجرت کا حکم ہوتا جب کہ ایسا ہوا نہیں۔

حدیث إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ مدارِ اختلاف شوافع واحناف نہیں

لہٰذا اس سے یہ مسئلہ صاف ہوگیا کہ بِالنِّيَّاتِ کو صحت کے ساتھ مقید کرنا صحیح نہیں، جیسا کہ شوافع کرتے ہیں، تو حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ ہجرت اگرچہ نکاح کی نیت کے ساتھ ہوئی مگر اس کو صحیح مان لیا گیا، اس لیے دوبارہ ہجرت کرنے کا حکم نہیں فرمایا گیا، پس اس حدیث سے وضو کے اندر بھی نیت کو شرط قرار نہیں دیا جاسکتا، جب اس حدیث سے وضو میں نیت کا شرط ہونا ثابت نہیں ہوتا، تو اب شوافع اس کا جواب دیں گے کہ وہ پھر کس دلیل سے وضو میں نیت کو شرط قرار دیتے ہیں۔

اس بیان کے بعد وہ اختلاف بھی حل ہوجاتا ہے جو احناف وشوافع کے درمیان وضو میں نیت کے بارے میں مشہور ہے اور وہ یہ کہ احناف فرماتے ہیں کہ نیت وضو میں شرط نہیں اور شوافع فرماتے ہیں کہ شرط ہے، اور دونوں اپنے استدلال میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں مگر جب یہ معلوم ہوگیا کہ نیت سے مراد نیت شرعی نہیں تو پھر إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال ظواہر میں سے ہیں، اور نیت باطنی اور چھپی ہوئی چیز ہے، بندہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور اس پر حکم لگاتا ہے، حق تعالیٰ نیت کو دیکھتے ہیں، اس لیے آں حضرت ﷺ کے ذریعہ بطور وحی باطنی معنوی إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ فرماتے ہیں کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے، اب جب کہ نیت

کے اندر معنی شرعی مراد نہیں تو شوافع کا وضو میں صحت الاعمال وغیرہ مقدر نکالنا بحث سے خارج ہے۔

چوں کہ نیت ان چیزوں میں جاری ہوگی، جہاں متعدد صورتوں کا ایہام ہو یا متعدد اشباہ کے اندر تمیز دینا ہو، ایہام کی مثال مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں، اس میں متعدد احتمال ہیں، ایک احتمال یہ ہے کہ اس لیے نماز پڑھتے ہیں؛ تا کہ لوگ ہم کو نمازی ومتقی کہیں، ایک یہ کہ ہم محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے پڑھتے ہیں، چوں کہ یہاں متعدد احتمالات ہیں، لہٰذا نیت کا جاری کرنا ضروری ہوگا، اور تمیز دینے کی مثال، جیسے : ظہر کی نماز کہ اس کو غیر (عصر، عشا وغیرہ) سے تمیز دینے کے لیے ظہر کی نیت کرنا ضروری ہوگا۔

لہٰذا فقہاء جس نیت سے بحث کرتے ہیں یعنی نیت شرعی وہ یہاں مراد نہیں اور جو مراد ہے یعنی نیت بمعنی لغوی وہ ان کا مستدل نہیں، چوں کہ وضو کی متعدد صورتیں نہیں جن کے اندر ایہام سے احتراز کے لیے نیت کی ضرورت ہو، کیوں کہ یہاں نہ متعدد صورتوں میں ایہام ہے اور نہ ایک عمل کو دوسرے عمل سے تمیز دینا ہے، اس لیے تحقق وضو کے لیے نیت کی ضرورت ہی نہیں، وہاں تو اعضاء کو پاک وصاف کرنے کے لیے مائے طاہر مطہر کا استعمال کرنا ہے کہ جب اس کو استعمال کریں گے تو وہ شئے بدون نیت پاک وصاف ہوجائے گی اور پاکی وطہارۃ پر نماز کا صحیح ہونا موقوف تھا، لہٰذا نماز صحیح ہوجائے گی مثل کپڑے وغیرہ کے، جیسے وہاں پانی سے پاک کرنے کے لیے نیت کو کوئی شرط نہیں کہتا، اسی طرح غسل اعضائے وضو میں بھی ہے، لہٰذا اس حدیث میں صحت کا لفظ مقدر نکالنا وضو کے صحیح ہونے کے لیے درست نہ ہوا، البتہ وضو کے درجۂ عبادت میں آنے کے لیے کہ اس پر ثواب بھی مرتب ہوجائے، نیت کرنا ہوگا، نہ کہ صحت وضو کے لیے، پس یہ حدیث وضو میں نیت کے شرط ہونے کے لیے مستدل نہیں ہوسکتی، میں نے شوافع

کا لفظ بولا ہے، شافعی نہیں کہا؛ تا کہ ایہام بے ادبی کا نہ ہو، بفضلہٖ تعالیٰ میں اس کی بڑی احتیاط کرتا ہوں، آخر میں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یصیبھا ہجرت کا حال مقدرہ ہے، ہجرت کا حال مقارنہ نہیں ہے، اس لیے کہ ہجرت کے ساتھ حصول دنیا مقارن نہیں ہے، اور اسی طرح ینکحھا بھی حال مقدر ہے، مقارنہ نہیں ہے، چوں کہ ہجرت کے ساتھ نکاح مقارن نہیں ہے۔

الحاصل حدیث شریف میں **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** دلیل لمّی کے طور پر اور **وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى** دلیل إنّی کے طور پر ہے، جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ امام غزالیؒ نے نیت کے معنیٰ **انبعاث القلب لالی مایراه موافقا للغرض اما فی الحال او فی المال** بیان فرمائے ہیں یعنی قلب کا کسی غرض، جیسے: منفعت کے حصول یا مضرت کے دفع کرنے کے لیے حرکت کرنا، یہاں جلب منفعت سے مراد احکام الٰہی کی آزادی کے ساتھ پوری پابندی کرنا ہے، اور رکاوٹوں اور الجھنوں کو — جو دینی مضرت ہے — دفع کرنا ہے تو نیت کے یہ لغوی معنیٰ یہاں متحقق ہیں اور نیت کے شرعی معنیٰ اخلاص کے بھی یہاں موجود ہیں کہ ہجرت سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مقصود صرف رضائے الٰہی کا حصول تھا، کوئی دوسری غرض بالکل نہ تھی۔

اخلاص کی ضرورت

اخلاص کے ذکر سے شروع کرنے سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ امام بخاریؒ اپنے لیے بھی استحضاراً اور دوسرے پڑھنے والوں کے لیے بھی ترغیباً وتعلیماً حدیث مذکور کو لائے ہیں، گویا یوں فرماتے ہیں کہ پہلے سوچ لو کہ کس لیے پڑھ رہے ہو؟ علم حاصل کرنے سے کیا غرض ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے، جیسا کہ آج کل بعض حفاظ وقراء خیال کرتے ہیں کہ بمبئی، کلکتہ، میسور، مدراس وغیرہ کی طرف جاؤں گا،

اور رمضان کی آمدنی سال بھر کے لیے کافی ہوجائے گی، اسی طرح بعض قرآت وتجوید کی مشق اس لیے کرتے ہیں، تا کہ مشاہرۂ امامت زیادہ ہو، تراویح میں آمدنی زیادہ ہوجائے، یہ اخلاص کے خلاف ہے اور ہجرت الی دنیا کے اندر داخل ہے۔

علی ہٰذا القیاس تحصیل علم بھی ہے، اس کے متعلق امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ تحصیل علم دین کے اندر بھی احتساب واستحضار، اخلاص مشغلہ ہو، اسی کو دوسری حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن احکم الحاکمین کی عدالت میں غازی، عالم اور سخی کی پیشی ہوگی، اور تینوں اپنے جہاد فی سبیل اللہ، تعلیم وتعلم اور مشغلۂ علم دین اور اپنی خیرات وصدقات کا اظہار کریں گے، حکم ہوگا کہ سب اعمال تم نے چوں کہ محض دکھاوے اور نام آوری کے لیے اسی غرض سے کیے تھے تا کہ لوگ تمھیں کہیں کہ فلاں شخص بڑا عالم ہے، فلاں شخص بڑا سخی ہے، سو یہ باتیں حاصل ہولیں کہ دنیا میں تم کو شہرت حاصل ہوئی اور لوگوں نے تم کو غازی اور عالم اور سخی کہہ کر پکارا، پھر جس مقصد کے لیے اعمال کیے تھے، جب وہ حاصل ہو چکے تو اب کیا استحقاق رہا؟ اور یہاں کیا چاہتے ہو؟ لہٰذا جاؤ! جہنم میں (۱)۔

دیکھئے! حدیث شریف سے کس درجہ عدم اخلاص یعنی ریا پر وعید معلوم ہوئی، **اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَامِنْهُ**، اسی لیے امام بخاریؒ نے حدیث **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** کو ابتدا میں لا کر تنبیہ فرمادی کہ دیکھنا علم حاصل کرنے سے مقصود تمہارا صرف رضائے الٰہی ہو، طمع وحرص اور حبِّ مال وجاہ نہ ہو، علم کا حاصل کرنا جتنا مہتم بالشان عمل ہے، اسی درجہ اہتمام کے ساتھ اخلاصِ نیت کا بھی استحضار ہونا چاہئے، ورنہ اگر علم کے حاصل کرنے سے غیر خدا کو مقصود بنایا گیا، تو یہاں چندروزہ فانی مال وجاہ، سازوسامان سب ختم ہوجائے گا اور آخرت میں بجائے اجروثواب کے

(۱) صحیح مسلم، ۲/۱۴۰، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ تعالی عنه، کتاب الإمارة، بَابُ مَنْ قَاتَلَ لِلرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ اسْتَحَقَّ النَّارَ، رقم الحديث: ۱۹۰۵.

عذاب خداوندی میں گرفتار رہونا پڑے گا، تو امام بخاریؒ نے اس حدیث شریف کو لا کر ہمیں اخلاص کی طرف اہتمام کے ساتھ متوجہ فرمادیا کہ جس شئ کو جس درجہ کی اہمیت ہو، اسی درجہ پر اہتمام لازم ہے (۱)۔

اس کے بعد یہ بحث ہے کہ اس حدیث کی تخریج کس کس نے کی ہے اور امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو کہاں کہاں ذکر فرمایا ہے؟ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی تمام اصحابِ ستہ نے تخریج کی ہے، اس پر بعض نے یہ اعتراض کیا ہے کہ موطا امام مالک میں تو یہ حدیث نہیں ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاریؒ صفحہ ۱۳ پر اس حدیث کو امام مالکؒ سے روایت کیا ہے، لہٰذا اگر موطا میں نہیں ہے تو یہاں امام مالکؒ کی روایت موجود ہے (۲)۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حیدرآباد میں ایک عالم ہوئے ہیں جو حافظِ بخاری سے مشہور تھے، ان کو بخاری شریف کی تمام حدیثیں مع سند کے یاد تھیں، وہ فرماتے ہیں کہ موطائین دونوں ایک ہی ہیں، فرق راویوں کا ہے، ایک کے راوی محمد بن حسن شیبانی حنفیؒ (۳) ہیں اور ایک کے راوی یحییٰ بن یحییٰ مالکی (۴)

---

(۱) تقریر بخاری شریف (شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ) ج ۱ ص ۷۶.

(۲) ملاحظہ ہو: صحیح البخاری، ج ۱ ص ۱۳، کتاب الإیمان، بَابٌ: مَا جَاءَ إِنَّ الأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالحِسْبَةِ، وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، رقم الحدیث: ۵۴.

(۳) امام محمد بن حسن شیبانیؒ، پورا نام: ابوعبداللہ محمد بن حسن بن فرقد شیبانی، امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور مشیر خاص تھے، ان کا اصل قریہ ہرستا ہے، یہ غوطہ دمشق کے قریب ہے، جب کہ ان کی پیدائش واسط میں ہوئی اور زیادہ زندگی کوفہ میں گذاری، سن ولادت ۱۳۲ھ یا ۱۳۵ھ ہے، امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کی سماعت کی، ۱۸۹ھ میں ۵۸ر سال کی عمر میں رے کے مقام بنویہ نامی بستی میں انتقال ہوا۔ (سیر أعلام النبلاء، ۸۲/۸)

(۴) یحیی بن یحیی بن کثیر بن وسلاس بن شملال، ابومحمد لیثی، المصمودی، اندلسی، قرطبی، حدیث وفقہ کے زبردست امام ہیں، ان کی ولادت ۱۵۲ھ میں ہوئی، امام مالکؒ سے موطا کی سماعت کی، ان ہی کی روایت سے موطا زیادہ رائج ہے، آپ کی وفات رمضان ۲۹۸ھ میں ہوئی۔ (سیر أعلام النبلاء، ۲۰۰/۹)

ہیں، امام محمد بن حسن نے امام مالکؒ (۱) سے تین سال تک مدینہ رہ کر حدیثیں حاصل کیں مگر اس کے باوجود وہ حنفی رہے، ان کے دلائل اور تقاریر سے کوئی اثر نہیں لیا، پختگی اس کو کہتے ہیں، یہ نہیں جیسا کہ آج کل بعض کا حال ہوتا ہے، آج ایک کے پیچھے ہوئے کل دوسرے کے پیچھے اور پھر تیسرے کے، یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ اسی طرح امام شافعیؒ بھی کئی سال تک امام محمدؒ کی تلمذی میں رہے، مگر اپنے طریق پر پختہ رہے، اپنا طریق نہیں چھوڑا، حنفی نہیں ہوئے، اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ نے امام شافعیؒ سے استفادہ کیا مگر شافعی نہیں ہوئے، یہ اجتہاد کا زمانہ تھا، ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کی تقلید جائز نہیں تھی، اب وہ زمانہ ختم ہو گیا اور دروازہ اس اجتہاد کا بند ہو گیا، اب تقلید شخصی یعنی ایک معین مجتہد کی پیروی واجب اور ضروری ہے، یہ درست نہیں کہ کہیں ایک مجتہد کے قول پر عمل کرلیا اور کہیں دوسرے مجتہد کے قول پر، یہ نفس پرستی ہے اور اس کو اصطلاح میں تلفیق کہتے ہیں اور یہ جائز نہیں۔

الغرض بات حیدرآبادی عالم کے جواب کی تقریر کی چل رہی تھی، وہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت موطا امام محمد میں موجود ہے، اور موطا امام محمد اور موطا امام مالک دونوں ایک ہی ہیں، لہٰذا موطا امام محمد میں ہونا موطا امام مالک ہی میں ہونا ہے، لہٰذا یہ اشکال کہ ''جب روایت موطا امام مالک میں نہیں ہے تو اس کا صحاح ستہ میں ہونا ثابت نہیں رہا'' رفع ہو گیا، اور امام بخاریؒ نے اپنے صحیح میں اس حدیث کو **باب وحی** (۲) کے علاوہ **کتاب الایمان** (۳)، **باب فی العتق** (۴)، **کتاب**

(۱) مالک بن انس بن مالک بن عمر، اہل سنت والجماعت کی نظر میں فقہ وحدیث کے مستندترین امام ہیں، مدینہ منورہ میں ۹۳ھ میں ولادت ہوئی، امام مدینہ، امام اہل حجاز، امام دارالہجرۃ کے القاب سے مشہور ہوئے، آپ کا شمار مجتہدین، فقہاء اور عظیم محدثین میں ہوتا ہے، آپ کی وفات ۱۷۹ھ میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔ (سیر أعلام النبلاء، ۸/۷ ۳۸۲ تا ۴۳۴)

(۲) صحیح البخاری، ۲/۱، باب كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ؟ ←

النکاح (۱)، باب ھمزة النبی ﷺ (۲)، کتاب الایمان والنذور (۳)، اور کتاب الحیل (۴) میں ذکر کیا ہے، الحمدللہ اس حدیث کے جملہ مباحث پر کلام ہو چکا۔

انطباقِ حدیث علی ترجمۃ الباب

اب یہ اخیر کی بحث رہ گئی کہ اس حدیث شریف کو ترجمۂ باب سے کیا مناسبت ہے، سوعرض ہے کہ اگر آپ کو بداءتِ وحی کی تقریر محفوظ ہوگی تو حدیث کی مناسبت ترجمۂ باب کے ساتھ بہت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی، چوں کہ وہاں بدء الوحی کی متعدد توجیہات بیان کی گئی تھیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ بدء الوحی سے مراد مطلق وحی ہے، قطعِ نظر بداءت وعدمِ بداءت سے، پھر اس توجیہ پر لفظ بدء کے زائد ہونے پر متعدد اشکالات کے جوابات دئے گئے تھے، تیسری توجیہ یہ تھی کہ مراد بیان رسالت ونبوت ہے، چوتھی توجیہ یہ تھی کہ مراد نزول وحی ہے، پانچویں یہ تھی کہ مراد مبداء وحی ہے، چھٹی یہ تھی — جو کہ حضرت شیخ الہندؒ نے بیان فرمائی تھی — کہ مراد وحی کی عظمت وعصمت وطاعت کا بیان ہے، تو جب بدء

←(۳) صحیح البخاری، ۱۳/۱، کتاب الإیمان، باب مَا جَاءَ إِنَّ الأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالحِسْبَةِ، وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى.
(۴) ۳۴۳/۱، بَابُ فِي العِتْقِ وَفَضْلِهِ، بَابُ الخَطَإِ وَالنِّسْيَانِ فِي العَتَاقَةِ وَالطَّلاَقِ وَنَحْوِهِ، وَلاَ عَتَاقَةَ إِلَّا لِوَجْهِ اللهِ.
(۱) ۵۵۱/۱، بَابُ هِجْرَةِ النَّبِيِّ ﷺ وَأَصْحَابِهِ إِلَى المَدِينَةِ، رقم الحدیث: ۳۸۹۸.
(۲) ۷۵۸/۲، کتاب النکاح، بَابُ مَنْ هَاجَرَ أَوْ عَمِلَ خَيْرًا لِتَزْوِيجِ امْرَأَةٍ فَلَهُ مَا نَوَى، رقم الحدیث: ۵۰۷۰.
(۳) ۹۸۹/۲، کتاب الأیمان والنذور، باب النیة فی الأیمان، رقم الحدیث: ۶۶۸۹.
(۴) ۱۰۲۸/۲، کتاب الحیل، بَابُ فِي تَرْكِ الحِيَلِ، وَأَنَّ لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى فِي الأَيْمَانِ وَغَيْرِهَا، رقم الحدیث: ۶۹۵۳.

الوحی کی یہ تمام توجیہات آپ کے سامنے آچکیں تو اب اس حدیث کی باب سے مناسبت معلوم کرلینا نہایت سہل اور آسان ہے اور وہ اس طرح پر کہ پہلی توجیہ یہ تھی کہ مراد ترجمہ باب سے مطلق وحی ہے، اور اس کے متعلق آیت تھی جیسا کہ علامہ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ کے بیانات سے معلوم ہو چکا اور آخر میں خلاصہ کے طور پر وحی کی دو قسمیں وحیٔ ظاہری، وحیٔ باطنی بعنوان دیگر وحیٔ جلی، وحیٔ حقی، اور پھر ہر ایک کی تین تین قسمیں بیان کی تھیں تو وحی بھی وحیٔ حقی وحیٔ معنوی ہے جو اقسام ستہ وحی میں سے ایک قسم ہے تو اس توجیہ پر بھی باب سے حدیث کی مناسبت ظاہر ہے، چوں کہ باب بیانِ وحی کا تھا اور یہ حدیث حضور اکرم ﷺ کا ارشاد عالی ہے جو کہ وحی حقی ہے؛ لہٰذا حدیث باب سے مناسبت ثابت ہوگئی۔

دوسری توجیہ بنا بر مناسبت اس طرح کہ بدء الوحی سے مراد امر دینی تھا اور اس حدیث میں بھی امر دین یعنی اخلاص کا بیان ہے جو تمام امور دین میں روح اور حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے اور مدارِ اعمال ہے۔

تیسری توجیہ شیخ نور الحق محدث دہلویؒ کی بیان فرمودہ یہ تھی کہ مراد ترجمہ باب سے نبوت و رسالت کا بیان ہے تو اس حدیث میں بھی در بار نبوت و رسالت ہی کا ذکر ہے کہ وہاں سے یوں ارشاد ہوا، لہٰذا مناسبت حدیث کی باب سے ظاہر ہے۔

چوتھی توجیہ یہ تھی کہ بدء الوحی سے نزول وحی مراد ہے، اس توجیہ پر مناسبت اس طرح ہے کہ مدینہ طیبہ میں آپ نے تشریف آوری پر دخولِ مدینہ کے بعد ارشاد فرمایا تھا تو وہ اس وحی کے نزول کا وقت تھا، یہی نزول وحی کا باب تھا، پس مناسب ظاہر ہے(۱)۔

پانچویں توجیہ یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ بدء الوحی سے مبدأ وحی مراد ہے، فرماتے ہیں کہ مبدأ اصل ذاتِ مرسل وموحی اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ

---

(۱) عمدة القاری، ج ۱ ص ۱۷.

تعالیٰ نے بواسطۂ جبرئیل علیہ السلام حضور اکرم ﷺ پر وحی نازل فرمائی اور رسول اس کلام کو فرمارہے ہیں اور رسول کا کلام حق تعالیٰ ہی کا کلام ہوتا ہے جیسا کہ کہا ہے:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود	گرچہ از حلقوم عبداللہ بود (۱)

مطلب یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ کا کہنا اللہ تعالیٰ ہی کا کہنا ہے، گرچہ بندے کی زبان سے نکل رہا ہے۔ ع زبان اپنی ہے بات ان کی جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ تو نطقِ نبی بھی وحی ہے، اسی طرح جبرئیل علیہ السلام واسطۂ وحی ہیں تو قرآن کلام الٰہی ان کی زبان بھی ہے، چنانچہ ایک شخص نے خواب دیکھا کہ جبرئیل علیہ السلام کی زبان پر کھڑا ہوں، یہ خواب انھوں نے حضرت شاہ صاحب (۲) کی خدمت میں عرض کیا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ تمہارے مصلّے کے نیچے قرآن پاک کا ورق ہوگا، دیکھا تو واقعی مصلّے کے نیچے قرآن پاک کا ورق نکلا، لوگوں کو اس تعبیر پر بہت تعجب ہوا، عرض کیا کہ حضرت نے کیسے سمجھا تو فرمایا کہ قرآن جبرئیل علیہ السلام کی زبان کے ذریعہ سے ہی تو نازل ہوا ہے۔

(۱) اس کا کہا ہوا رب کا (ہی) کہا ہوا ہے، اگرچہ عبداللہ (اللہ کے بندے) کی زبان سے نکل رہا ہے۔

(۲) **تنبیہ**: مابین العلماء یہ اصطلاح مقرر ہے کہ جب شاہ صاحب بولا جاتا ہے تو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ مراد ہوتے ہیں، (لیکن اس زمانے میں اکثر وبیشتر حضرت علامہ کشمیریؒ مراد ہوتے ہیں: محمد کلیم نعمانی) اسی طرح جب حضرت نانوتوی بولا جاتا ہے تو حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ مراد ہوتے ہیں، حضرت گنگوہی سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت سہارنپوری سے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور حضرت تھانوی سے حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی مراد ہوتے ہیں، اور جب مولانا دیوبندی بولا جاتا ہے تو حضرت شیخ الہندؒ مراد ہوتے ہیں، حالاں کہ نانوتہ، گنگوہ، سہارنپور اور تھانہ بھون میں ان علماء کے علاوہ اور بھی بہت علماء ہوئے ہیں مگر اصطلاح مقرر ہوجانے کی وجہ سے جب علی الاطلاق بولا جاتا ہے تو یہی حضرات مراد ہوتے ہیں، جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ ۱۲۔ نصیر احمد غفرلہ

آخری بات حضرت شیخ الہندؒ کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ باب کا مقصد وحی کی عظمت وعصمت وطاعت کا بیان کرنا ہے (۳)، سو یہ توجیہ تشریح طلب ہے، اس لیے کہ حضرت شیخ الہندؒ متأخرین میں احادیث میں بالخصوص نہایت باریک بین تھے، اس لیے ان کی بات کو سمجھنے کے لیے تشریح وتمہید کی ضرورت ہے، لہٰذا پہلے ایک مقدمہ سمجھ لیا جائے وہ یہ ہے کہ حدیث شریف تین جملوں پر مشتمل ہے پہلا جملہ إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ اعمال کے لیے دلیل لِمّی کے طور پر ارشاد ہے کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے، نیت اعمال کے لیے علت ہے توجیسی نیت ہوگی، ویسے ہی اعمال صادر ہوں گے، اچھی نیت ہوگی تو اعمال بھی اچھے ہوں گے اور اگر نیت بُری ہوگی تو اعمال بھی بُرے ہوں گے۔

دوسرا جملہ وَإِنَّمَالِامْرِئٍ مَا نَوَى نیت کے لیے بطور دلیل ''إِنِّی'' کے ارشاد ہے کہ نیت کا حال اعمال کے دیکھنے سے معلوم ہوجاتا ہے، اعمال اچھے ہوں گے تو نیت کا اچھا ہونا معلوم ہوگا، اور اگر اعمال قبیح اور خراب ہوں گے تو نیت کا بُرا ہونا معلوم ہوگا، نیز اعمال حسنہ پر استقامت ومداومت بھی نیت کے قوی اور اعلیٰ ہونے پر دلالت کرے گا۔

تیسرا جملہ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا اس سے مدح وذم کا بیان فرمایا، اور ایک کا گھٹیا ہونا اور دوسرے کا بڑھیا ہونا بتلادیا اور یہ ماقبل کے اجمال کی تفصیل ہے کہ اگر نیت اچھی ہوگی تو عمل بھی اچھا اور مقبول ہوگا، بارگاہِ خداوندی میں پیش کیے جانے کے قابل ہوگا اور اگر نیت بُری ہوگی تو عمل بھی مقبول نہیں ہوگا، بلکہ غیر مقبول اور مردود ہوگا، خواہ وہ عمل ظاہر میں اچھا ہی کیوں نہ ہو، پس معلوم ہوا کہ حسبِ نیت ہی اعمال کا ارتقا وارتفاع ہوگا۔

(۱) الأبواب والتراجم، ص ۱۳ / از حضرت شیخ الہندؒ.

حدیث سے تہذیب اخلاق وتزکیۂ نفس کا ثبوت

آپ حضرات غور فرمائیے، نیت ایک باطنی چیز ہے جس کی درستی پر اس حدیث میں زور دیا گیا ہے، یہ اسلام کی خوبی اور طغرائے امتیاز ہے کہ وہ سطحیت اور ظاہر پرستی کو بالکل پسند نہیں کرتا، محض ظاہر ہی پر کسی عمل کا مدار نہیں رکھتا، بلکہ وہ ہر جگہ باطن کی صفائی اور پاکیزگی، تزکیہ باطن اور اخلاص کو اصل قرار دیتا ہے اور اس پر پورا زور دیتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے: إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَلَا إِلَى أَعْمَالِكُمْ وَإِنَّمَا يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَنِيَّاتِكُمْ (۱) اور اسی طرح اس پہلی ہی حدیث میں تزکیہ باطن اور تہذیب اخلاق کی اہمیت بتلا کر اس کے حاصل کرنے کی طرف پوری توجہ دلا دی گئی اور بد باطنی، بد اخلاقی خبث باطن اور شرارت نفس پر تنبیہ فرما دی۔

اس لیے مسلمان کو بالعموم اور طالب علم کے لیے بالخصوص اور بخاری شریف پڑھنے والوں کے لیے اخص الخاص ضروری ہے کہ تزکیہ نفس، تصفیۂ قلب اور اپنی اصلاح کی فکر میں لگ جائیں، اور اپنے ہر عمل میں اخلاص کا احتساب ہر سانس میں کرتے رہیں، یہ نہایت ہی اہم فریضہ ہے بلکہ یہ تمام فرائض کا موقوف علیہ ہے، اسی اصلاح نفس واصلاح قلب کا نام تصوف، سلوک اور طریقت ہے جو تمام شریعت کی جان اور روح ہے، بغیر تصوف حاصل کیے اسلام وایمان میں جان نہیں آتی، تمام اعمال مردہ اور بے جان ہوتے ہیں، قلب میں ایمان جاگزیں نہیں ہوتا،

---

(۱) مسلم شریف میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ وارد ہے: إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ، وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی الله تعالی عنه، بَابُ تَحْرِيمِ ظُلْمِ الْمُسْلِمِ، وَخَذْلِهِ، وَاحْتِقَارِهِ وَدَمِهِ، وَعِرْضِهِ، وَمَالِهِ، رقم الحديث : ۲۵۶۴ .) البتہ تفسیر رازی ۴/۷ اور روح المعانی ۸/۴۳ میں یہ حدیث بلفظہ موجود ہے لیکن حوالہ نہیں ہے۔

اور جب تک کوئی چیز راسخ اور جاگزیں نہیں ہوجاتی، اس کے زوال کا خطرہ اور اندیشہ رہتا ہے۔

اسی واسطے امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ جو تصوف حاصل نہ کرے اس کے سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے، واقعی خوب فرمایا اور صحیح فرمایا :**وَ كَذَلِكَ الإِيمَانُ حِينَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوبَ** (۱) جو حدیث میں ہے اس سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے، یہ قلب میں جاگزیں ہوجانا ہی وہ درجہ ہے جس کو ایک حدیث میں حلاوۃ الایمان (۲) سے تعبیر فرمایا ہے، اب آپ سمجھ گئے یہ ہے صحیح تصوف جس کے بغیر چارہ نہیں۔

تصوف کی ضرورت وفرضیت

پس معلوم ہوا کہ تصوف حاصل کرنا اور صوفی بننا بالکل ضروری ہے، حتّٰی کہ جو صوفی نہیں وہ محقق عالم نہیں بلکہ جو صوفی نہیں، وہ صحیح معنی میں مسلمان بھی نہیں (۳)، تو اس سے واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ تصوف وسلوک حاصل کرنا فرض عین ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مادی فنون اور جسمانی وظاہری امور بھی بغیر سیکھے اور بلا کسی ماہر استاذ اور واقف کار سے حاصل کیے انسان نہیں سیکھ سکتا، کسی کو استاذ ومعلم بنا کر اس کے ماتحت ہونا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح تصوف وسلوک یا بالفاظ دیگر

---

(۱) یہ شاہِ روم ہرقل کا مقولہ ہے جو اس نے حضرت ابوسفیان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا، تفصیلی واقعہ اسی کتاب میں عن قریب آرہا ہے: صحیح البخاری، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ رضی الله تعالی عنها، باب كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ؟، رقم الحديث:۷.

(۲) صحیح البخاری، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، بَابُ حَلاَوَةِ الإِيمَانِ، رقم الحديث:۱۶.

(۳) امام مالکؒ کا مشہور مقولہ ہے :من تفقه ولم يتصوف فقد تفسق، ومن تصوف ولم يتفقه فقد تزندق، ومن جمع بينهما فقد تحقق (مرقاۃ المفاتیح، ۳۳۵/۱، کتاب العلم، الفصل الثالث.)

اصلاح باطن — جو کہ امراض روحانی کا علاج ہے، جو کہ نہایت ہی باریک اور نازک ہے — بلا کسی ماہر استاذ کے — جس کو اس فن کا شیخ کہا جاتا ہے — حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے لیے کسی کو استاذ بنانا یعنی مصلح و شیخ متعین کرنا اور اس کے ماتحت ہوجانا بطریق اولیٰ ضروری ولازمی ہوگا، یہی وجہ ہے کہ عادةً بغیر مصلح کے نفس کا تزکیہ تہذیبِ اخلاق اور اصلاح باطن کا ہونا اور ملکاتِ فاضلہ کا حاصل ہونا عادةً ناممکن ہے۔

پس جب یہ واضح ہوگیا کہ شیخ فریضۂ اصلاح کے لیے موقوف علیہ ہے اور جو چیز فرض کا موقوف علیہ ہوتی ہے، وہ بھی فرض ہوتی ہے، جیسے فریضۂ نماز کے لیے طہارت فرض ہے، مسلم قاعدہ ہے "مقدمةُ الواجب واجبٌ (۱)، ومقدمةُ الحرام حرامٌ (۲)" اس لیے اصلاح اور تصفیہ باطن کے لیے مقدمہ وموقوف علیہ ہونے کے سبب مصلح اور شیخ متعین کرنا ہر شخص پر فرض ہے اور بلا کسی کو شیخ بنائے ہوئے اور بدون مصلح مقرر کیے ہوئے آزاد اور مختار رہنا غلبۂ نفس وغلبۂ شیطانی کا باعث ہے، فسادِ اعمال واخلاق میں مبتلا رہنا ہے، جو کسی حال میں جائز نہیں ہوسکتا، اسی واسطے علمائے ربانین اور عارفین محققین فرماتے ہیں من لا شیخ لہ فشیخہٗ الشیطان (۳) یعنی بدون مصلح اور شیخ کے ماتحت ہوئے عادة شیطان غالب رہتا ہے، اور ایسا شخص شیطان کی ماتحتی سے نہیں نکل سکتا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں سے معلوم ہوگیا کہ محققین کا یہ قول اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہے،

(۱) مسلم الثبوت، ص ۳۸.
(۲) ردالمحتار علی الدر المختار، ۶/۷۷.
(۳) قال في الرسالة المكية :من لا شيخ له فالشيطان شيخه(نزهة الخواطر، ۵/۵۰۸، فی أحوالِ الشيخ أبو القاسم الأكبر آبادي.)

اس لیے حضرت والا نے جو اس قول کو کہ ''جس کا کوئی پیر نہیں، اس کا پیر شیطان ہے''، نقل فرما کر اس کو ''اغلاط العوام'' میں داخل فرمایا ہے، اس کو سرسری طور پر پڑھ کر غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہئے، دیکھنا یہ ہے کہ عوام نے اس مشہور قول کے کیا معنیٰ مراد لیے تھے، اس سے ان پر کیا اثر ہوا تھا، جس کی حضرت والا نے اصلاح فرمائی، سو عوام اس سے دو قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہو گئے تھے، اوّل تو صورت بیعت کو ضروری جانا اور اس کو پھر محض رسم بنالیا۔ دوسرے محض صورت بیعت پر اکتفا کرلیا، جس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ ہر کس و نا کس جس کو ذرا مشہور دیکھا، بس اسی سے بیعت ہو گئے، خواہ وہ بصورت انسان شیطان ہی کیوں نہ ہو، آخر نا اہل دوکانداروں کی گرم بازاری ہوگئی اور گمراہی کے دروازے کھل گئے، اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں۔ ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست	بس بہر دستے نباید داد دست (۱)

دوسری طرف یہ ہوا کہ اگر کسی اہل اور مصلح شیخ سے بھی بیعت ہو گئے تو آگے تو چوں کہ کسی چیز کو ضروری جانا ہی نہ تھا، لہٰذا فیضِ اصلاح سے محروم رہے، دونوں طرح صحیح تصوف اور اہل تصوف کی بے قدری بلکہ مزید برآں ان کی بدنامی کا باعث بنے تو قول گو اپنی جگہ صحیح تھا مگر اس کا اثر چوں کہ بُرا ہوا، عوام اس کے معنی و مراد کو غلط سمجھ کر بہت سی خرابیوں میں مبتلا ہو گئے، بس بیعت کی اصل حقیقت اور مصلح سے غافل ہو کر بے خبر ہو گئے اور اندھا دھند معاملہ کر کے تصوف اور اہل تصوف کی بدنامی کا باعث ہو رہے تھے جو کہ بہت بڑی خرابی اور تباہی تھی۔

اس لیے جو چیز آڑ بنی ہوئی تھی، حضرت والا قدس سرہ العزیز نے بس اسی کو

(۱) اے مخاطب! بہت سے ابلیس انسانی شکلوں میں ہوتے ہیں، پس ہر ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے۔

ختم فرمادیا اور مطلب حضرت والا کی عبارت کا یہ ہے کہ یہ قول کہ جس کا کوئی شیخ نہیں، اس کا شیخ شیطان ہے، جس معنی کے ساتھ معمول بہ بنا رکھا ہے، اس معنی میں یہ قول صحیح نہیں، نہ یہ کہ اپنے اصلی معنی کے ساتھ بھی صحیح نہیں، یہ حضرت کی مراد ہرگز نہیں، جیسا کہ ان کی تصانیف ومواعظ اور ملفوظات سے روز روشن کی طرح ظاہر و باہر ہے، اس کی مثال ایسی ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے خوارج کے رد میں فرمایا تھا — جب کہ انہوں نے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [الأنعام:۵۷] کہہ کر انتشار پیدا کیا تھا — کہ کلمۃ حق ارید بھا باطل (۱)۔

بہر حال بات نیت کی چل رہی تھی کہ نیت اصل اور بمنزلہ بیج کے ہے اور عمل بمنزلہ فرع کے اور پھل کے ہے، اور اس کو سب جانتے ہیں کہ جیسا بیج ہوگا ، ویسا ہی اس کا ثمرہ اور نتیجہ بھی ہوگا، اگر بیج اچھا ہوگا تو فصل بھی اچھی ہوگی، اور اگر بیج خراب ہوگا تو پیداوار بھی خراب ہوگی، عالَم ظاہریات، عالَم باطنیات کا نمونہ اور نظیر ہوتا ہے، اسی لیے دنیا کو نمونۂ آخرت کہا جاتا ہے، اس لیے مادیات میں اس کیفیت کے مشاہدہ کرنے سے صاف طور پر یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہی حال ایمانیات اور روحانیات کا ہے جس کو حدیث إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ جیسی نیت ہوتی ہے، ویسے ہی اعمال ہوتے ہیں، یا بالفاظ دیگر جیسا باطن ہوتا ہے، ویسا ہی ظاہر ہوتا ہے، باطن کے تقاضے کے مطابق ہی آدمی کے اقوال وافعال، اخلاق ومعاملات ومعاشرات ہوتے ہیں، لہٰذا اگر کسی کے حالات دنی اور ناپاک قسم کے ہوں، دنیا میں انہماک اور حب مال و دولت، حب جاہ وشہرت، غضب وشہوت سے پُر قسم کے ہوں تو یہ علامت اور دلیل ہوں گے اس کے فسادِ باطن پر۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الزكوة، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ أَبِي رَافِعٍ رضی الله تعالى عنه، بَابُ التَّحْرِيضِ عَلَى قَتْلِ الْخَوَارِجِ، رقم الحديث: ۱۰۶۶.

حدیث إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ کے دوسرے معنی

ایک دوسرے معنی حدیث کے یہ ہیں کہ إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ میں الف لام عہد خارجی کا ہے، یعنی یہاں ان اعمال کے متعلق کہا جا رہا ہے جو شرعی ہیں، یعنی عندالشرع معتبر ہیں، لہٰذا اس حدیث شریف سے خلافِ شرع معصیت کرنے والے کو کوئی آڑ لینے کی گنجائش نہیں مل سکتی کہ مثلاً چوری کرنے والا کہنے لگے کہ میری نیت تو اس سے خیر تھی، چوں کہ مالدار کے پاس فضول مال جمع تھا، میں نے اس کے یہاں سے لے کر فقراء ومساکین کو تقسیم کر دیا اور میں خود بھی حاجت مند تھا، میرے بیوی بچے بھی محتاج تھے، ان پر بھی خرچ کر دیا تو اس کے ایسا بیان کرنے سے وہ بری نہیں سمجھا جائے گا، نہ اس کی چوری گناہ وجرم ہونے سے خارج ہو سکے گی، لہٰذا بدلہ میں ثواب نہیں، عذاب ہی ملے گا (۱) تو یہاں پر اعمال کا شرعی وجود نیات کے موافق ہونا فرمایا گیا۔

متعدد نیتوں سے متعدد عملوں کا ثواب حاصل کرنے کا طریقہ

اگر کسی نے ایک عمل شرعی میں متعدد اچھی نیتیں جمع کر لیں تو اس کو نیتوں کے موافق متعدد عملوں ہی کا ثواب دیا جائے گا، مثلاً دخول مسجد کے وقت سنتوں کی نیت کے ساتھ تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد کی بھی نیت کی، تو سنتوں کے ثواب کے علاوہ

---

(۱) المعاصي وهي لا تتغير عن موضعها بالنية فلا ينبغي أن يفهم الجاهل ذلك من عموم قوله عليه السلام إنما الأعمال بالنيات فيظن أن المعصية تَنْقَلِبُ طَاعَةً بِالنِّيَّةِ كَالَّذِي يَغْتَابُ إِنْسَانًا مُرَاعَاةً لقلب غَيْرِهِ أَوْ يُطْعِمُ فَقِيرًا مِنْ مَالِ غَيْرِهِ إلخ (إحياء علوم الدين، ۳۶۹/۴، بيان تفصيل الأعمال المتعلقة بالنية)

تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضو کا بھی ثواب اس کو حاصل ہوگا، علی ہذا القیاس مسجد میں جاتے وقت بہت سی نیتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً: گھر سے باطہارت جانے میں (۱) ایک حج وعمرہ کا ثواب حاصل کرنا (۲) اللہ تعالیٰ کے مہمان بن کر ضیافت الٰہی کی نعمتیں حاصل کرنا (۳) اعتکاف کی نیت کرنا (۴) اسی طرح دخول وخروج کے وقت مسنون دعاؤں کی (۵) مسلمانوں پر سلام ورحمت کی (٦) معصیت سے حفاظت کی (۷) انتظارِ جماعت کی (۸) مسلمانوں کی خبر گیری وعیادت مرضیٰ کی (۹) توجہ الی اللہ وذکر اللہ کی (۱۰) امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی (۱۱) محاسبہ نفس وفکر آخرت کی، اور ان سب نیتوں کے اعتبار سے دخولِ مسجد سے ان سب کا ثواب ان شاء اللہ نیت کرنے والے کو ملے گا (۲)۔

اسی طرح آگے حدیث شریف کے جملہ وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى کے معنی یہ ہیں کہ عامل کو ثمرہ اس کی نیت کے مطابق ملتا ہے، پس اگر عمل بظاہر درست وصحیح بھی ہومگر نیت اس سے اچھی نہ تھی، اللہ تعالیٰ کے راضی کرنے کی نیت نہ تھی بلکہ دنیوی شہرت وعزت وجاہ مطلوب تھی تو اس عمل پر رضا وقبولیت کا ترتب نہ ہوگا، چونکہ یہ اس کی نیت میں تھا ہی نہیں، جیسا کہ پہلے ریاکار عالم وشہید وسخی کے متعلق حدیث بیان کی جاچکی، یہ تو اس وقت ہے جب کہ نیتِ حسن بالکل معدوم ہو، اور جب نیتِ حسن بالکل معدوم نہ ہو بلکہ ایسی ضعیف ہو کہ عمل میں بالدوام نہ رہے، کبھی اس کا استحضار رہے اور کبھی نہیں، کسی حصہ میں ہے، کسی میں نہیں تو پورے عمل کا ثواب نہیں ملے گا (۲)۔

---

(۱) ويتعدد الْجَزَاء بتعددها. (حاشية السندي على سنن النسائي، ۱/ ۵۹.)

(۲) ثم هل يشترط استحضار النية أول كل عمل وإن قل وتكرر فعله مقارنا لأوله فيه مذاهب أحدها نعم وثانيها يشترط ذلك في أوله ولا يشترط إذا تكرر...والجمهور على الأول ولا وجه للثاني. (عمدة القارى، ج ۱ ص ۳۳.)

ایک حدیث سے نیت کی فضیلت واصلیت کی وضاحت

حدیث شریف میں آیا ہے: **عَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ الرَّجُلَ لَيَنْصَرِفُ وَمَا كُتِبَ لَهُ إِلَّا عُشْرُ صَلَاتِهِ تُسْعُهَا ثُمْنُهَا سُبْعُهَا سُدُسُهَا خُمُسُهَا رُبُعُهَا ثُلُثُهَا نِصْفُهَا.** رواہ ابوداؤد(۱)۔

شراح حدیث اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ اختلافِ ثواب اخلاص کی کمی وزیادتی کی وجہ سے ہوگا، اوراس کے برخلاف اگرنیت اچھی ہوتومعمولی عمل جوبظاہرعبادت بھی نہیں بلکہ مباحات سے ہو، جیسے: کھانا، پینا، ہنسنا، بولناوغیرہ، اتباعِ سنت کی نیت سے طریقِ نبوی پر انجام دئے جائیں توحق تعالیٰ کے یہاں محبوب ومقبول اور باعث اجروثواب ہوجاتے ہیں، اس لیے ایسے مؤمن بندے کا سونا، جاگنا ہرکام عبادت اوردین ہوجاتا ہے۔

بہر حال! اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ہاں ظاہری حسن اورصورت پرنظرنہیں اورنہ اس سے خدا کے یہاں مقبولیت حاصل ہوتی ہے، بہت سے ہیں جو یہاں حسین معلوم ہوتے ہیں مگرخرابیٔ باطن کی وجہ سے سیاہ باطن ہیں، مگر دنیا میں ان کے بھیانک باطن اور اندرونی بدشکلی پر پردہ پڑا ہوا ہے جو عارضی ہے، مگر عالمِ آخرت میں جوانکشافِ حقائق کا عالم ہے، وہاں ظلمتِ باطن ظاہر ہوجائے گی، توگوری اورحسین صورت والے وہاں کالے اور بدصورت اور بدشکل ہوجائیں گے اوروہ لوگ جو یہاں حسین صورت اور گوری رنگت نہیں رکھتے، لیکن ان کا باطن نہایت پاکیزہ اورنورانی ہے، اس عالم سے نکل کران کے باطن انوار سے جگمگااٹھیں گے اوران کی صورتیں نورانی ہوجائیں گی۔

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب الصلوة، بَابُ مَا جَاءَ فِي نُقْصَانِ الصَّلَاةِ، رقم الحديث: ٧٩٦.

جیسا کہ آں حضرت ﷺ نے شب معراج میں اس عالم سے نکل کر ملأ اعلیٰ میں پہنچ کر حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے دائیں بائیں نورانی وظلماتی صورتیں دیکھیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا تو انھوں نے بتلایا کہ یہ نورانی اہل جنت ہیں اور ظلماتی اہل جہنم ہیں، غرض اس عالم فانی میں صورت کا اچھا، حسین اور گوری رنگت کا ہونا کوئی عنداللہ مقبولیت کی دلیل نہیں، اسی طرح کالی صورت ہونا، خوبصورت نہ ہونا اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ اور ذلت کی چیز نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں باطن کا اعتبار ہے اور اسی کے اعتبار سے قبولیت وعدم قبولیت ہوتی ہے۔

چنانچہ دیکھئے! ابولہب بڑا حسین اور گوری رنگت والا تھا، جیسا کہ اس کی کنیت سے ظاہر ہے، اس کا اس قدر صاف اور چمک دار چہرہ تھا، گویا آگ کے شعلے جلد کے اندر رکھے ہوئے ہیں، اس لیے اس کے چہرہ سے سرخی ٹپکی پڑتی تھی، مگر دیکھئے! خدا تعالیٰ کے ہاں اس کا کیا مقام تھا؟ سورۂ لہب اس کو واضح کررہی ہے، کورا جہنمی ملعون ومردود، ذلیل وخوار تھا۔

اس کے برعکس حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو دیکھئے کہ جمال وحسن ان کے پاس نہیں، صورت کالی مگر حق تعالیٰ کے ہاں مقبول اور محبوب، مقرب بارگاہ ہونے کا یہ عالم تھا کہ آں حضرت ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپ جنت کی سیر فرمارہے تھے، آگے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی، آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ تو عرض کیا کہ یہ بلال ہیں، گویا خادمانہ حیثیت سے آگے چل رہے ہیں۔

جب آپ معراج سے واپس تشریف لائے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا تم کیا عمل کرتے ہو کہ میں نے تمہارے متعلق ایسا ایسا دیکھا؟ عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! وضو کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھنے کی

میری عادت ہے(۱)۔

دیکھا آپ نے تحیۃ الوضو کیا چیز ہے؟ کس فضیلت کو لیے ہوئے ہے؟ اسی طرح تحیۃ المسجد یعنی مسجد میں جاتے ہی بغیر بیٹھے دو رکعت تحیۃ المسجد کی نیت سے پڑھنا بھی بڑی فضیلت اور قرب کی چیز ہے، اگر جماعت سے پہلے سنتوں میں ہی تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد کی نیت بھی کرلی جائے تو ان دونوں قسم کے نوافل کا بھی ثواب حاصل ہوجاتا ہے(۲) خیر یہ بات تو درمیان میں آ گئی تھی۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات چل رہی تھی کہ صورتاً آپ حسین وجمیل نہیں تھے مگر ان کا باطن نہایت آراستہ اور مزین تھا، روح نہایت پاکیزہ اور اعمال نہایت اچھے رکھتے تھے، اسی لیے ان کے باطن کی خوبی پر ثمرہ بھی خوب مرتب ہوا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک ان کا کس قدر اعزاز ہوا، اسی طرح حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ صورت وشکل کے اچھے نہ تھے مگر اپنے جمالِ باطن، کمالِ علمی وعملی کے سبب آفاقِ عالم میں مشہور تھے۔

غرض اصلی چیز نیت ہے، اگر اعمال میں نیت اچھی ہوتی ہے تو اعمال کا ارتقاء ہوتا ہے وہ عند اللہ مقبول ہوتے ہیں، قربِ الٰہی کا سبب بنتے ہیں، پھر دنیا میں بھی ان اعمال کے برکات اور عمدہ ثمرات، عجیب وپائیدار اثرات ہوتے ہیں، یہاں سے اس حدیث شریف کا باب بدء الوحی کے ساتھ ارتباط اور مناسبت ظاہری ہوگی کہ **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** یعنی اعمال کی وقعت حسبِ نیت ہوتی ہے اور

---

(۱) صحيح مسلم، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضى الله تعالى عنه، بَابُ مِنْ فَضَائِلِ بِلَالٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، رقم الحديث: ۲۴۵۸.

(۲) (وَسُنَّ تَحِيَّةُ الْمَسْجِدِ) وَهِيَ رَكْعَتَانِ قَبْلَ الْقُعُودِ لِقَوْلِهِ - عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ - إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسْ حَتَّى يَرْكَعَ رَكْعَتَيْنِ (وَأَدَاءُ الْفَرْضِ يَنُوبُهَا) (قَوْلُهُ وَأَدَاءُ الْفَرْضِ يَنُوبُهَا) قَدَّمْنَا أَنَّ كُلَّ صَلَاةٍ أَدَّاهَا عِنْدَ الدُّخُولِ تَنُوبُ عَنْهَا بِلَا نِيَّةِ التَّحِيَّةِ. (درر الحكام شرح غرر الأحكام، ۱/۱۱۶)

وَ إِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَی اور حسب نیت ہی ترتب ثمرات اعمال ہوتا ہے تو نبوت اگر چہ موہوب ہوتی ہے کسی کسب وعمل کا نتیجہ نہیں ہوتی، تاہم عطا ہائے خداوندی کا محل بھی نہایت اعلیٰ وارفع ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واثرات اور آپ سے پہلے عرب کی تاریخ

تو اب دیکھنا یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال کیسے تھے اور ان کے کیا اثرات ہوئے، اس کے لیے پہلے تاریخ عرب پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا ضروری ہے، سو شرک عرب میں اس درجہ انتہا پر تھا کہ آج کا مشرک بھی ان کے شرک پر ہنستا ہے، اپنے ہاتھ کی مورتیاں پوجی جارہی ہیں، سفر میں چلے، کوئی صاف وچکنا سا پتھر ساتھ لے لیا، اس کی پوجا کرتے چلے جارہے ہیں، پھر اگر راستہ میں کوئی پتھر پہلے والے پتھر سے زیادہ اچھا مل گیا تو پہلے کو پھینک دیا، دوسرے کو لے لیا، اس کی پوجا کرتے چلے گئے، اسی طرح وہ صبح سے شام تک بیسیوں بناتے اور بیسیوں کو چھوڑتے تھے، تاریخ اس پر شاہد ہے، بے غیرتی کی یہ انتہا تھی کہ بازار میں اعلان ہورہا ہے کہ جو شخص مجھے جوتے پہنا دے گا، میں اس کو اپنی بیٹی دے دوں گا، بے حیائی کا یہ عالم کہ خانۂ کعبہ کا ننگے طواف کرتے تھے، گندگی کا یہ حال کہ ہاتھوں کو گوبر اور خون وغیرہ میں لتھیڑ کر خانۂ کعبہ کی دیواروں پر چھاپتے تھے، قتل وغارت گری، ظلم وستم ان کا اوڑھنا بچھانا تھی، انتقام کی کوئی حد نہ تھی، کئی پشتوں تک اس سلسلے میں وصیت چلتی تھی، پورے عرب میں کل آٹھ یا نو اشخاص پڑھے لکھے تھے، یہ عرب کی عام زندگی کا نقشہ تھا جو کہ اجمالی طور پر ان کے عقائد ومعاملات، اخلاق ومعاشرت بتلارہا ہے، جس سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ وہ

حیوان بشکل انسان تھے۔

ایسی قوم میں آپ مبعوث ہوئے، بچپن ہی سے آپ کا عدل وانصاف، صدق وصداقت، امانت ودیانت سب تسلیم کرتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ خانۂ کعبہ کی تعمیر کے سلسلے میں حجر اسود کو نصب کرنے میں قوم میں جھگڑا ہورہا تھا، قبائل ایک دوسرے کے اقدام کو اور اس شرف میں آگے ہونے کو پسند نہیں کررہے تھے، ہر ایک اپنے کو مستحق جان کر مقدم کرنا چاہتا تھا کہ اتنے میں حضور اکرم ﷺ وہاں تشریف لے گئے، آپ کو دیکھتے ہی سب لوگ خاموش ہو گئے، اور ایک دم سب کی زبان سے نکلا: جآء محمد الأمین اور سب نے بالاتفاق آپ سے درخواست کی کہ آپ فیصلہ فرمائیں، آپ نے ایسا عجیب وغریب فیصلہ فرمایا کہ کسی کو بھی اس میں اختلاف نہیں ہوا، خوشی خوشی سب نے ہی قبول کرلیا اور اس کے مطابق عمل درآمد ہوا (۱)۔

ابھی آپ کا بچپن تھا، مگر آپ کے صدق، امانت ودیانت پر سب کا اتفاق تھا، آپ دوسروں کا بوجھ اٹھاتے، اخراجات برداشت کرتے، بے کسوں اور غریبوں کے کام آتے تھے، اپنی محنت اور لقب کا کبھی خیال نہیں فرمایا، اہل مکہ، اہل طائف کی طرف سے کیسی کیسی تکالیف اٹھائیں، انھوں نے ستانے، ایذاء پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، آپ کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا، اس سب کے باوجود آپ برابر اپنے کام میں مصروف رہے، آپ کی کوئی ذاتی غرض بالکل نہ تھی، محض اللہ تعالیٰ کے بندوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی خاطر یہ تمام تر جدوجہد تھی۔

چنانچہ ایک دفعہ سرداران مکہ آں حضرت ﷺ کے چچا ابوطالب کے پاس

---

(۱) وسائل الوصول إلى شمائل الرسول ﷺ، الفصل الثّالث في صفة أمانته ﷺ وصدقه، ص ۲۲۷.

آئے اور کہا اپنے بھتیجے کو آپ اس تحریک سے باز رکھیں، وہ اس سے رُک جائیں ، جب چچا ابو طالب نے آپ کو ان لوگوں کی طرف سے یہ بات پہنچائی اور کچھ اپنی رائے بھی منظوری کی ظاہر کی، تا کہ حضور ﷺ کو کوئی تکلیف نہ پہونچے تو آپ نے سب کو ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ میں ہرگز اپنا کام نہیں چھوڑوں گا، چاہے میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج رکھ دیں (۱) یعنی خواہ گرمی اور ٹھنڈ کی انتہائی تکلیف دی جائے، تب بھی اس کام کو نہیں چھوڑوں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو جلب منفعت مقصود نہ تھی، اگر آپ کا یہ مقصود ہوتا تو مال داری ، سیادت وسرداری، قریش کی من چاہی عورتوں کے ساتھ نکاح، سب کچھ حاصل ہو رہا تھا مگر آپ نے قبول نہیں فرمایا، قسم قسم کی تکالیف برداشت فرمائیں، تین سال تک گھاٹیوں میں قید رہے، اس قدر آپ کو اذیتیں دی گئیں کہ آپ فرماتے ہیں کہ مجھ سے پہلے جتنے انبیاء ہوئے ہیں، جن کی تعداد ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے (۲) ان میں سے کسی کو اتنی تکلیف نہیں پہنچائی گئی، ان تمام حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ آپ کے اعمال کا ارتفاع معلوم ہو چکا تو آپ کی نیت کا بھی نہایت اعلیٰ مرتبہ سامنے آ گیا، تو اس طرح سے آپ کی حسنِ نیت اور اس کے ساتھ ارتفاعِ اعمال کا بھی اظہار ہو گیا اور جب آپ کی نیت نہایت درجہ اعلیٰ ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے جو اعمال صادر ہوں گے وہ بھی اعلیٰ ہوں گے، اور ان اعمال کے اثرات ونتائج بھی عمدہ سے عمدہ ہوں گے۔

---

(۱) البداية والنهاية ۳/۴۷، سيرة ابن هشام ۱/۲۹۹.

(۱) وعن كعب (الذي علمته من عدد الأنبياء مائة وأربعة وعشرون ألفاً والمرسل منهم ثلاثمائة وثلاثة عشر والمذكور في القرآن باسم العلم ثمانية وعشرون.(أنوار التنزيل وأسرار التأويل، ۱/۱۳۵، سورة البقرة:۲۱۳)

جس درجے کا اخلاص اسی درجے کا عمل ہونے کا بیان

چنانچہ دیکھ لیجئے! وہ قوم جس میں تہذیب وتمدن کا نام تک نہ تھا، جس کی انسانیت مرچکی تھی، ان کی تربیت فرما کر آپ نے کیسا خاک سے کندن کردیا کہ تمام متمدن قومیں بھی حیرت میں رہ گئیں کہ یہ قوم پہلے کیسی تھی اور اب کیسی ہوگئی!، وہی قوم پھر تمام اقوام عالم کی ہادی اور معلم بن گئی، اسی کو کہا ہے۔ ؎

دُرفشانی نے تیری قطروں کو دریا کردیا	دل کو روشن کردیا آنکھوں کو بینا کردیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے	کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

یہ آپ کا پاکیزہ عمل ہی تو تھا جس کا یہ اثر ہوا، تو اس سے آپ کی حسن نیت کا حال معلوم ہوا۔

چوں کہ احسنِ اعمال سے احسنِ نیت کا پتہ چلتا ہے، اعلیٰ اعمال کا ثمرہ بھی اونچا ہوتا ہے، اعلیٰ اعمال پر منصب اور عہدہ بھی اعلیٰ ملا کرتا ہے اور حق تعالیٰ کے یہاں اونچے سے اونچا منصب اور عہدہ، عہدۂ نبوت ورسالت ہے، اور پھر اس عہدہ کا انتہائی مقام ختم نبوت وختم رسالت ہے، پس آپ کو وہ منصب اور عہدہ دیا گیا جو نہایت درنہایت بلند اور اعلیٰ ہے، اسی کا یہ اثر ہے کہ آپ کے زمانہ وفیض یافتہ اصحاب کو خیر القرون کے لقب سے سرفراز فرمایا گیا۔

اس سے مبدأ وحی معلوم ہوگیا جو کہ آں حضرت ﷺ کی حسنِ نیت اور اعلیٰ اخلاص تھا، تو حدیث شریف کی ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت واضح ہوگئی کہ مبدأ وحی آپ کا اخلاص تھا، اور سچ پوچھئے تو جتنی احادیث آگے آرہی ہیں، یوں تو مناسبت ترجمۂ باب کے ساتھ ان کو بھی ہے مگر جتنی اعلیٰ درجہ کی مناسبت اس پہلی حدیث إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ والی کو ہے، اس درجہ مناسبت دوسری احادیث

کو باب کے ساتھ نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ سبب وحی ونبوت آپ کا اخلاص اور حسن نیت تھی، اور آپ کی زندگی و اعمال پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گیا کہ جس کا اخلاص اس درجہ کامل اور اعمال اس درجہ صالح تو اس کے اقوال کس درجہ صداقت، رفعت وعظمت، حفاظت وعصمت کے ساتھ متصف ہوں گے۔

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کے بیان کا حاصل یہ ہی ہے کہ ترجمہ باب سے بدلالت التزامی وحی کی عظمت وعصمت وحفاظت کا بیان مقصود ہے (۱) اور اسی کو حدیث إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ میں بیان فرمایا ہے کہ نیت کے اعلیٰ وارفع ہونے سے اعمال میں رفعت وعظمت آتی ہے، پس اس تقریر سے حدیث شریف کی باب کے ساتھ مناسبت واضح ہوگئی کہ جس درجہ کا اخلاص ہو گا، اسی درجے کا عمل اور اس کا ثمرہ ہو گا۔

جیسا اخلاص ویسا عمل

چوں کہ آپ کا اخلاص اعلیٰ سے اعلیٰ اور نہایت ہی ارتقا وارتفاع کے ساتھ متصف تھا، اس لیے اس کا ثمرہ بھی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ارفع سے ارفع ہونے کو مقتضی تھا اور وہ انتہائی مقام مقامِ نبوت ہے، اس لیے آپ کا اخلاص نبوت کو مقتضی ہوا، اور پھر نبوت میں بھی خاتمیت نبوت، انتہائے وصفِ نبوت ہے، تو آپ کو مقام نبوت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام خاتمیت نبوت سے نوازا گیا، اور اس کا مبدأ آپ کا کمالِ اخلاص تھا اور مبدأ وحی ہی کو ترجمہ بدء الوحی میں بیان کیا گیا ہے، پس معلوم ہوا کہ آپ کی وحی کی بداءت اور مبدأ، وہ آپ کا اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاص تھا جس پر خاتمیت نبوت اور نزول وحی کا ترتب ہوا، تو اس طرح اس حدیث شریف سے بداءت وحی کی کیفیت اور وحی کی عظمت اور عصمت اور وجوب طاعت حسب بیان

(۱) الأبواب والتراجم ص ۱۳.

حضرت شیخ الہندؒ نہایت ہی عجیب وغریب طریقہ پر ثابت ہوگئی، اور اس طرح حدیث کی مناسبت بھی ترجمہ باب کے ساتھ— جو کہ مبادی وحی کے بیان کے لیے لایا گیا— ثابت اور واضح ہوگئی اور جو اشکال عدم مناسبت کا تھا، وہ بھی رفع ہوگیا۔

یہ آخری بحث تھی جو بحمد للہ تعالیٰ ختم ہوگئی، عزیزان من! جب آپ کو اخلاص کی حقیقت اور اس کی اہمیت معلوم ہوگئی تو اب ضروری ہے کہ اپنے ہر عمل، ہر فعل، ہر قول اور ہر حال میں ہمیشہ آپ حضرات کمال درجہ اخلاص کا اہتمام رکھیں کہ ہماری پوری زندگی اخلاص سے بھر پور ہو، اور ہم ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [البينة: ۵] کے کامل مصداق بن کر رہیں اور حق تعالیٰ کا جو وعدہ اپنے مخلصین ومحسنین بندوں کے ساتھ ہے، وہ اس کے فضل اور رحمت سے ہمیں نصیب ہو۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

آمین یارب العالمین

الدرس الحادي عشر

ایک طالب علم نے اس طرح قرآۃ حدیث فرمائی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ (۱)، قَالَ :أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللهُ تعالى عَنْهَا، أَنَّ الحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَ :يَا رَسُولَ اللهِ، كَيْفَ يَأْتِيكَ الوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ :أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الجَرَسِ، وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ، فَيُفْصَمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ، وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ المَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِي فَأَعِي مَا يَقُولُ، قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا :وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الوَحْيُ فِي اليَوْمِ الشَّدِيدِ البَرْدِ، فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا.

ختم قرآۃ حدیث کے بعد حضرت والا نے حدیث کا یہ ترجمہ فرمایا:

ترجمہ :— امام بخاریؒ فرماتے ہیں، حدیث بیان کی ہم سے عبداللہ بن یوسف نے، انھوں نے فرمایا کہ خبر دی ہم کو حضرت امام مالکؒ نے ہشام بن عروہؒ سے روایت کرتے ہوئے، وہ اپنے باپ عروہ سے روایت کرتے ہیں

(۱) عبداللہ بن یوسف حضرت امام بخاری کے استاذ ہیں، نہایت اونچے اور جلیل القدر تابعی اور بہت بڑے محدث ہیں اور حضرت امام اعظمؒ کے تلامذہ میں سے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت امام اعظمؒ فن حدیث میں بھی بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں کہ اتنے بڑے محدث آپ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ زیادہ مصروفیت استنباط واستخراج مسائل میں اختیار فرمائے ہوئے تھے، اگر حضرت امام اعظمؒ حدیث سے اصول استنباط نہ فرماتے تو لوگ بھٹکتے پھرتے۔

اورعروہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا یارسول اللہ! آپ پروحی کس طرح آتی ہے؟ تو فرمایارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ کبھی تو گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ مجھ پر زیادہ سخت وحی ہوتی ہے، پس یہ صورت، یہ حالت مجھ کو اٹھائی جاتی ہے، اس حال میں کہ میں محفوظ کر چکا ہوتا ہوں اس کی طرف سے، اس کو جو کچھ کہا ہوتا ہے اور کبھی میرے سامنے فرشتہ آدمی کی شکل میں آتا ہے پھر مجھ سے وہ کلام کرتا ہے تو میں محفوظ کرلیتا ہوں اس کو جو کچھ وہ کہتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ یقینی طور پر میں نے دیکھا ہے کہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتی تھی سخت سردی والے دن میں تو وحی آپ سے موقوف ہوتی تھی دراں حالیکہ آپ کی پیشانی پسینہ بہاتی ہوتی تھی۔

اس حدیث میں چند بحثیں ہیں

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو ام المومنین کہنا کیوں کر صحیح ہے؟ دراں حالیکہ آپ کے کوئی اولادنہیں تھی۔

(۲) "یَأْتِینِي" میں اتیان کی نسبت وحی کی طرف کیوں ہے، جب کہ وحی ایک معنوی چیز ہے اوراتیان حسی چیز ہے، دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، پھر ایک کا دوسرے کے لیے اثبات کس طرح ہوا؟۔ یا یوں کہئے کہ "یَأْتِینِي" میں اسنادوحی کی طرف کیسی؟ وحی تو کوئی جان دار چیز نہیں اور فاعل ذی روح ہوا کرتا ہے، ذی روح کی طرف کسی فعل کی نسبت صحیح ہوا کرتی ہے۔

(۳) "صَلْصَلَةُ الجَرَسِ" کے کیا معنی ہیں؟۔

(۴) جرس کی حدیث میں ممانعت وارد ہے، اوراس کے ساتھ شیطان ہونا فرمایا ہے پھر وحی کواس کے ساتھ تشبیہ دینے کی کیا وجہ ہے؟۔

(۵) اتیان وحی بہ طور ''صَلْصَلَةُ الجَرَسِ'' کیوں ہوتی تھی؟۔

(٦) اشد سے کیا مراد ہے؟۔

(۷) ملک کا بشری شکل میں تمثل کس طرح ہوتا تھا؟۔

(۸) نزول وحی کی اس حدیث میں دو ہی صورتیں بیان فرمانے پر کیوں اکتفاء فرمایا؟ جب کہ نزول وحی کی ان کے علاوہ بھی اور بہت سی صورتیں تھیں۔

(۹) نزول وحی کی بہ طور ''صَلْصَلَةُ الجَرَسِ'' بیان فرماتے وقت صیغۂ ماضی ''وَعَيْتُ'' اور بشکل رجل وحی لانے پر صیغۂ مضارع ''أَعِي'' استعمال فرمایا، اس فرق کی کیا وجہ پیش آئی ؟۔

(۱۰) باوجود کڑاکے کی سردی ہونے کے پیشانی مبارک سے پسینہ کیوں ٹپکتا تھا، اور وہ بھی تیزی کے ساتھ؟۔

(۱۱) اس حدیث کو ترجمہ باب سے کیا مناسبت ہے؟

تفصیل مباحث

پہلی بحث :— یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو ام المومنین کا لقب کیوں دیا گیا؟ جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ آں حضرت ﷺ کے صاحب زادے یا تو ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالی عنہا سے تھے یا حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا سے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے کوئی اولاد نہ تھی کہ ان کی نسل سے مومنین ہوں، جب ولد ثابت نہیں تو والدہ اور اُم کیسے بنیں؟۔

اس سوال کا جواب تین طرح سے سماعت فرمائیے: ایک عرفی، دوسرا عقلی، تیسرا نقلی۔

عرفی :— عرف میں بڑے عمر والے کو تاؤ، چچا کہتے ہیں، عورتوں کو تائی، ماں کہہ دیتے ہیں، چنانچہ سفر میں پانی طلب کرتے وقت ''اماں پانی پلا دے'' کہتے

ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ عرف اور محاورہ میں بڑے کو تعظیماً وادباً ابا، اماں کہہ دیتے ہیں، اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو مومنین پر بڑائی حاصل ہونے کی وجہ سے ام المومنین تعظیم وادب کے عنوان کے طور پر کہہ دیا، یہ تو عرف اور محاورہ کے اعتبار سے جواب کی تقریر ہوئی۔

اب دوسری تقریر عقلی پیرایے میں سنئے!:

ماں اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تربیت اور پرورش متعلق ہوتی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کون ہیں ؟، سو جب جانتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے ہیں، اور حضور ﷺ ہمارے لیے تربیت و پرورش میں مثل باپ کے ہیں، چوں کہ باپ دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک جسمانی، ایک روحانی، جسمانی باپ کی پرورش جسم کے لیے ہوتی ہے اور یہ کون نہیں جانتا کہ جسم کی پرورش اتنی مشکل نہیں ہوتی جتنی روح کی پرورش مشکل ہوتی ہے، اس لیے جب جسم کی پرورش کرنے والا باپ ہوتا ہے تو روح کی تربیت اور پرورش کرنے والا تو بطریق اولی بلکہ بڑھ چڑھ کر باپ ہوگا۔

چنانچہ تقابل کر کے دیکھ لیجئے کہ باپ نے جسم کی تربیت فرمائی اور آں حضرت ﷺ نے روح کی تربیت فرمائی، باپ نے مادی اور جسمانی غذا ہمارے لئے مہیا فرمائی تو آپ (ﷺ) نے غیر مادی، مجرد، روحانی غذا کا اہتمام اور انتظام فرمایا، ہمارے وجود کے لیے باپ بھی واسطہ ہے، حضور ﷺ بھی واسطہ ہیں۔ باپ جسمانی واسطہ ہے تو حضور ﷺ روحانی واسطہ ہیں، اگر باپ وجود مادی، وجود جسمانی کا سبب ہے، تو آپ ﷺ وجود ایمان اور ثبوت ایمان کا سبب ہیں، آپ ﷺ ہمارے ایمان کے لیے واسطہ فی العروض ہیں، ہمارے پاس جو دولت ایمان ہے، یہ آپ ﷺ ہی کا فیضان

ہے، آپ کے بغیر ایمان نصیب نہیں ہوسکتا، آپ ﷺ نے ہمارے لیے وہ تکالیف برداشت فرمائیں جو باپ بھی برداشت نہیں کرسکتا، اس لیے آپ کے احسانات ہرطرح بے شمار ہیں، عقل کا تقاضا ہے کہ ایسے محسن کا حق سب سے زیادہ اوران سے محبت سب سے زیادہ ہو، اس لیے آں حضرت ﷺ باپ سے بڑھ کربھی باپ ہیں۔

جب اس طور سے حضور ﷺ کا باپ ہونا سمجھ میں آ گیا تو اب عقل بتلاتی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا جوآپ کی ازواج مطہرات میں سے ہیں، ان کا ہم سب اہل ایمان کے لیے ماں ہونا ظاہر ہے، اس لیے ان کا لقب ام المومنین ہوا، یہ الگ بات ہے کہ میراث اور عدم حجاب کا حکم یہاں جاری نہیں ہوگا، لیکن ویسے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا ہماری ماں سے بھی زیادہ معظم ومحترم اورواجب واکرم ہیں، جیسے آں حضرت ﷺ ہمارے باپ سے بھی زیادہ حق تفوق اورتقدم کارکھتے ہیں، غرض یہ تقاضائے عقل بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کاام المومنین ہونا ثابت ہوگیا۔

اب نقلی جواب باقی رہا یعنی نقول ونصوص کے ذریعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا کاام المومنین ہونا، بیان کرنا باقی رہا، سونقلی جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۝۱۶ [قٓ] کہ ہم انسان کے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

شہ رگ گردن میں ایک رگ ہوتی ہے جس کے کٹ جانے سے جان نکل جاتی ہے اور جب تک شہ رگ نہ کٹے تو زندگی کی امید رہتی ہے، لیکن شہ رگ کٹ جانے پر زندگی سے مایوسی ہوجاتی ہے، بچنا محال ہوتا ہے، شہ مخفف ہے شاہ کا جس کے معنی بادشاہ کے ہوتے ہیں، گویا یہ رگ تمام جسم کی رگوں کے لیے بادشاہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے جیسے شاہ پر قبضے سے پورے ملک پر قبضہ

ہوجاتا ہے، اسی طرح اگر شہ رگ پر آفت و ہلاکت نے قبضہ کرلیا تو جسم ہی ہلاک ہوجائے گا، شہ رگ گئی تو بس جسمانی مملکت پوری کی پوری قبضہ سے نکل جاتی ہے تو ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ باری تعالیٰ انسان کے نہایت ہی قریب سب سے زیادہ قریب ہیں۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حضور ﷺ ذات باری تعالیٰ کے مظہر اتم واکمل ہیں، حق تعالیٰ کی صفات کمالیہ زیادہ سے زیادہ آں حضرت ﷺ کی ذات اطہر میں موجود ہیں، پس حق تعالیٰ کی یہ صفت کہ انسان کے ساتھ بحیثیت تربیت غایت قرب ومعیت رکھتے ہیں، اور یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ جتنا قرب ہوتا ہے، اسی قدر محبت ہوتی ہے، جیسا کہ اپنی جان اور اولاد سے، پس حق تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہونا یہ ان کا حق ہے، پس حق تعالیٰ اقرب ہونے کے ساتھ ساتھ احب بھی ہیں، یہ صفت بھی آں حضرت ﷺ کو حاصل ہے۔

جیسا کہ حدیث **لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُونَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا** (۱)، دوسری روایت میں اور بھی بلیغ انداز میں ارشاد ہے: **لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ** (۲)، بعض روایتوں میں **من نفسه من أهله وماله والناس اجمعين** ہے (۳) معلوم

(۱) مسند الإمام أحمد بن حنبل، مُسْنَدُ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، رقم الحديث: ۱۳۹۵۹.

(۲) صحيح البخاری، عن أنس بن مالك رضى الله تعالى عنه، بَابٌ: حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الإِيمَانِ، رقم الحديث: ۱۵.

(۳) بلفظہ یہ روایت مجھے (عظیم الدین ارنالوی کو) نہیں مل سکی، البتہ اس معنی کی روایات موجود ہیں، چنانچہ بخاری شریف میں حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ اس پر دلالت کرتا ہے: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ هِشَامٍ، قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ آخِذٌ بِيَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، فَقَالَ لَهُ عُمَرُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، ←

ہوا کہ آپ بھی اقرب واحب ہیں، پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سب سے زیادہ ہونا صحیح فطرت اور ایمان کا تقاضا ہے مگر محبت سے مراد یہاں عقلی محبت ہے، مطلب یہ ہوا کہ جس شخص کو آپ کے ساتھ عقلی محبت اپنے نفس مال واولاد اور متعلقین وغیرہ تمام مخلوقات سے زیادہ حاصل نہیں، وہ صحیح معنی میں مؤمن نہیں۔

یوں تو ایک درجہ میں ہر مسلمان کو یہ چیز حاصل ہے، جس کا کسی کسی موقعہ پر ظہور ہو جاتا ہے، مثلاً حقیقی اور نسبی ماں یا باپ اگر نبی کی شان میں گستاخی و بے ادبی کریں تو دل گواہی دیتا ہے کہ آپ میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جس کو اپنے ماں، باپ پر غصہ نہ آوے، اور گستاخی و بے ادبی کو ٹھنڈے پن اور خاموشی کے ساتھ سن لے، جیسا کہ حضرت والا (۱) نے واقعہ سنایا تھا کہ ایک مولوی صاحب، کتاب زلیخا پڑھا رہے تھے، حضرت زلیخا کی تعریف وتوصیف میں جہاں کلام کیا ہے، خوب ہی ان کے جمال وکمال کا نقشہ کھینچا ہے، مولوی صاحب کے پاس ایک رئیس زادہ پڑھتا تھا، رئیسوں کے بچے اول تو خود اور خود نہ ہوں تو ملازمین شوخ بنا دیتے ہیں، چنانچہ اس بچہ کو ملازم نے سکھا دیا کہ استاذ سے یہ پوچھنا کہ زلیخا کی چھاتی کیسی تھی، لڑکے نے بھولے پن سے پوچھ لیا، حالاں کہ قصہ کتاب میں گذر بھی چکا تھا، استاذ کو بہت ناگوار ہوا، جواب دیا کہ تقریب فہم کے لیے یوں کہ جیسی تیری ماں کی چھاتی ہے، ویسی ہی حضرت زلیخا کی تھی، وہ لڑکا یہ سن کر خاموش رہا مگر گھر اماں سے کہہ دیا کہ استاذ صاحب نے ماں کی گالی دی، یہ سن کر اماں کو ناگواری ہوئی، لیکن بڑے اوچھے نہیں ہوتے، صاحب ظرف اور ذی تحمل ہوتے ہیں، وہ

← لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا مِنْ نَفْسِي، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لاَ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ :فَإِنَّهُ الآنَ، وَاللهِ، لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ الآنَ يَا عُمَرُ (بَابٌ:كَيْفَ كَانَتْ يَمِينُ النَّبِيِّ ﷺ ،رقم الحديث: ٦٦٣٢ .)

(۱) اس سے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ العزیز مراد ہیں۔

بات بات پر اچھلنے اور چھلکنے نہیں لگتے ، یہ تو چھوٹے اچھلا کرتے ہیں، ان کا ظرف وسیع نہیں ہوتا، اس لیے تحمل نہیں کرتے اچھلنے لگتے ہیں۔

غرض! اس بچے کی والدہ رئیس زادی نے اس وقت تو سکوت کیا، مگر پھر استاذ صاحب کو بلوایا اور پوچھا، مولانا! کیا آپ نے یوں کہا؟ ، امید تو ہے نہیں کہ آپ ایسا کہیں۔ مولانا صاحب نے جواب دیا کہ ہاں ٹھیک ہے، میں ایسا نہیں کہہ سکتا، لیکن آپ جانتی ہیں کہ حضرت سیدنا یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام نبی تھے تو ان کی بیوی ہمارے لیے کون ہوگی؟ مثل ماں کے ہوگی نہ؟ تو کیا ان کے کچھ آداب اور ان کے اکرام واحترام ضروری نہ ہوگا؟۔

رئیس زادی نے کہا، جی کیوں نہیں؟ بالکل ضروری ہے، ماں سے بھی زیادہ ان کی عزت وحرمت لازم ہے، مولانا صاحب نے فرمایا کہ جب آپ کو یہ تسلیم ہے تو اب لڑکے سے پوچھ لیجئے کہ کیا سوال کیا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ حضرت زلیخا کی پستان کیسی تھیں، ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں مَیں کیا کہتا۔

اس بات کو سن کر رئیسہ کو اپنے صاحب زادے پر غصہ آیا اور فرمانے لگیں کہ مولانا! آپ نے کمی کی، اس کو جوتے سے مارنا کیوں نہ شروع کیا؟ یہ بے ہودہ ہے، یہ بات ہی اس کے پوچھنے کی رہ گئی تھی، آئندہ ایسا کرے تو پٹائی کرنا۔

تو دیکھئے! جب اور نبی کی بیوی کے بارے میں بے ادبی پر غصہ آیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا تو اپنے رسول ﷺ کی محبوبہ ہیں تو ان کی شان میں ذرا بھی بے ادبی کو خواہ کسی طرف سے، خواہ اپنا عزیز سے عزیز ہی کیوں نہ ہو، اپنے حقیقی ماں باپ بھی خدانخواستہ ایسا کرے تو کیا گوارا کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، باپ اور ماں کی محبت اس وقت مغلوب ہو جائے گی، نبی کی محبت وعظمت کی شان غالب ہوگی، معلوم ہوا کہ ہر مؤمن کے دل میں زیادہ محبت نبی کے ساتھ ہے، یہ اور بات ہے کہ عام حالات میں حُبِّ نبی ذرا دبی چھپی رہتی ہے۔

اس تقریر سے ثابت ہو گیا کہ آں حضرت ﷺ نہایت احب و اقرب ہیں، نسبی علاقہ کی قربت و محبت بھی اس کے مقابلہ کی کوئی چیز نہیں رہتی، جب نبی بوجہ غایت قرب اور انتہائی محبت کے باپ کے مثل بلکہ باپ سے بھی بڑھ کر ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات جن میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کا ذکر چل رہا ہے، وہ ماں بلکہ ماں سے بھی بڑھ کر کیوں نہ ہوں گی؟ اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے ام المومنین لقب دئے جانے میں کسی اشکال وخلجان کی گنجائش نہیں۔

دوسری دلیل، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [الأحزاب: ٦] اس آیت میں "اَوْلٰی" صیغۂ اسم تفضیل استعمال فرمایا ہے، اس کے دو معنی آتے ہیں: اول یہ کہ "اَوْلٰی" بہ معنی اقرب ہے، مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ آں حضرت ﷺ کو مؤمنین کے ساتھ انتہائی قرب ہے، ان کی جانیں بھی ان سے اتنا قرب نہیں رکھتیں، جتنی کہ آپ کو ان کے ساتھ قرب حاصل ہے۔

تو ظاہر ہے کہ أَبٌ وَ أُم کو جتنا قرب اور قرابت ہوتی ہے، اپنی جان اس سے بھی زیادہ قریب ہوتی ہے کہ وہ خود اسی کے جسم میں ہوتی ہے، اور أَبٌ وَ أُمٌّ دوسری جان وجسم کے ساتھ ہوتے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ حضور (ﷺ) کا یہ قرب جو اس آیت میں بیان فرمایا ہے، یہ روحانی قرب ہے جو جسمانی قرب سے کہیں بڑھ کر اور بالاتر ہوتا ہے پھر روحانی قرب ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی درجہ پر ہونا جو صیغہ اسم تفضیل اور مفضل منہ کا مدلول ہے، یہ مزید برآں ہے جس سے یہ بات وضاحت کے ساتھ سامنے آ گئی کہ فی الحقیقت آپ باپ سے بھی بڑھ چڑھ کر اور ازواج مطہرات اپنی ماں سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔

لیکن محاورات میں اور عرف میں اَبٌ وَاُمٌّ سے اونچے الفاظ استعمال نہیں، لہٰذا آپ ﷺ اَبٌ اور ازواج مطہرات کے امہات ہونے میں کوئی تکلیف اور

کچھ اشکال نہیں، اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا جو کہ من جملہ ازواج مطہرات ہیں، ان کو ام المومنین کے لقب کے ساتھ ذکر کیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہاں پر ''اَوْلٰی'' ولایت سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ حق تصرف کے ہیں، جیسا معاملہ نکاح میں باپ وغیرہ کو ولایت یعنی حق تصرف ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو مومنین کے خود ان کے اپنے بارے میں تصرفات سے زیادہ نفوس میں حق تصرف حاصل ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے : ﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ۳۶﴾ [الأحزاب] : کسی مؤمن ومؤمنہ کو حکمِ الٰہی ونبوی کے بعد اپنے معاملہ کا اختیار باقی نہیں رہتا، یعنی حکم صادر ہونے کے بعد عقلاً وشرعاً مجبور ہوجاتا ہے، شرعی وعقلی اختیار باقی نہیں رہتا، یوں اس کے باوجود کوئی اپنی طبعی رفتار پر رہ کر احکام کی خلاف ورزی کرے تو سراسر گمراہی وبے راہی ہے، خلاف انسانیت اور محض حیوانیت بلکہ شیطانیت ہے۔

دونوں صورتوں کا حاصل یہ کہ آپ ﷺ کو مؤمنین کے ساتھ روحانی علاقہ، روحانی قرب وقرابت اس درجہ ہے کہ انفسِ مؤمنین جن میں دوست واحباب اور ماں اور باپ اور خود اپنا نفس سب آگئے، کسی کو بھی مومن سے وہ قرب وتعلق نہیں، دوست واحباب، خویش واقارب، ماں باپ سب کا تعلق کسی نہ کسی غرض پر مبنی ہوتا ہے، غرض فوت ہونے پر تعلق ختم ہوجاتا ہے، مگر آں حضرت ﷺ کا تعلق بالکل بے غرض ہے؛ اس لیے اس کو فناء نہیں، غیر فانی تعلق ہے، ماں باپ باوجود جسمانی نسبت باقی رہنے کے کسی بناء پر تعلق ختم کردیتے ہیں، لیکن آں حضرت ﷺ نسبت ایمانی کے ہوتے ہوئے اپنا تعلق ختم نہیں فرماتے۔

تو آپ ﷺ کو ہمارے ساتھ روحانی وایمانی علاقہ اور روحانی رب وقرابت

ایسا شدید وقوی اور لزوم کے ساتھ ہے، جیسا کہ علت ومعلول میں قرب ومعیت ہوتی ہے کہ تخلف وانفکاک نہیں ہوتا، اسی طرح آپ ہمارے ایمان کے لیے علت ہیں، آپ ہمارے ایمان کا ذریعہ ہیں، آپ ہی کے طفیل اور واسطے سے ہمیں ایمان نصیب ہوا ہے، پس بایں حیثیت آپ ﷺ ہمارے لیے واسطہ فی العروض ہیں، اور اسی علیّت کے باعث آپ ﷺ تمام مؤمنین کے روحانی باپ ہیں اور آپ کی ازواج مطہرات امہات المؤمنین ہیں، چنانچہ اس حصۂ آیت کے بعد تصریحاً بھی ارشاد ہے:﴿ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ﴾ کہ نبی کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں، اور ایک قرأت میں﴿ وَهُوَ أَبٌ لَهُمْ ﴾ (۱) ہے کہ اور وہ یعنی نبی ان کے باپ ہیں، بہرحال عرف اور عقل اور نقل تینوں طریقوں سے یہ بات بالکل صاف طور پر ثابت ہوگئی کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا کا لقب ام المؤمنین بالکل صحیح اور درست ہے، یہ پہلی بحث تھی۔

دوسری بحث یہ ہے کہ حدیث میں جملہ " كَيفَ يَأتِيكَ الوَحيُ؟ " میں فعل "اتیان" کی نسبت وحی کی طرف کیوں کر صحیح ہے؟، وحی تو کوئی جان دار اور ذی روح چیز نہیں اور صدورِ فعل کے لیے جان دار اور ذی روح ہونا ضروری ہوتا ہے۔

اس کے متعلق عرض ہے کہ اس اشکال کا شراح حدیث نے دوطرح سے جواب فرمایا ہے: ایک صورت وہ ہے جو بعضوں نے کہی کہ "الوَحيُ" کا مضاف محذوف ہے اور الف لام اس مضاف محذوف کے قائم مقام ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: کیف یاتیک حامل الوحی یعنی حامل وحی آپ کے پاس کس طرح آتا ہے،

(۱) ثُمَّ إِنَّ فِي مُصحَفِ أُبَيِّ بنِ كَعبٍ " وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ وَهُوَ أَبٌ لَهُمْ". وَقَرَأَ ابنُ عَبَّاسٍ: " مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَهُوَ أَبٌ لَهُمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ" (تفسیر القرطبی، ۱۴/ ۱۲۳، تحت الآیة المذکورة)

اور حامل وحی حضرت جبرئیلؑ فرشتہ ہیں، لہٰذا فعل اتیان کی نسبت ان کی طرف قاعدہ کے مطابق ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ نسبت فعل وحی کی طرف ہی ہے اور اسناد فعل ہمیشہ حقیقی ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ کبھی اسناد مجازی بھی ہوتی ہے، چنانچہ محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ میاں آپ کو کچھ علم آیا بھی، تو آنے کی نسبت علم کی طرف کی جاتی ہے، تو جب حصول علم کو آنا کہنا صحیح ہے، اسی طرح نزول وحی کو بھی آنا کہنا صحیح اور درست، چوں کہ وحی بھی علم ہے(۱)۔

بہر حال! علمی مذاکرہ اور درسی بیانات میں اس قسم کی تفصیلات و توجیہات ذکر کی جاتی ہیں، اور منشا اس قسم کے اشکالات پڑھ لکھ کر اصطلاحات منطقیہ جاننے سے پیدا ہوتے ہیں، چوں کہ اصطلاحات غالب آجاتی ہیں اور محاورات فراموش ہوجاتے ہیں، مگر نزول وحی محاورات پر ہوا ہے، اس لیے جس قدر محاورات کا علم واستحضار ہوگا، اتنا ہی قرآن وحدیث صحیح طور پر سمجھ میں آویں گے، یہ دوسری بحث تھی کہ "كَيْفَ يَأْتِيكَ الوَحْيُ؟" میں نسبت واسنادِ اتیان الی الوحی کس طرح درست ہے، سو دو طرح سے اس کی توجیہات آپ کے سامنے آچکیں۔

تیسری بحث "صَلْصَلَةُ الجَرَسِ" کے معنی کے بیان میں ہے، سو "صَلْصَلَةُ الجَرَسِ" کے معنی گونجتی آواز، گونج دار آواز جس کو ہمارے محارہ میں جھنکار، جھنکاہٹ کہتے ہیں، جیسے لوہے کو یا کسی اور ایسی چیز کو لوہے پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے، جرس کے معنی ٹال کے اور گھنٹی کے ہیں، بیل وغیرہ کی گردن میں باندھ دیتے ہیں(۲)۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ جانوروں کے گلوں، گردنوں میں یا گاڑی وغیرہ کی

---

(۱) عمدة القاری، ۱/ ۹۰.

(۲) فتح الباری، ۱/ ۲۰.

جھنکار — جس کو حدیث میں جرس سے تعبیر فرمایا ہے اس — کے متعلق حدیث میں ہے :**اَلْجَرَسُ مَزَامِيرُ الشَّيْطَانِ** (۱): مزامیر شیطان میں سے ہونا فرمایا ہے ،جس سے اس کا ممنوع ہونا ظاہر ہے، اوروحی ایک پاک مقدس چیز ہے،تو پھر جرس کی آواز کے ساتھ اتیان وحی کوتشبیہ دینا کس طرح زیبااور مناسب ہوا۔

سواس کی تحقیق یہ ہے کہ جرس کا استعمال دوطرح سے ہوتا ہے، اور دونوں کا حکم متحد نہیں، ایک ممنوع ہے، ایک مباح وجائز ہے،تو معلوم ہوا کہ جرس مطلقا مذموم وممنوع نہیں اور یہ بات محض احتمال عقلی اور ایجاد ذہنی نہیں۔

جیسا کہ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مولوی اپنی طرف سے ایجاد کر لیتے ہیں، حالاں کہ جب وہ بات خودساختہ نہیں، بلکہ شریعت ہی کا اظہار،شریعت ہی کا بیان ہے،تواس کے ساتھ کراہت ونفرت،طعن واعتراض کی نوبت وحی اورخدا ورسول کی طرف پہنچتی ہے، جیسے داڑھی کے اوپر طعن واعتراض کرتے ہوئے بعض یوں کہہ دیتے ہیں کہ بکرے کی داڑھی کی طرح ہےتو اس میں داڑھی کی تحقیر ہے اور یہ مخاطب کونہیں کہہ رہا بلکہ یہ بات حضور ﷺ تک پہنچ گئی، اس لیے داڑھی کی تحقیر سے کفر کا حکم عائد ہوجاتا ہےتو یہ بات نہیں کہ مولوی (۲) اپنی طرف سے ایجاد کر لیتے ہیں، یہ بات ضمناً آ گئی تھی۔

بات یہ چل رہی تھی کہ جرس کا استعمال مذموم اورممنوع بھی، اور مباح وجائز بھی، سو یہ اس وجہ سے کہ جرس کی جس حدیث میں مذمت اوراس کے ساتھ شیطان، اس کا مزامیر شیطان سے ہونا بیان فرمایا ہے، اس حدیث کا شان ورود یہ ہے کہ

---

(۱) صحیح مسلم،عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ تعالی عنہ، کتاب اللباس،بَابُ كَرَاهَةِ الْكَلْبِ وَالْجَرَسِ فِي السَّفَرِ، رقم الحدیث: ۲۱۱۴.

(۲) اگر کوئی اپنی طرف سے ایجاد کرے، وہ لالچی،حریص وطماع، دین فروش، جاہل وبددین ہے، ایسے کا یہاں ذکر نہیں، یہاں تو خادم دین کا ذکر چل رہا ہے۔　(نصیراحمد غفرلہ)

موقعۂ جہاد میں رات کو مخفی طریقہ سے دار الحرب میں شب خون مارا جاتا تھا، ظاہر ہے ایسی صورت میں ملکِ دشمن میں اپنی جان و مال وعزت ہر وقت خطرہ میں تھا، اس لیے تحفظ کی خاطر ضروری تھا کہ کوئی کام کوئی طور و انداز ایسا نہ اختیار کیا جائے کہ دشمن خبردار ہو سکے، تو مقصد جہاد وشب خون ہی فوت ہو جائے اور الٹی آفت مسلمانوں کی جان و مال پر پڑ جائے، اس وقت فرمایا تھا کہ جرس مزامیر ابلیس سے ہے، چوں کہ شیطان کا کام اہل ایمان کو نقصان وتکلیف میں ڈالنا ہوتا ہے، وہی کام ایسے موقعہ پر ٹال یا گھنٹی آواز سے ہوگا(۱)۔

تو حدیث کے شان ورود سے معلوم ہوا کہ جرس جہاد میں ممنوع ہے، چوں کہ اس سے جان و مال کا نقصان ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ جرس مطلقاً ممنوع نہیں، چنانچہ فقہاء نے فرمایا ہے کہ رات کو گاڑی وغیرہ سے سفر کرتے ہیں، ٹال، گھنٹی وغیرہ باندھنا جائز ہے، چوں کہ راستے میں برسات کے موسم میں سانپ وغیرہ موذی جانور یا درندے آجاتے ہیں، اس آواز سے وہ ہٹ جائیں گے۔

نیز بعض جانوروں کے چلنے میں اس سے آسانی ہوتی ہے، جیسے ہاتھی یا بیلوں کی گردنوں میں باندھ دیتے ہیں، تا کہ دور سے معلوم ہو کر بچے راستے میں ہوں تو وہ ہٹ جائیں یا موڑ پر بڑوں کے اعلام کے لیے بھی گھنٹی یا ٹال باندھنا جائز ہے یا گاڑی وغیرہ آرہی ہو تو وہیں ٹھہر جائے۔

حاصل یہ کہ ضرورت یا دفع مضرت کے لیے جرس کا استعمال جائز ہے، ہاں یوں ہی شوقاً وتلذذاً یا ریاءً وتفاخراً اس کا استعمال ناجائز ہے، بہر حال! جرس کا علی الاطلاق ممنوع نہ ہونا بہ خوبی ثابت ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ جرس فی ذاتہٖ مذموم نہیں بلکہ قبیح لغیرہ ہے، قبیح لعینہٖ نہیں، جب قبیح لعینہ نہیں تو اتیان وحی کو صلصلۃ الجرس کے ساتھ تشبیہ دینا بھی محل اشکال نہیں۔

---

(۱) عمدة القاری، ۱/۹۱.

خلاصۂ جواب یہ ہوا کہ جرس کی ذات میں خرابی اور قباحت نہیں، اس کا غلط طور پر استعمال منع ہے، اس لیے حدیث میں تقبیح نظراً إلیٰ استعمالہ ہے اور یہاں تشبیہ نظراً إلیٰ ذاتہ ہے، لہٰذا کچھ اشکال وخلجان نہیں، یہ چوتھی بحث تھی کہ جرس باوجود ممنوع ومذموم ہونے کے اس کی آواز کے ساتھ اتیان وحی کی تشبیہ کیوں کر درست ہے؟ تقریر جواب سے معلوم ہوگیا کہ یہ اشکال سرسری نظر سے تھا، نظر غائر سے معلوم ہوا کہ محل تقبیح اس کا غلط استعمال ہے اور بنائے تشبیہ اس کی ذات ہے۔

پانچویں بحث " صَلْصَلَةُ الجَرَسِ " کے طور پر نزول وحی کے وقت آواز کیوں ہوتی تھی؟ یہ کیا چیز تھی؟ کس کی آواز تھی؟ سو اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کے تکلم کی آواز ہوتی تھی (۱)۔

(۲) بعض حضرات فرماتے ہیں یہ آواز حضرت جبرئیلؑ کے اترنے کے وقت تصادم ہوا سے پیدا ہوتی تھی کہ چار سو پروں کے ساتھ اترنا ہو رہا ہے (۲) پھر پر بھی معمولی نہیں، پرندوں ہی کے اترنے کے وقت دیکھ لیں، کیسی صوت متدار کہ پیدا ہوتی ہے پھر طیرانِ گدھ کے وقت خاص طور اور ہوائی جہاز کے اترنے پر تو کس قدر مہیب آواز ہوتی ہے۔

(۳) ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت جبرئیلؑ وحی لاتے تھے تو ایک آواز آپ کو متوجہ کرنے کے لیے کی جاتی تھی (۳) جیسے ٹیلی فون کے ذریعہ ایک آواز ہوتی ہے جس سے دفتر میں اطلاع ہو جاتی ہے اور دفتر والے چوکنا اور ہوشیار اور

---

(۱) فتح الباری، ۱/ ۲۵.

(۲) فتح الباری، ۱/ ۲۵.

(۳) فتح الباری، ۱/ ۲۵.

متوجہ ہوجاتے ہیں۔ بعنوان دیگر بعض کا خیال ہے کہ وحی کے آنے سے کچھ پہلے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوت متخیلہ کو ہر طرف سے ہٹا کر عام مجرد کی طرف متوجہ کرنے کی ایک صورت تھی، جیسا کہ ٹیلی فون پر گفتگو کرنے سے پہلے گھنٹی دی جاتی ہے؛ تاکہ مخاطب کی پوری توجہ سماعت کی طرف ہوجائے۔

(۴) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ درحقیقت صلصلۃ الجرس اس خاص کیفیت کا نام ہے جو خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حواس میں پیدا ہوجایا کرتی تھی، کیوں کہ انسان کی قوتِ سامعہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس کو سب طرف سے ہٹا کر کسی خاص طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو ایک صوت متدارک پیدا ہوتی ہے، یعنی جب سماعی طور پر آوازوں کا بند کردینا ہوتا ہے تو اس سے ایک سنسناہٹ اور جھنجھناہٹ سی پیدا ہوجاتی ہے، چنانچہ حضرات مشائخ صوفیہ جانتے ہیں، اور حسب موقعہ وحسب حالِ مرید کے کانوں کو بند کرا کے ادھر متوجہ کراتے ہیں، وہی آواز اندر دماغ میں گونجتی معلوم ہوتی ہے، اس کو "شغل الحذ" کہتے ہیں، یہ منافع کثیرہ پر مشتمل ہے، اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسری توجہات وتخیلات سے یکسو اور یک طرف ہونے کے نتیجہ میں یہ آواز ہوتی تھی، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس توجیہ کو پسند فرمایا ہے(۱)۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ حضرت جبرئیلؑ واسطۂ وحی ہیں، ان کے واسطہ سے کلام الٰہی نازل ہورہا ہے تو حضرت جبریلؑ من حیث السفارۃ متکلم ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہبط وحی اور مخاطب وحی ہیں، اور متکلم ومخاطب میں موانست ومناسبت کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور یہاں یہ چیز مفقود ہے، چوں کہ حضرت جبرئیلؑ ملک، مجرد غیر مادی اور روحانیت محضہ ہیں، شکل وصورت بھی غیر انسانی اور انوکھی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مادی عالم میں بحیثیت عنصر مادی اور جسمانیت کے ساتھ بشکل بشری

(۱) ملاحظہ ہو: رسالہ شرح تراجم بخاری، ص ر. ۱۴

تشریف فرما ہیں تو متکلم ومخاطب نوعاً بھی آپس میں مبائن ہیں اور شکلاً وصورتاً بھی ایک دوسرے کے مفارق ہیں تو ایک کو دوسرے سے مناسبت اور مابینی ربط واتحاد کچھ نہیں، اور افادہ واستفادہ کے لیے متکلم ومخاطب کے درمیان مناسبت کا ہونا شرط ہے، بدون اس کے نہ القاء ممکن ہے، نہ تلقی، اس لیے دونوں صورتوں میں سے ایک صورت ہونا ضروری ہے، یا تو حضور ﷺ جسم ناسوتی مادی سے روحانیت وملکوتیت کی طرف خلاف طبع وخرق عادت کے طور پر صعود وعروج فرمائیں؛ تاکہ فرشتہ سے وحی کو اخذ فرماسکیں، اس عروج روحانی میں ایک خاص قسم کی آواز ہوتی تھی یا دوسری صورت یہ کہ فرشتہ ملکوتیت سے بشریت اور روحانیت محضہ سے مادیت کی طرف نزول فرمائے؛ تاکہ افادہ ہوسکے، اس ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف خروج اور اپنے مقام سے اتر کر بشریت ومادیت کا جامہ پہننے میں آواز ہوتی تھی، اسی کو صلصلۃ الجرس سے تعبیر فرمایا۔

(۶) اور بعض یوں فرماتے ہیں کہ یہ آواز جناب باری سبحانہ وتعالیٰ کے کلام نفسی کی آواز تھی، جیسا کہ کلام لفظی کی ایک آواز ہوتی ہے، اشاعرہ اور ماترید یہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ کلام نفسی ممکن السماع ہے، یہ دوسری بات ہے کہ کلام نفسی حروف واصوات سے منزہ ہوجاتا ہے، جس طرح اس کی ذات پاک ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوری: ۱۱] ہے، اس طرح اس کی صفات جن میں من جملہ کلام نفسی بھی ہے، وہ لیس کمثلہ شیئ ہے(۱)، غرض یہ صلصلۃ الجرس کے طور پر وحی کا آنا، کلام نفسی کی نزولی کیفیت تھی۔

یہ پانچویں بحث تھی کہ صلصلۃ الجرس کیا چیز تھی؟ کس کی آواز تھی؟ کیوں ہوتی تھی؟ ان چھے توجیہات کے ساتھ تفصیلی بیان آپ کے سامنے آچکا ہے۔

اب چھٹی بحث یہ ہے کہ حدیث میں "وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ" کیوں فرمایا؟

(۱) فیض الباری، ۱/۹۵، ۹۴.

اشدیت کی کیا وجہ تھی اور اشد سے یہاں کیا مراد ہے؟۔

جواب یہ ہے کہ اشد، شدت سے مشتق ہے جس کے معنی کبھی قوت کے اور کبھی مشقت، گراں وبھاری کے ہوتے ہیں، یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی اشد بمعنی اشق واثقل ہے جیسا کہ ایک دوسرے حدیث میں وارد ہے :فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ (۱) کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزاروں عابدوں سے زیادہ بھاری ہے، اس کا بہکانا شیطان کے لیے عابدوں کی نسبت بہت زیادہ باعث مشقت ہے۔

فقیہ :فقہ، فقاہت سے مشتق ہے جس کے معنی درایت یعنی باریک بینی اور گہری سمجھ کے ہیں، چنانچہ متقدمین میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالَهَا وَمَا عَلَيْهَا کی ہے (۲)، یعنی نفس کا تمام منافع ومضار کا جان لینا اور جملہ شرور وفتن سے باخبر اور آگاہ ہوجانا اور چونکہ شر کبھی شیطان کی طرف سے اور اکثر نفس وطبیعت کے میلان سے ہوتا ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ مکائد نفس وشیطان سے باخبر اور نفسانیت وشیطانیت سے ہر وقت چوکنّا اور بیدار رہنا جو دوام فکر واستحضار اور ہر قول وفعل وسکون وحرکت کے وقت جمیع نشیب وفراز پر چوطرفہ نظر اور راجح، مرجوح، مقدم ومؤخر میں امتیاز اور احوط کے اختیار کرتے رہنے کو مستلزم ہے، ظاہر ہے کہ جب کوئی اس مقام اور اس درجہ پر فائز ہوگا، تو نفس وشیطان کے داؤ پیچ ہرگز اثر انداز نہ ہوں گے۔

ایسے شخص کو بہکانا شیطان کے لیے کوئی آسان بات نہیں، بلکہ نہایت بھاری اور مشکل ہوتا ہے، بخلاف اس شخص کے کہ جس نے ایسی گہرائی اور بیداری وہوشیاری حاصل نہیں کی، محض سرسریت کے ساتھ اُوپری اُوپری

---

(۱) سنن ابن ماجة، ص ۲۰، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی الله تعالی عنهما، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، رقم الحديث: ۲۲۲.

(۲) البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ۶/۱، مقدمة الكتاب.

معلومات کیساتھ اطاعت وعبادت میں لگا ہوا ہے، ایسے ہزاروں کا بہکا دینا اور بھٹکا دینا، نفسانی اور شیطانی رنگوں میں رنگ دینا شیطان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں، یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حفظ مسائل اور معلومات کے جمع کرنے کا نام فقہ اور علم نہیں، اس کا اثر تو زبان وقلم اور صرف ظاہر تک رہتا ہے، حقیقت علم اس وقت حاصل ہوتی ہے جب باطن اور قلب میں اس کا اثر جا گزیں ہو جائے، جس کا حاصل خشیت اور محبت راسخہ ہے، اس وقت دل میں نور پیدا ہوتا ہے جو ظلمت اور ظلمات کا دافع ہے، اسی کو حدیث میں **اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ** سے تعبیر فرمایا ہے(۱)۔

اسی نورِ قلب کا نام علم اور فقہ ہے، اس کے حصول کی شرط عادی کسی اہل دل، صاحب باطن، جس کو شیخ کامل عارف باللہ، عالم ربانی وعالم حقانی کہا جاتا ہے، اس سے نفس کا تزکیہ اور قلب کا تصفیہ ہوتا ہے جو کہ ہر شخص پر لازم اور فرض ہے۔

راسخ الایمان ہونا اور راسخ العلم ہونا جو کہ شریعت میں مطلوب اور مقصود ہے، اس کے حاصل ہونے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں، اسی رسوخِ ایمانی کا نام تصوف ہے، معلوم ہوا کہ تصوف حاصل کرنا نہایت ضروری اور لازمی چیز یعنی فرض ہے، یہ بات ضمناً آ گئی مگر بڑے کام کی اور ضروری ہے۔

بات **فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ** پر تھی کہ شیطان کو فقیہ یعنی عارف باللہ، محقق عالم کا بہکانا بہت بھاری ہے، اس کو راہِ ہُدیٰ سے بھٹکانے میں شیطان کو سخت سے سخت دشواری پیش آتی ہے، حتی کہ عاجز ہو جاتا ہے۔

یہ تقریر تو فقیہ پر اسلاف واکابر متقدمین کی اصطلاح کے اعتبار سے ہوئی،

---

(۱) سنن الترمذی، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رضی اللہ تعالی عنہ، بَابٌ :وَمِنْ سُورَةِ الحِجْرِ، رقم الحدیث:۳۱۲۷.

چوں کہ اسلاف کے نزدیک فقہ، فقط احکام ظاہرہ کے علم کا نام نہ تھا بلکہ احکام ظاہرہ اور احکامِ باطنہ دونوں کے مجموعہ کے علم کو فقہ کہتے تھے، چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے فقہ کی تعریف **مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَ مَا عَلَيْهَا** منقول ہے جس کی تشریح آپ سن چکے۔

دوسری تقریر اس حدیث **فَقِيهٌ وَاحِدٌ** کی فقہ سے متعلق علمائے متأخرین کی اصطلاح کے پیش نظر یہ ہوسکتی ہے کہ فقیہ، فقہ سے مشتق ہے، اور فقہ کے دو معنی ہیں : ایک لغوی معنی، دوسرے اصطلاحی، لغت میں فقہ مطلق سمجھ کو کہتے ہیں، اور اصطلاح میں اس کے معنی خاص سمجھ یعنی دینی سمجھ کے ہیں، جس کی دو قسمیں ہیں: ایک تو دین کی سرسری سمجھ، دوسری دین کی گہری سمجھ، اول کو فقہ ظاہری کہتے ہیں، جو احکام ظاہرہ یعنی اعمال جوارح سے متعلق احکام کو جان لینا جو عموماً مدارس میں کتب فقہ سے حاصل ہوتا ہے، اعمال جوارح کے احکام وہاں زیرِ تعلیم ہوتے ہیں۔

دوسری قسم دین کی گہری سمجھ ہے جو کہ فقہ الفقہ اور فقہ باطنی ہے، جس میں اعمال باطنہ یعنی باطن سے متعلق احکام سے بحث کی جاتی ہے، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب مطمح نظر ہوتا ہے، رذائل سے خلو کو تخطیہ اور اخلاق فاضلہ سے مزین ہونے کو تجلیہ وتخلیہ کہتے ہیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال ظاہرہ میں حقیقت اور جان وقلب کی درستی ہی سے آتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: **اَلاَ وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً : إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلاَ وَهِيَ الْقَلْبُ**(۱)۔

معلوم ہوا کہ اعمالِ ظاہرہ کی درستگی اور پختگی دل کی درستگی، دل کی صفائی

(۱) صحيح البخارى، عن النعمان بن بشير رضی اللہ عنہ، بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ، رقم الحديث: ۵۲.

وعمدگی پر منحصر ہے، حدیث إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ بھی اس پر دال ہے ، اور حدیث إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَلَا إِلَى أَعْمَالِكُمْ وَإِنَّمَا يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَنِيَّاتِكُمْ سے بھی صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قلب خاص محل نظر الٰہی ہے اور بغیر قلبی و باطنی درستی ، اعمال ظاہرہ صرف صورت اعمال ہیں ، ان میں مغز اور حقیقت صفائی قلب اور خلوص نیت سے ہی آتی ہے، شیطانی مکاریوں اور دسیسہ کاریوں سے، دل ہی کی صفائی اور درستی ، دل ہی کی بیداری اور ہوشیاری کے بقدر بچ سکتا ہے، بغیر اصلاحِ نفس اور درستیٔ قلب محض کتابیں پڑھ لینے اور مضامین و مسائل کے یاد ہو جانے سے نہیں بچ سکتا۔

اس لیے بالیقین حدیث میں فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ سے، درسی فقہ والا، رسمی عالم مراد نہیں ہوسکتا، کیوں کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے شیطان کی چالوں کو نہیں سمجھ سکتا، اسے بہکا دینا اور غلط فہمی میں مبتلا کر دینا بلکہ غلط کاری میں لگا دینا شیطان کو کچھ بھی بھاری نہیں ہوتا، بلکہ بہت آسانی سے اس پر غلبہ اور تسلط حاصل کر لیتا ہے، چونکہ زعم علم سے غرور و تکبر، عُجب و خود بینی ، خود پسندی، خود رائی اور خود آرائی ، و خود نمائی جیسی چیزیں عموماً پیدا ہو جاتی ہیں ، اس لیے ایسا شخص اکثر ہوائے نفسانی اور وساوس شیطانی کے موافقت میں رہتا ہے، اس کے اندر قوت شہوانیہ، غضبانیہ و نفسانیہ اور جمیع قوائے بہیمیہ زندہ رہتے ہیں، اس لیے ظلمات، خواہشات وشہوات کے اندھیرے عقل پر چھائے رہتے ہیں، اس لیے شیطانی تسلط اس پر آسان رہتا ہے۔

اس لیے یہاں حدیث فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ میں عالم باللہ، عارف کامل اور ربانی عالم مراد ہے جو کہ ظاہر و باطن میں تقوی والا متقی کامل ہوتا ہے، اس کمال تقوی سے عارف کو دین کی ایسی سمجھ بوجھ عطا ہوتی ہے کہ شیطان کے تمام تار و پود کو توڑ دیتا ہے، شیطان بعض دفعہ دنیا کو دین کی

صورت میں پیش کرتا ہے، عارف نورِتقویٰ، نورِفراست سے اس کو سمجھ کرلوگوں پر ظاہر کردیتا ہے جس سے لوگ اس کے دھوکہ سے بچ جاتے ہیں، اسی لیے وہ شیطان پر ہزاروں عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہے، شیطان کی عقل اس کے سامنے چرخ ہوجاتی ہے۔

پس شیطان سے بچنا جو کہ آیت ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا ؕ﴾ [فاطر: ٦] سے مطلوب اور ضروری وفرض ہے، یہ بدون اس فقہ باطنی یعنی بغیر تصوف حاصل کیے محال ومستبعد ہے، لہٰذا تصوف کا حاصل کرنا ضروری ہے جس کا طریقہ شیخ کامل جامع الظاہر والباطن کے ماتحت ہو کر رہنا ہے۔

الحاصل جیسا اس حدیث میں أشد بمعنی أشق و أثقل ہے، اسی طرح حدیث باب میں "وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ" بھی أشق و أثقل کے معنی میں ہے، اور وجہ أشدیت و أثقلیت کی یہ تھی کہ اول تو خود نفس وحی ہی ثقیل ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝﴾ [المزمل]۔

وجہ یہ ہے کہ کلام میں متکلم کا اثر ہوتا ہے اور جس درجہ مخاطب صحیح الفطرت اور سلیم القلب ہوتا ہے، اسی درجہ اس کو متکلم کی صفات وتجلیات اس کے کلام میں محسوس ہوتے اور مخاطب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اب یہاں ادھر تو متکلم نہایت عظمتِ شان اور کمالِ جلال کی صفت سے متصف ہے، معمولی سے حاکم کے احکام وقت بلکہ صرف اس کی طرف نظر کرنے ہی میں آدمی ہوش باختہ ہوجاتا ہے، حواس مختل ہوجاتے ہیں، عجیب اضطراب اور گھبراہٹ طاری ہوجاتی ہے، آدمی کو مارے رعب وہیبت کے پسینہ آجاتا ہے، دل دھڑکنے جسم کانپنے لگتا ہے، تو حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین بلکہ سلطان السلاطین ہیں، تو ان کے کمال وجلال اور ان کی عظمت وہیبت کا تو کیا ٹھکانا ہے؟ ادھر مخاطب رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحیح الفطرت، سلیم القلب، اس لیے متکلم اور کلام کی

عظمت و ہیبت پھر حاکم علی الاطلاق کے کلام و احکام کا صحیح طور پر تمام لوگوں کو پہنچانا اور پوری صلاحیتوں کے ساتھ ایسے طریق سے پہنچانا کہ لوگ قبول کرتے چلے جائیں، نہایت بھاری ذمہ داریوں کا بار بلکہ باروں کا انبار، اس لیے خود کلام الٰہی کا ایک ثقل تھا۔

پھر **صلصلة الجرس** کی صورت میں آواز مسلسل، متدارک، غیر متمائز طریقہ پر ہوتی تھی، جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام اطراف و جوانب سے توجہ ہٹا کر بہت ہی گہری توجہ کے ساتھ اپنے کو اس کی طرف لگانا پڑتا تھا، جس میں نہایت تعب اور مشقت اٹھانی پڑتی تھی، اس کے ساتھ ہی اسے محفوظ کرنے کی بھی کوشش فرماتے تھے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساتھ ساتھ ہی پڑھنے اور یاد کرنے کی بھی فکر فرماتے تھے، جس میں کافی تعب ہوتا تھا، اسی لیے حق تعالیٰ نے ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ﴿١٦﴾ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ﴿١٧﴾﴾ [القیمة] نازل فرما کر آپ کو مشقت سے بچانے کے لیے ساتھ ساتھ پڑھنے اور یاد کرنے کی فکر و پریشانی اٹھانے سے منع فرمادیا، تاہم صوت متدارک اور غیر متمائز ہونے میں **صلصلة الجرس** کے مشابہ ہو جانے کی وجہ سے غایت توجہ اور انتہائی غور و فکر کے ساتھ کلام سمجھنے کی کوشش کا تعب اور مشقت اٹھانی پڑتی تھی۔

تقریب الی الفہم کے لیے اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص بہت تیز بولنے لگے، خاص کر غصہ کے ساتھ اور نہایت جوش اور غضب ناکی کا انداز ہو تو اس کا کلام کس قدر مسلسل اور متواصل و متدارک ہوگا، اس وقت الفاظ سمجھنا نہایت دشوار ہوگا، سرسری اور معمولی توجہ سے اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آویں گے، بہت ہی اعلیٰ سے اعلیٰ توجہ کرنا پڑے گی، جس میں کافی دقت اور مشقت سے دو چار ہونا پڑے گا۔

یہ ہی وجہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی کے صلصلة الجرس کے مانند ہونے کی صورت میں اس قدر تعب اور مشقت پیش آتی تھی کہ نہایت سخت سردی میں بھی پسینہ پسینہ

ہوجاتے تھے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے اس تاکیدی جملہ **وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الوَحْيُ فِي اليَوْمِ الشَّدِيدِ البَرْدِ، فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا** سے معلوم ہوتا ہے۔

یہ چھٹی بحث أشد سے متعلق اس کی وجہ اور اس کی مراد کے بارے میں تھی، جس کا بیان ختم ہوگیا۔

اس کے بعد والی بحث کہ تمثل ملک بشکل بشری کی کیا نوعیت تھی اور کیوں تھی؟ اس پر دلیل کیا ہے؟ ان سب بیانات کے لیے اب وقت مساعد نہیں، آپ حضرات کافی دیر سے بیٹھے ہیں، بھوک کا بھی یہی تقاضا ہوگا، اطمینان وسکون مختل؛ اس لیے ان شاء اللہ تعالیٰ کل آئندہ سکون کے ساتھ ان ابحاث پر گفتگو کی جائے گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

الدرس الثاني عشر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

ایک طالب علم نے قرآت حدیث فرمائی، اس کے بعد حسب ذیل بیان شروع فرمایا:

نزول وحی، یا یوں کہئے کہ اتیان وحی کی کیفیت کے سلسلہ میں حدیث میں دوصورتوں کا ذکر ہے جن میں سے ایک کا بالتفصیل کل بیان ہو چکا ہے۔

آج دوسری صورت جو کہ ساتویں بحث ہے، جملہ **وَأَحۡيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ المَلَكُ رَجُلاً** میں مذکور ہے یعنی فرشتہ انسانی شکل میں سامنے آ کر ہم کلام ہوتا تھا۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب فرشتہ انسان کی صورت اور بشری شکل میں ہوتا تھا، اس وقت فرشتہ کی کیا کیفیت ہوتی تھی؟ یعنی روح ملک نے جب اپنی اصلی صورت چھوڑ دی تو صورت ملک کا کیا حال ہوتا تھا؟ جیسا کہ انسان کی روح جب اپنی صورت اور نقشہ خاکی چھوڑتی ہے، اور اس سے خروج وانتقال کر جاتی ہے تو وہ جسم عنصری مادی مردہ ہوجاتا ہے، اسی طرح صورت ملک بھی کیا مردہ ہوجاتی تھی؟ یا زندہ رہتی تھی تو کس طرح؟ جب کہ روح نے اپنی اصلی صورت سے خروج کر کے دوسری صورت اختیار کرلی۔

اس سوال واشکال کے حل کے سلسے میں شراحِ محققین فرماتے ہیں کہ جو شئے لطیف اور غیر مادی ہوتی ہے، اس میں خاص قسم کے تصرفات وتقلبات کی صلاحیت اور قوت ہوتی ہے، چنانچہ خود انسان ہی جب اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ نفس میں لطافت پیدا کرلیتا ہے تو نفس ناطقہ عجیب عجیب تصرفات کی استعداد اور

قوت پالیتا ہے اور مختلف شکلوں میں متشکل ہوجاتا ہے، اور اصلی شکل باقی رہتی ہے یعنی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصلی شکل کے بقاء کے ساتھ اس کا مثیل بھی موجود ہوجاتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے میں انتقال روح کر کے اپنی شکل بظاہر بے حس وحرکت مع بقاء ادراکِ قلبی دوسرے جسم کے ساتھ موجود ہوجاتا ہے اور جب چاہتا ہے اس روح کو اپنے جسم اور اصلی شکل میں منتقل کرلیتا ہے۔

مجاہدین ومرتاضین کے ایسے واقعات بکثرت موجود ہیں، جب انسان سے بہ مجاہدہ وریاضت، بہ تصرفات نفس ناطقہ، بہ حسن ولطافت ایسے تقلبات ظہور پذیر ہوجاتے ہیں تو روح ملک تو بہ ذات خود الطف ہے، وہ مختلف اشکال میں متشکل ہو جائے تو کیا بعید ہے، وہ تو بطریق اولیٰ قدرت ودیعہ کے سبب بانواعِ مختلفہ متمثل او رمتشکل ہوسکتی ہے، اس لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام بشکل انسانی متمثل دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوتے، اب اس پر یہ سوال کہ صورت متمثلہ پر آثارِ جسم عنصری واقع ہوں گے یا نہیں؟ اس کا تفصیلی بیان حدیث اقْرَأْ، قَالَ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، قَالَ: فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي (۱) پر کیا جائے گا، اس وقت کا انتظار فرمائیے۔

آٹھویں بحث یہ ہے کہ نزولِ وحی کی اس حدیث میں دوصورتیں بیان فرمانے پر کیوں اکتفاء فرمایا، جب کہ نزولِ وحی کی اور بھی بہت سی صورتیں تھیں؟۔

جواب یہ ہے کہ کَیْفَ یَأْتِیكَ الوَحْيُ ؟ میں سوال سے احاطہ واستیعاب مقصود نہیں تھا بلکہ محاورہ اورعرف کے مطابق اکثری اوراغلبی نزولی کیفیت معلوم کرنا مطلوب تھی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب میں دوصورتیں بیان فرمانا نزولِ اکثری کے اعتبار سے صادر ہوا۔

دوسرے اگر جمیع کیفیات کا بھی سوال ہے تو ضروری نہیں ہوتا کہ مجیب سائل

(۱) صحیح البخاری، ۱/۲، کَیْفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ؟، رقم الحدیث: ۳.

کے تابع ہوکر جواب دے، بلکہ حکیمانہ انداز بقدرضرورت پر اکتفاء اورغیر ضروری سے التفات ہٹانا لائق ہوتا ہے، جیسا کہ﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ ﴾[البقرة: ۱۸۹] میں یہی صورت ہے، یا سائل کو دقت فہم سے بچانا اور آسانی وسہولت فہم کے پیش نظرسہل الفہم کے بیان پر اکتفاء فرمانا مناسب ہوتا ہے۔

تیسرے جواب میں اجمال اختیار فرمایا : چوں کہ نزول کی باقی صورتیں انھیں دوصورتوں کی طرف راجع ہوتی ہیں۔

چنانچہ وحی کا نزول یا تو بلاواسطہ ہوا یا بالواسطہ، بواسطہ ملک خواہ جبرئیلؑ یا کبھی میکائیلؑ وغیرہ کے ہو، مناماً ہوا یا یقظۃً ،سب یتمثل میں آ گیا، بلاواسطہ خواہ مناماً ہو، یا یقظۃً ، یہ سب صلصلة الجرس میں آ گیا،اس لیے کہ سب صورتوں کا مرجع یہی دوصورتیں تھیں، اس لیے ان دوصورتوں میں گویا اجمالاً آپ نے سب اقسام کوذ کرفرمادیا۔

چوتھے یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے تفصیلاً سب اقسام ذکر فرمادی ہوں ،لیکن راوی نے اختصار فرمادیا ہو۔

يَتَمَثَّلُ لِيَ المَلَكُ رَجُلًا میں رَجُلًا کے منصوب ہونے پر بحث کرتے ہوئے شراح بخاری علامہ عینیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بخاری میں بعض جملے نحوی اعتبار سے اشکال رکھتے ہیں، من جملہ ان مواقع کے یہ رَجُلًا بھی ہے، مفعولات خمسہ سے کوئی شان اس میں نہیں پائی جاتی ، نہ اس پر کسی فعل کا وقوع ہے اور نہ یہ مصدر ہے اور نہ ہی یہ کسی فعل کا سبب، لہٰذا یہ مفعولات میں نہیں ہوسکتا، اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں کہ یا تو یہ حال ہو یا تمیز، حال ہونا بھی اس پر صادق نہیں آتا، چوں کہ حال خبر کے طور پر ہوتا ہے اس میں خبر شان ہوتی ہے، پس اگر رجلاً کو حال مانا جائے تو الملک رجل کے مرتبہ میں ہوگا اور یہ معنی صحیح نہیں، چوں کہ فرشتہ کا بشر

ہونا اس کا مدلول ہوگا، اور یہ مدلول غلط ہوگا نیز حال میں تغیر ہوتا رہتا ہے تو تغیر و تبدل ہونے سے کیا وہ عورت یا بچہ ہوگا۔

اب تمیز کی صورت رہی ، سو یہاں رَجُلاً کا ملک سے تمیز بننا بھی صحیح نہیں، کیوں کہ تمیز رفع ابہام کے لیے ہوتی ہے، یہاں ملک میں ابہام نہیں جس کو رَجُلاً ختم کر رہا ہو اس لیے تکلیف کر کے اس کو منصوب بنزع الخافض کہہ سکتے ہیں، یہاں خافض مضاف تھا، اس کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کی جگہ رکھدیا گیا، تقدیر عبارت یہ ہے :یتصور لی الملک تصور رجل (۱)۔

نویں بحث یہ ہے کہ نزول وحی کے بہ طور صلصلہ بیان فرماتے وقت صیغۂ ماضی وَعَیْتُ اور ثانی بشکل رجل وحی لانے میں صیغۂ مضارع أَعِي استعمال فرمایا، اس کی کیا وجہ ہے؟۔

جواب یہ ہے کہ پہلی صورت میں انقطاعِ وحی کے بعد کی حالت مذکور ہے اور انقطاعِ نزولِ وحی کے بعد ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کے قلبِ مبارک میں وحی محفوظ ہوچکی ہوتی تھی، یہ چوں کہ صیغۂ ماضی کو مستلزم تھا، اس لیے بصیغۂ ماضی اس کو بیان فرمانا ہی مناسب تھا، اور دوسری صورت اثناءِ نزولِ وحی کا حال ذکر فرمایا کہ فرشتہ کلام الٰہی پیش کرتا رہتا، اور میں اس کو محفوظ کرتا رہتا تھا تو دورانِ نزول کی حالت ذکر فرمائی کہ نزولِ وحی کے ساتھ ساتھ حفظ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، جو کہ صیغۂ مضارع کو مستلزم تھا، اس لیے یہاں صیغۂ مضارع کا لانا ہی الیق تھا، چوں کہ مضارع تجدد و استمرار پر دلالت کرتا ہے (۲)۔

دسویں بحث : حدیث شریف میں سخت سردی کے وقت بھی نزولِ وحی کا یہ اثر مذکور ہے کہ پیشانی مبارک سے تیزی کے ساتھ پسینہ ٹپکتا تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟۔

---

(۱) عمدة القاری، ۱/۸۹.

(۲) فتح الباری، ۱/۲۷.

جواب یہ ہے کہ وحی کی عظمت اور اس کا معنوی وزن، ذمہ داریوں کا بار، یہ وہ چیز ہے کہ بہت بڑی طاقتیں بھی اس کا تحمل کرنے سے عاجز ہوگئیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ [الأحزاب: ۷۲] اس وحی اور کلام الٰہی کا اس قدر بھاری اور معنوی وزن ہے کہ پہاڑ جیسی چیز بھی اس کا تحمل نہیں کرسکتی، ارشاد ہے: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ [الحشر: ۲۱] یہ حضور ﷺ ہی کا دل گردہ ہے کہ اس کا تحمل فرمالیا، آپ ﷺ کی قوت کا کیا ٹھکانا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ کے اندر جنت کے چالیس مردوں کی قوت تھی (۱) (ایک جنتی مرد میں سو دنیوی مردوں کی طاقت ہوگی (۲) اور دنیا میں ایک مرد کو چار عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے، اس طرح آپ ﷺ میں سولہ ہزار عورتوں کی قوت تھی، پھر بھی آپ نے نو پر اکتفاء فرمایا، یہ آپ کی حفاظت تھی، پس کثرت ازواج آپ کے لیے باعث اشکال واعتراض نہیں ہوسکتی۔

وحی کا ثقل کسی درجہ دوسروں پر بھی محسوس ہوتا تھا، چنانچہ ناقہ قصویٰ پر سوار ہونے کی حالت میں نزولِ وحی کے سبب اونٹنی چل نہیں سکتی تھی، کھڑی ہوجاتی تھی، اور دوسری اونٹنی تو بیٹھ ہی جاتی تھی (۳) ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ران پر آپ ﷺ کی ران مبارک تھیکہ وحی کا نزول شروع ہوگیا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری ران پھٹی جارہی تھی (۴)، وحی ایک معنوی اور

(۱) المعجم الأوسط للطبرانی، باب الألف من اسمه أحمد، ۳۳۹/۱.
(۲) سنن الدارمي، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رضی الله تعالی عنه، بَابُ :مَا يُقَالُ لِأَهْلِ الْجَنَّةِ إِذَا دَخَلُوهَا، وَمِنْ كِتَابِ الرِّقَاقِ، رقم الحديث: ۲۸۶۷.
(۳) مسند أحمد، ۱۱۸/۶.
(۴) صحيح البخارى، ۶۶۰/۲، كتاب التفسير، سورة النساء، بَابُ قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: {لاَ يَسْتَوِي القَاعِدُونَ مِنَ المُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ إلخ، رقم الحديث: ۲۸۳۲.

باطنی غیر مادی چیز ہے، اس کا اثر روح انسانی پر ہوتا ہے۔

اس اثر یعنی رعب وہیبت اور ثقل وشدت کو ابھی آپ حضرات اچھی طرح نہ سمجھ سکے ہوں تو اور سمجھاؤں، خیر! اپنی مثال تو کیوں دوں، دیوبند میں ہمارے ابوداؤد شریف کے استاذ مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو مادرزاد ولی تھے، تھانہ بھون بھی تشریف لایا کرتے تھے، بڑے بزرگ تھے، راندیر (گجرات) انتقال ہوا، وہیں ان کا مزار شریف ہے، عصر کے بعد تعویذ دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک دوہرے جسم کا طالب علم جو اکثر حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور خدمت بھی انجام دیتا رہتا تھا مگر اس کے باجود ایک مرتبہ ان کی کسی بےعنوانی پر جب حضرت میاں صاحب نے غصہ میں ایک جملہ فرمادیا تو وہ طالب علم تحمل نہ کرسکا، فوراً غش کھا کر زمین پر گر پڑا، دیکھئے! جب کلامِ انسانی کا یہ اثر ہے تو کلامِ احکم الحاکمین کا تجلیٔ جلالت کے ساتھ کیا کچھ اثر ہوگا۔

اسی طرح جب کسی کی صحیح معرفت ہوجاتی ہے تو بغیر تلفظ وتکلم کے بھی محض مشاہدہ ہی سے جسماً وقلباً ایک خاص رعب وہیبت طاری ہوکر پسینہ آجاتا ہے، چنانچہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ جولساناً فصیح، قلباً جری، اور جسماً عظیم الہیکل اور شدید القویٰ تھے، ان سب اوصاف کے باوجود ایک مرتبہ جب وہ تھانہ بھون حاضر ہوئے تو ریل سے اترتے ہی متأثر ہوگئے اور خانقاہ پہنچ کر ابھی حضرت والا کا مشاہدہ بھی نہیں ہوا کہ گھبراہٹ شروع ہوگئی، جب مجلس میں پہنچ کر مشاہدہ سے دوچار ہوئے اور ہم کلامی کا موقع ہوا تو عجیب تحیرانہ اور خائفانہ لرزہ براندامی کیفیت تھی، یہ بات بذاتِ خود انھوں نے حضرت مولانا خیر محمد صاحب خلیفۃ حضرت والا قدس سرہ سے بیان فرمائی تھی۔

غرض وحی کا اس قدر اثر ہے، عظمت وجلالِ صفاتِ الٰہیہ اس میں موجود ہیں، ہمیں جو بھاری معلوم نہیں ہوتا تو اس کو تجلیٔ استتار نے مخفی کر رکھا، ورنہ تلاوت بھی

نہ کر سکتے ، ہاں جس قدر دل میں نور اور صفاء ہوتا ہے تو محسوس ہوتا ہے، اہل دل مشاہدہ سے پوچھو! ان پر کیا گذرتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو سراپا نور ہیں، پھر اہل لسان ہیں، کلام کے اسرار اور اس کے نشیب وفراز اور طور انداز، فصاحت وبلاغت سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے آپ باوجود نہایت اعلیٰ درجہ قوت رکھنے کے متکلم کے کلام میں اس کے آثارِ عظمت وجلال کے احساس سے متأثر ہورہے ہیں، سخت سردی میں بھی پسینہ پسینہ ہوجاتے ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: **وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الوَحْيُ فِي اليَوْمِ الشَّدِيدِ البَرْدِ، فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا**، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس کو دلیل بنایا جاسکتا ہے اس بات پر کہ یہ کلام خود ساختہ نہیں ہوسکتا، اور کسی اور انسان کا بھی کلام نہیں ہوسکتا، بھلا کہیں خود اپنے یا اپنے جیسے انسان کے کلام سے بھی کسی عظیم القوت ہستی پر ایسا اثر ہوا کرتا ہے؟۔

نیز جب کہ دنیائے عرب فصاحت وبلاغت کی اعلیٰ ترین پرواز پر فائز تھی اور اہل عرب اپنی زبان دانی اور فصاحت لسانی، بلاغت بیانی پر نازاں تھی، حقائق اور واقعات کو فی البدیہہ بلا کسی غور وفکر اشعار میں نہایت موزونیت کے ساتھ بیان کر کے لوگوں کو متحیر اور عاجز بنا دیتے تھے، انشاء اور ادب کے دونوں فنون میں کمال مہارت کے مالک تھے، اسی بنا پر وہ اپنے مقابلہ میں دیگر تمام اہل زبان کو عجمی اور گونگے کہا کرتے تھے، ایسے نہائی عروج زبان دانی کے زمانے میں اس کلام کا ظہور ونزول ہوا تھا، اول اول تو اس کو سن کر بعضوں نے یہ بھی دعویٰ کر دیا تھا کہ ﴿**لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ**﴾ [الأنفال: ۳۱]: اگر ہم چاہیں ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں۔

لیکن جب پورے اطمینان اور قوت وحوالت کے ساتھ بے کھٹک جمیع مخلوق کے پورا زور لگا کر بھی اس کا مقابل لانے سے عاجز اور قاصر ہونے کا ان

الفاظ میں اعلان فرمادیا : ﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴿۸۸﴾ ﴾ [الإسراء] تو ظاہر ہے دعوی داروں کو کس قدر انگیخت ہوئی ہوگی، کس قدر جوش وخروش کا طوفان اذہان میں برپا ہوا ہوگا، اور اس کا مثل لانے میں اپنی قابلیت اورقوت کے کیا کچھ جوہر نہ دکھانا چاہے ہوں گے، یقینا اپنے دعوے کوسچا کر دکھانے اوراپنی بات کواونچا کرنے میں پوری جدوجہد کا کوئی دقیقہ اورشمہ بھی فروگذاشت نہیں کیا ہوگا،لیکن سوائے خائب اورخاسر اور عاجز وقاصر رہ جانے کے کچھ بھی نہ بن سکا۔

پھر اسی قدر اعلان پر بس نہیں فرمایا بلکہ تکمیل حجت کے لیے دوسرا اعلان اس سے اترکر بانگ دہل ان الفاظ میں فرمایا:﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴿۱۳﴾ ﴾[ھود] ،جب دس سورتیں بھی اس جیسی پیش نہیں کرسکے تو اوربھی تنزل فرما کراعلان صادرفرمایا کہ اچھا اگردس سورتیں نہیں لاسکتے تو ایک ہی سورت اس جیسی لے آؤ﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴿۲۳﴾ ﴾ [البقرہ:۲۳] اور ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴿۳۸﴾ ﴾[یونس] کہ اگرتمھیں اس کے کلام کےحق ہونے میں شک ہے اورتمہارا یہ خیال ہے کہ کلام انھوں نے خودگھڑلیا ہے،توتم بھی گھڑلاؤاورجس کوتم اس سلسلے میں مدد کے لیے بلانا چاہو، بلالو، اورمدد حاصل کرلو، اگرتم ایسا نہ کرسکو ،اورہم بتلائے دیتے ہیں کہ تم قیامت تک بھی نہ کرسکو گے۔

غورکیجئے کہ مخالفین کو یہ سن کرکس قدر پیچ وتاب آیا ہوگا، اورسعی، کوشش کا

کوئی دقیقہ بھی نہ چھوڑا ہوگا، لیکن جب عاجز ہو گئے تو اپنا سا منھ لے کر بیٹھ گئے، یہ صاف اور قطعی دلیل ہے اس بات کی کہ یہ کلام کسی بشر اور کسی مخلوق کا ہرگز نہیں ہوسکتا، بلکہ خالق عالم کا کلام ہے۔

اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ کچھ لکھا تو ہوگا، گم ہو گیا ہوگا، کیوں کہ یہ بات عادۃً محال ہے، چوں کہ قرآن مجید کے حامی ہر زمانے میں کم رہے ہیں، جب یہ محفوظ چلا آرہا ہے تو اس کے مخالفین اس کے مقابلے کی تحریر کو — جب کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے — کیسے ضائع ہونے دیتے، اس لیے یہ شبہ محض مہمل اور لغو ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کلام کسی مخلوق کا کلام نہیں، ورنہ مخلوق اس کا مثل لانے سے عاجز نہ ہوتی۔

نیز اگر کسی مخلوق کا کلام ہوتا تو مخلوق میں چوں کہ تغیر وتبدل کا ہونا ایک لازم غیر منفک ہے، اس لیے اس کا علم، اس کا فہم، اس کا عندیہ اس کا کلام بدلتا رہتا ہے، اسی واسطے عقلاء کی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں، ان کی معلومات میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے؛ لہٰذا ان کی آراء، ان کے فیصلے واحکام اور کلام میں تعارض وتناقض ہوتا رہتا ہے، اسی کو ارشاد فرمایا: ﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ [النساء] کہ اگر یہ کلام کسی مخلوق کا ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے اور اس واقعے سے اور حکمت ودانائی سے کوئی اختلاف نہیں، احکام وقوانین اس کے متعارض ومتناقض نہیں، یہ کلام تو ایسا بے مثل اور عدیم النظیر ہے، جس کی آیتیں لفظی ومعنوی ہر حیثیت سے جچی تلی ہیں، نہ ان میں تناقض ہے، نہ کوئی مضمون واقع کے خلاف، نہ حکمت ومصلحت کے خلاف، نہ فصاحت وبلاغت کے خلاف، یہ وہ کلام ہے جس میں تہذیب وتمدن، اخلاق ومعاشرت، حکومت وسیاست، معرفت وروحانیت، تزکیۂ نفوس، شفائے صدور، صفائے قلوب، شہنشاہانہ شان وشکوہ، جامع ومؤثر اندازِ بیان اور حلاوت ولذت، تفننِ کلام

سب کو بیک وقت حاوی ہے۔

غرض عالم کے مزاج کی پوری طرح صحیح تشخیص کر کے قیامت تک پیش آنے والے حوادث وتغیرات کو من کل الوجوہ جانچ تول کر اس کلام کو ایسی معتدل اور ابدی غذائے روح بنا دیا جو تمام جہانوں ،تمام زبانوں کے لیے ہر وقت، ہر حالت میں موافق اور مناسب ہے، ان کے اصول وفروع ، اخلاق واعمال، دلائل وبراہین سب علم وحکمت کی میزان پر پوری طرح آنے والے اور نہایت مضبوط ومحکم ہیں،﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝﴾[ہود] اسی واسطے اس کی نظیر اور مثال ممکن نہیں۔

ثابت ہوا کہ یہ کلام کسی مخلوق کا ہرگز نہیں، بلکہ یہ بے مثل ذات، خدائے پاک، خالق برتر ہی کا ہے،جس کا علم ہر شئے کو محیط،جس کی قدرت ہر شئے پر حاوی اور غالب ہے، اسی کا علم اور قدرت اس کلام میں رونما اور کارفرما ہیں،مخلوق کا علم، مخلوق کی قدرت اس کے علم وقدرت کے سامنے کسی شمار میں نہیں، اسی لیے مخلوق ایسا کلام لانے سے عاجز رہ گئی۔

پس یہ کلام ربانی معجزہ ہے اور معجزہ بھی اس قدر مکمل کہ ہر جہت اور ہر اعتبار سے معجزہ ہے،عبارت کے اعتبار سے بھی، مضامینِ حکمت کے اعتبار سے بھی، اخبارِ ماضیہ اور مستقبلہ کے اعتبار سے بھی، رسم الخط کے اعتبار سے، لہجۂ قرآت کے اعتبار سے بھی ، حفظ والفاظ وکلمات کے اعتبار سے بھی، تاثیر کے اعتبار سے بھی ،لذت وحلاوت کے اعتبار سے بھی، اس لیے یہ کہنا بالکل درست اور عین مطابق ہے کہ ہر ہر آیت ایک مستقل معجزہ ہے اور معجزہ بھی وقتی نہیں، دائمی اور ابدی ہے اور تمام مخلوق جن وانس کے لیے ہے جو ہمیشہ دعوت توحید ورسالت یعنی دعوت اسلام دیتا اور﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۱۴﴾[ہود] پکارتا رہے گا، پھر چوں کہ معجزہ نبوت کے لیے دلیل ہوتا ہے، اس لیے معجزہ کی شان نبوت کی شان بھی واضح

ہو جاتی ہے۔

تو جب یہ معجزہ عام وتام، دائمی اور ابدی ہے تو آپ کی نبوت بھی عام وتام، تمام جنوں، انسانوں اور قیامت تک تمام مکانوں، ملکوں اور زمانوں کے لیے لابدی طور پر ثابت اور واضح ہے، ارشاد ہے: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝۱﴾ [الفرقان]۔

یہ بات وحی کے کلام الٰہی ہونے کے بیان میں ضمناً آ گئی تھی تو جب وحی کلام الٰہی ہے اور کلام میں متکلم کے صفات وکمالات کا انعکاس ہونا مسلم ہے، تو ظاہر ہے کہ متکلم کے عظمت وجلال کا اثر اس کے کلام میں لازماً ہوگا، اسی لیے مسئلہ مسلمہ ہے کہ كَلَامُ الْمُلُوكِ مُلُوكُ الْكَلَامِ، اسی وجہ سے آں حضرت ﷺ پر رعب وہیبت، ہیبت وخشیت کا بھرپور اثر ہوتا تھا پھر ایک دو دفعہ کی بات نہیں اور ایسا بھی نہیں جیسا کہ حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام پر دس مرتبہ اور حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام پر پانچ مرتبہ اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام پر سات مرتبہ اور حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام پر دس مرتبہ وحی کا نزول ہوا، اور آپ پر ۲۴ رہزار مرتبہ وحی کا نزول ہوا، اور تعدد نزول سے آپ کو بے تکلفی اور عادت بھی نہیں ہوئی کہ قلت احساس ہو کر عمل سہل ہو جاتا، بلکہ اول دن جو عظمت اور خوف وخشیت کا طریان ہوا، وہ آخر وقت تک جاری رہا اور حسب ازدیادِ علم ومعرفت اس تأثر میں زیادتی ہوتی رہی، جیسا کہ ارشاد ہے: أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ (۱) اور إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ (۲)، کہ میں تم سب سے زیادہ حق تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہوں، اور سب سے زیادہ ہی خشیت وعظمت رکھتا ہوں۔

---

(۱) صحيح البخارى، عَنْ عَائِشَةَ رضى الله تعالى عنها، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ إلخ، رقم الحديث: ۲۰.

(۲) صحيح البخارى، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضى الله تعالى عنه، كتاب النكاح، بَابُ التَّرْغِيبِ فِي النِّكَاحِ، رقم الحديث: ۵۰۶۳.

معلوم ہوا کہ کثرتِ نزول اور ازدیادِ علم سے خوف وخشیت اور ہیبت وعظمت اور اس کے آثار زیادہ سے زیادہ ہی ہوتے رہے، تو اس قدر کثیر در کثیر شدائد واثقالِ وحی کا تحمل فرمانا آپ ہی کا حوصلہ تھا، تو بار بار ہم کلامی کے باوجود آپ پر ثقل وشدت کے تاثرات کا زیادہ سے زیادہ ہونا یہ بھی ایک مستقل دلیل ہے اس کلام کے کلام ربانی ہونے کی، چوں کہ انسان کے ساتھ بار بار ہم کلامی سے بے تکلفی ہوجاتی ہے اور رعب وہیبت کم ہوجاتی ہے اور یہاں ایسا نہیں ہوا۔

یہاں سے ایک بات کا سبق لینا چاہئے کہ اپنے بڑوں کی عنایت والطاف دیکھ کر ادب وعظمت اور اس کے اعزاز واحترام کا برابر پورا پورا احساس اور لحاظ رکھنا چاہئے، اس کی طرف توجہ اور التفات دلانا اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ دیکھا جاتا ہے کہ بڑوں کی عنایات اور خصوصی توجہات سے بعضے ایسے بے تکلف ہوجاتے ہیں کہ اس بے تکلفی میں فرق مراتب کا لحاظ نہیں رکھتے، یہ بے سعادت مندی ہے کہ اپنے بڑے سے خلافِ تہذیب اور اس کے خلافِ شان بات کر جاتے ہیں، اس کی حیثیت اور اپنا چھوٹا ہونا ملحوظ نہیں رکھتے، یہ شرافت اور تہذیب کے بالکل خلاف اور نہایت گری ہوئی بات ہے، بے تکلفی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بڑے کے مرتبہ کا لحاظ ختم کردیا جائے اور آزادانہ کلام کرنے لگے، یہ ہلکا پن اور اوچھا پن ہے، ایسا کرنے سے محروم اور مسلوب الفیض ہوکر ﴿خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ ؕ﴾ [الحج: ۱۱] میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ کاتب وحی نے اپنے پر ایک جھلک جو فیض نبوت کی دیکھی کہ حضور ﷺ پر جو نزولِ وحی ہوا، اس کی تجلی انعکاسی کاتب وحی کے قلب پر وارد ہوئی تو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلمکے لکھانے سے پہلے ہی لکھ لیا، جب آپ نے فرمایا کہ آگے یہ لکھئے تو کہنے لگے: یہ تو میں پہلے لکھ چکا ہوں، اس سے وہ اس خیال میں مبتلا ہوگئے کہ مجھ پر وحی نازل ہونے لگی، اپنے کو کامل اور قابل سمجھ کر آپ کی احتیاج نہ سمجھی اور

مستغنی ہو گئے، چنانچہ مکہ کو چھوڑ کر چل دئے، بس مرتد ہو گئے (۱)۔

برخلاف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہ متعدد بار ان کی رائے کے مطابق وحی نازل ہو (۲) مگر کبھی یہ خیال نہیں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہ جائے وحی سے میری تائید ہوئی تو میں بھی شان نبوت کا حامل ہو گیا کہ معنوی وحی مجھ پر بھی نازل ہو گئی نہ حضورؐ کی عظمت میں فرق ڈالا، نہ ساتھ ہی چھوڑا، برابر آپ کے در کی جبہ سائی کرتے رہے، اخیر عمر تک آپ سے پورے طور پر وابستہ رہے، یہ ہے صلاحیت اور استعداد کی بات، اور کیوں نہیں؟ آخر پہلے بھی تو عمر موجود تھے، جب کیوں ایسا نہیں ہوا تھا؟ معلوم ہوا کہ یہ سب آپ ہی کے فیض صحبت کا اثر تھا، ان کے باطن میں آپ کے نورِ نبوت نے عکاسی کی تھی۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیوں وحی کے موافق انکشاف نہ ہوا تھا؟، بات اصل میں یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے بھی من جانب اللہ ہی تھی، فرق اتنا رہا کہ پہلے وحیٔ خفی تھی، بعد میں وحیٔ جلی، اور جس بات کے متعلق وحی نازل ہوئی تھی وہ اور جو آپ کی رائے ہوتی وہ، دونوں صورتیں، دونوں باتیں جائز تھیں۔

نیز آپ کا ہر کلام اور ہر کام امت کے لیے ایک مستقل قانون اور دفعات

---

(۱) یہ عبداللہ بن ابی سرح ہے: عبد الله بن أبي سرح كان كاتب الوحي فكان النبيّ ﷺ إذا أملى عليه سَمِيعاً عَلِيماً يكتب عليماً حكيماً. وإذا أملى عليه عليماً حكيماً، كتب هو سميعاً بصيراً وشكّ وقال: إن كان محمد ﷺ يوحى إليه فقد أوحي إليّ وإن كان ينزل إليه فقد أنزل إليّ مثل ما أنزل إليه فلحق بالمشركين وكفر. (بحر العلوم للفقيه أبى الليث السمرقندى)

(۲) حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق قرآنِ پاک میں کئی آیات نازل ہوئی ہیں، خود حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: وَافَقْتُ رَبِّي فِي ثَلَاثٍ الحديث، اور ایک موقعے پر فرمایا: وَافَقْتُ رَبِّي فِي أَرْبَعٍ، اور علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ پانچ مواقع پر موافقت ہوئی ہے، والله تعالى أعلم. (تفسير القرطبى، ۱۱۲/۲، تحت قوله تعالى: وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى)

اور مختلف حالات وحوادثاتِ جدیدہ کے پیش آتے رہنے پر مسئلہ کا درجہ رکھتا تھا، مسئلۂ نسخ بھی اسی کا ایک فرد ہے، اس لیے حضور ﷺ کو محمل آیات میں عملاً بعض دفعہ مختلف پہلو آتے تھے، مثل اُساریٰ بدر وغیرہ واقعات میں اس کا بیان مفصل آچکا، نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے بھی آپ ہی کے انعکاسِ قلبی سے ایک رخ ہوتا تھا، اور آپ کا دوسرا رخ بربنائے شفقت اور بمصداق ﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۝۱۰۷ ﴾ [الأنبياء] کا مظہر ہوتا تھا۔

یہ کلام ضمناً نزولِ وحی کے وقت ثقلیت واشدیتِ وحی کے ذکر میں آ گیا، بیان یہ تھا کہ جب آپ پر وحی کا نزول ہوتا تھا، آپ کے اعضاء وجوارح، قلب وروح بیک لخت ویکسر اس عالم سے منقطع ہوکر وحی کی طرف بالکلیہ اس درجہ آپ کی توجہ اکمل واتم ہوتی تھی کہ گویا آپ سراپا وحی ہوجاتے تھے، اس کا ثقل اس درجہ ہوتا کہ موسم سرما میں جبین مبارک سے پسینہ ٹپکتا تھا اور بوجہ سراپا وحی ہوجانے کے وحی بہ محافظت اور بہ وعدۂ حق ﴿ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ ۝۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ ۝۱۹ ﴾ [القيامة] اپنے الفاظ اور مالہ وماعلیہ کے ساتھ محفوظ ہوجاتی تھی۔

گیارہویں آخری بحث : ان دس بحثوں کے بعد گیارہویں بحث حدیث کی ترجمۂ باب سے مناسبت بیان کرنے کے سلسلے میں ہے۔

سو ترجمۂ باب کیفیت بدوالوحی کے بارے میں قائم فرمایا تھا اور حدیث میں کیفیت نزول وحی کے سوال پر جواب میں دو صورتیں بیان فرمائی، معلوم ہوا کہ وحی کا نزول وظہور ان دو صورتوں میں اکثر ہوا کرتا تھا یا تو جبریل علیہ السلام يَتَمَثَّلُ رَجُلًا وحی لاتے تھے یا بلاواسطۂ آواز مثل صلصلۃ آتی تھی اور باب بھی بُدُو وظہورِ وحی کی کیفیت سے متعلق تھا(۱)۔

---

(۱) فتح الباری، ۱/۲۴.

دوسری صورتِ مناسبت حدیث بترجمۃ الباب کی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ باب کیف کان بدء الوحی عنوان باب سے مقصود یہ ہے کہ وحی کی کیا شان تھی؟ یعنی وحی کی عظمت اور حفاظت وعصمت بیان کرنا مقصود ہے، وہ اس حدیث سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے(۱)، جیسا کہ حق تعالیٰ کے فرمان ﴿اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا۵﴾ [المزمل] سے ظاہر ہے، چوں کہ وَھُوَ أَشَدُّہُ عَلَي فرمایا، جس سے معلوم ہوا کہ وحی بواسطۂ جبرئیل بھی ثقالت رکھتی تھی، اور صلصلہ والی تو بہت ہی ثقیل، نہایت وزنی ہوتی تھی، اسی کا یہ اثر تھا کہ سخت سردی میں بھی آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے، جوعلامت ہے نہایت عظمت وہیبت کے مستولی ہونے کی، پھر آپ فرمارہے ہیں :وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْہُ مَا قَالَ جس سے محفوظیت ظاہر ہے کہ ادھر نزول ہوا، ادھر حفظ موجود، جو کچھ الفاظ وحروف مع حرکات وسکنات وطورِادا، لہجۂ قرآت آپ کو پہنچا، سب کا سب بلاتغیر وتبدل، بلاکم وکاست، بغیر کسی خطا وغلطی جوں کا توں آپ نے محفوظ فرمالیا، جیسا کہ قَدْ وَعَيْتُ عَنْہُ کے لفظ سے معلوم ہورہا ہے۔

غرض آپ کی مشقت اور پسینہ سے عظمت اور وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْہُ سے عصمت عیاں ہے، اس طرح سے حدیث شریف کو ترجمۂ باب سے حقیقی ومجازی یا مطابقی والتزامی دونوں قسم کی مناسبتیں موجود ہیں، الحمد للہ تعالیٰ اس حدیث میں جوبحثیں تھیں، وہ ختم ہوگئیں۔

حق تعالیٰ وحی کی عظمت وجلالت ہمارے قلوب میں جاگزیں فرماویں، اور عظمت وحرمت کے ساتھ سننا، سمجھنا نصیب فرماویں۔آمین یارب العالمین

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(۱) الأبواب والتراجم، ص ۱۳.

الدرس الثالث عشر

حسب دستور ایک طالب علم نے پوری حدیث کی قرآت کی، اس کے بعد حضرت والا دامت برکاتہم نے ترجمہ حدیث اور مباحث کو شمار فرمایا:

۳ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ، قَالَ :أَخْبَرَنَا اللَّيْثُ، عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رضى الله تعالى عنها أَنَّهَا قَالَتْ :أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنَ الوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ، فَكَانَ لاَ يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ، ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الخَلاَءُ، وَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ - وَهُوَ التَّعَبُّدُ - اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ العَدَدِ قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ، وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا، حَتَّى جَاءَهُ الحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءٍ، فَجَاءَهُ المَلَكُ فَقَالَ :اقْرَأْ، قَالَ: فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، قَالَ :"فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الجَهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ :اقْرَأْ، قُلْتُ :مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الجَهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ :اقْرَأْ، فَقُلْتُ :مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ :{اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. خَلَقَ الإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اقْرَأْ وَرَبُّكَ الأَكْرَمُ} [العلق]" فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَرْجُفُ فُؤَادُهُ، فَدَخَلَ عَلَى خَدِيجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، فَقَالَ :زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي فَزَمَّلُوهُ حَتَّى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ، فَقَالَ لِخَدِيجَةَ وَأَخْبَرَهَا الخَبَرَ :لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي فَقَالَتْ

خَدِيجَةُ: كَلَّا وَاللَّهِ مَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الكَلَّ، وَتَكْسِبُ المَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الحَقِّ، فَانْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ حَتَّى أَتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِ العُزَّى ابْنَ

عَمِّ خَدِيجَةَ وَكَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِي الجَاهِلِيَّةِ، وَكَانَ يَكْتُبُ الكِتَابَ العِبْرَانِيَّ، فَيَكْتُبُ مِنَ الإِنْجِيلِ بِالعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَكْتُبَ، وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ، فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ :يَا ابْنَ عَمِّ! اسْمَعْ مِنَ ابْنِ أَخِيكَ، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ :يَا ابْنَ أَخِي مَاذَا تَرَى؟ فَأَخْبَرَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ خَبَرَ مَا رَأَى، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ :هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي نَزَّلَ اللّٰهُ عَلَى مُوسَى، يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعًا، يَا لَيْتَنِي أَكُونُ حَيًّا إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ :أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ، قَالَ :نَعَمْ، لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ، وَإِنْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا. ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ تُوُفِّيَ، وَفَتَرَ الوَحْيُ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ :وَأَخْبَرَنِي أَبُو سَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ الأَنْصَارِيَّ رضی اللہ تعالی عنہما، قَالَ: وَهُوَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الوَحْيِ فَقَالَ فِي حَدِيثِهِ :"بَيْنَا أَنَا أَمْشِي إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِنَ السَّمَاءِ، فَرَفَعْتُ بَصَرِي، فَإِذَا المَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلَى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ، فَرُعِبْتُ مِنْهُ، فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ : زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي" فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالَى :﴿يَا أَيُّهَا المُدَّثِّرُ ① قُمْ فَأَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤﴾ [المدثر] فَحَمِيَ الوَحْيُ وَتَتَابَعَ تَابَعَهُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوسُفَ، وَأَبُو صَالِحٍ، وَتَابَعَهُ هِلاَلُ بْنُ رَدَّادٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، وَقَالَ يُونُسُ، وَمَعْمَرٌ بَوَادِرُهُ.

ترجمۂ حدیث شریف

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حدیث بیان فرمائی ہمارے استاذ حضرت یحییٰ بن بکیرؒ نے، انھوں اپنی سند حدیث کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ ہم سے خبر رسول یعنی حدیث نبوی حضرت لیثؒ نے بیان فرمائی تھی، حضرت عقیلؒ سے روایت فرماتے ہوئے، اور انھوں نے یہ حدیث حضرت ابن شہاب زہریؒ

سے روایت فرمائی تھی حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت فرماتے ہوئے، اور وہ حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ تعالی عنہا سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے فرمایا تھا کہ سب سے پہلی بات وحی کی جو حضرت رسول اللہ ﷺ کی طرف گئی، وہ سونے کی حالت میں اچھے خوابات تھے۔ پس آپ ﷺ کوئی خواب نہیں دیکھتے تھے مگر وہ خواب نور صبح کی طرح واقعے کی حقیقت ظاہر کردیتا تھا، خواب میں جیسا دیکھتے تھے اور جو کچھ دیکھتے، بیداری میں وہی اور اسی طرح ظاہر ہوتا تھا، پھر آپ ﷺ کی طرف خلوت کی محبت ڈال دی گئی یا پھر آپ کے نزدیک تنہا رہنا محبوب و پسندیدہ ہوگیا۔

چنانچہ آپ ﷺ غار حراء میں خلوت نشین رہنے لگے اور وہاں عبادت فرمانے لگے، "یَتَحَنَّثُ" کی تفسیر فرماتے ہیں کہ مراد چند راتوں عبادت میں مشغولی ہے، "قَبلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ" یعنی یہ مشغولی مسلسل چند راتوں تک رہتی تھی، بیچ میں گھر تشریف نہیں لاتے تھے، اور ان ایام ولیالی کا توشہ اپنے ساتھ لے جاتے پھر یعنی جب توشہ ختم ہوجاتا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کے پاس تشریف لاتے اور اسی کے مثل یعنی حسب سابق پھر توشہ چند رات گذارنے کا ہمراہ لے جاتے، یہ سلسلہ چلتا رہا حتّٰی کہ غارِ حراء ہی میں آپ کے پاس حق یعنی وحی آ گئی، فرشتہ یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لائے اور آپ سے عرض کیا پڑھئے! آپ نے فرمایا کہ میں پڑھنا جاننے والا نہیں، جیسا کہ عرف میں یہی معنیٰ مستعمل و مراد ہوتے ہیں۔

" فَأَخَذَنِي " آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر مجھے پکڑا اور دبایا، یہاں تک کہ میری انتہائی طاقت کو پہنچ گیا، پھر چھوڑ کر فرمایا پڑھئے! میں نے جواب دیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں، پھر مجھے دوسری مرتبہ پکڑا اور دبایا یہاں تک کہ میری انتہائی طاقت کو پہنچ گیا اور چھوڑ کر فرمایا پڑھئے! میں نے پھر کہا کہ میں پڑھا ہوا

نہیں، پھر مجھے پکڑا اور تیسری مرتبہ دبایا پھر چھوڑ دیا اور فرمایا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳﴾ [العلق] پڑھئے! اپنے رب کا نام لے کر جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، اور انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا فرمایا، ہاں تو پڑھئے! آپ کا رب نہایت کرم والا ہے۔

پس ان آیات کو لے کر رسول اللہ ﷺ گھر واپس ہوئے، اس حال میں کہ آپ کا دل لرزرہا تھا، تو آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے کمبل اڑھادو، کمبل اُڑھادو، گھر والوں نے کمبل اُڑھا دیا، کچھ دیر بعد آپ ﷺ کا خوف اور گھبرانا چلا گیا دور ہو گیا، تو آپ ﷺ نے ان کو اپنا قصہ سنایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے تو اپنی جان کا خوف ہو گیا، حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا نے نہایت عمدہ پیرایے میں، زور دار الفاظ سے آپ ﷺ کی تسلی فرمائی اور یوں فرمایا کہ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، خدا کی قسم! وہ آپ کو کبھی رسوا نہیں فرمائے گا، چوں کہ آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں، کمزوروں، درماندوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں مفلسوں کو تلاش کر کر کے ان کی حاجتیں پورا فرماتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں، اور راہ حق میں مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت فرماتے ہیں۔

پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو اُن کے چچا زاد بھائی تھے، اور یہ ایسے شخص تھے کہ زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے، اور عبرانی زبان کے کاتب تھے، چنانچہ انجیل کو بھی حسب توفیق الٰہی عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے، بہت بوڑھے تھے، بینائی بھی جاتی رہی تھی، نابینا ہو چکے تھے، غرض حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا نے ان سے کہا بھائی! اپنے بھتیجے کی بات تو سنئے۔

پس ورقہ نے کہا اے بھتیجے! آپ کیا دیکھتے ہیں! اس پر آں حضرت ﷺ نے جو ماجرا دیکھا تھا، بتلا دیا، تو ورقہ نے آپ سے کہا کہ یہ تو وہی ناموس ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام پر نازل کیا اور ان کے پاس بھیجا تھا، مطلب یہ کہ آپ پر فرشتہ وحی لایا ہے، آپ نبوت کی شرافت عظیمہ اور منصب جلیل سے سرفراز فرمائے گئے ہیں، آپ لوگوں کو حق کی دعوت دیں گے، اور لوگ اپنی غلط عادتوں کے خلاف باتیں آپ کی طرف سے دیکھ کر آپ کی نبوت ودعوت سے بیزار اور برآزار ہوں گے، حتیٰ کہ آپ کو وطن مالوف مکہ مکرمہ سے نکال دیں گے، کاش میں اس حالت یعنی اس عہد نبوت میں جوان ہوتا!، کاش میں اس وقت زندہ رہتا جب کہ آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ مجھ کو نکالنے والے ہیں! تو ورقہ نے کہا ہاں! جیسی چیز آپ لائے ہیں، کوئی بھی ایسی چیز لے کر نہیں آیا مگر اس سے دشمنی کی گئی اور اگر مجھے آپ کا زمانۂ نبوت پالے یعنی میں اس وقت تک زندہ رہوں تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا، پوری قوت صرف کروں گا، لیکن ورقہ نے آپ کا یہ زمانہ نہیں پایا جلد ہی انتقال کر گئے، اور وحی کا نزول رُک گیا کچھ دنوں کے لیے بند ہو گیا۔

ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ تتمیم وتکمیل واقعہ کے لیے دوسری روایت کو شامل فرمارہے ہیں، اس لیے آگے کا واقعہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بواسطۂ ابوسلمہ بن عبدالرحمنؒ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ''فترۃ وحی'' یعنی وحی موقوف ہونے کے زمانے کی بات بیان فرماتے تھے، ایک دفعہ چلا جارہا تھا، اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی تو میں نے اوپر نظر کی، دیکھا تو وہی فرشتہ جو غار حراء میں میرے پاس آیا تھا، آسمان وزمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا ہے تو میں دہشت زدہ ہو کر گھر واپس ہوا، اور گھر والوں سے کہا مجھے کمبل اڑھا دو، کمبل اوڑھے لیٹا ہوا ہی تھا کہ اللہ

تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں :﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَأَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤﴾ [المدثر] (ان آیتوں کے متعلق آگے گفتگو آئے گی)۔ پھر وحی کی گرما گرمی چلی اور پے بعد دیگرے آنے لگی، دریائے وحی جوش میں آ گیا یعنی پے در پے نزول اور تواتر و تسلسلِ وحی شروع ہو گیا۔

متابعت کی اس کی یعنی یحییٰ بن بکیرؒ کی عبداللہ بن یوسفؒ اور ابو صالحؒ نے پوری روایت میں اور ہلال بن ردادؒ نے زہریؒ سے روایت کی یعنی عقیلؒ کی متابعت کی اور یونسؒ اور معمرؒ نے بھی یہ روایت اس فرق کے ساتھ بیان کی کہ ’’فُؤَادُ‘‘ کی جگہ ’’بَوَادِرُ‘‘ لائے جو بادرۃ کی جمع ہے، گردن اور کندھوں کے درمیان گوشت کو کہتے ہیں، جو خوف وگھبراہٹ کی حالت میں لرزنے اور کانپنے لگتا ہے۔ ترجمۂ حدیث شریف ختم ہو گیا۔

مضامین حدیث وتعداد مباحث حدیث

اب اپنی عادت کے موافق مضامین حدیث کو شمار کرایا جاتا ہے، جس کو تعداد مباحث کہئے یا مباحث حدیث کا اجمالی بیان کا عنوان دیجئے، جو بھی ہو، بہر حال یہ صورت مضامین کے ضبط کی ایک سہل اور آسان صورت ہے، سو غور سے سنئے، اس حدیث میں چند بحثیں ہیں:

(۱) اس حدیث کی راوی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں جو کہ بداءت وحی کے وقت موجود نہ تھیں پھر ان کا اس حدیث کو بیان کرنا کیسے صحیح ہے، جب کہ امام بخاریؒ نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ مرفوع احادیث کو بخاری شریف میں لائیں گے، پس یہ حدیث مرسل ہوئی جو کہ حجت نہیں پھر مسئلہ بداءت وحی پر یہ کیسے حجت ہو گی؟۔

(۲) رویائے صالحہ کے ساتھ وحی کی بداءت کیوں فرمائی اور خواب میں

رویائے صالحہ کے ساتھ بداءتِ وحی کیوں کرہوگی؟۔

(٣) وحی نبوت کے بعد ہوتی ہے اور رویائے صالحہ قبل ازنبوت تھے، پھر ان کے ساتھ وحی کی بداءت کس طرح مانی جائے گی؟۔

(٤) رویائے صالحہ کتنے عرصہ تک رہے؟۔

(٥) رویائے صالحہ وحی کا کون سا حصہ ہیں؟۔

(٦) رویا صالحہ کوفلق صبح کے ساتھ کیوں تشبیہ دی؟۔

(٧) خلوت کوحضور ﷺ کے لیے کیوں محبوب رکھا گیا؟۔

(٨) غارحراء کوخلوت کے لیے کیوں منتخب کیا گیااور غارحراء کہاں ہے؟۔

(٩) جب کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے حضور ﷺ کوابھی طریق عبادت تعلیم نہیں فرمایا تھاتوحضور ﷺ نے تحنثبمعنی عبادت کیوں اور کس طرح شروع فرمائی؟۔

(١٠) باوجود شبانہ روز عبادت کے رات کی عبادت کی کیوں تخصیص فرمائی؟۔

(١١) "جَاءَهُ الحقُّ" میں حق سے کیا مراد ہے؟۔

(١٢) حضرت جبرئیلؑ غارحراء میں کب کس ماہ میں آئے؟۔

(١٣) جب کوئی کتاب وصحیفہ سامنے نہیں تھا تو "اِقْرَأْ" فرماکر کس چیز کی قرأت کرائی جارہی ہے؟۔

(١٤) اخذ وتغطیہ کیوں کیا گیا؟۔

(١٥) تین مرتبہ کیوں ہوا؟۔

(١٦) یہ جہد ومشقت کس کو ہوئی؟ آپ ﷺ کو یا حضرت جبرئیلؑ کو؟ یا دونوں کو؟۔

(١٧) ابتدائے وحی ان آیات کے ساتھ کیوں ہوئی؟۔

(١٨) باء کولفظ اسم پر کیوں داخل کیا گیارب پر کیوں داخل نہ کیا؟۔

(١٩) اسم ذات اللہ کے بہ جائے وصف یعنی ربکیوں اختیار فرمایا؟۔

(۲۰) صفت خلق کو کیوں بیان فرمایا؟۔

(۲۱) لفظ خَلَقَ اپنے عموم میں انسان کو بھی شامل تھا پھر تخصیص خلق انسان کیوں کی؟۔

(۲۲) اقرأ کا کیوں تکرار فرمایا؟۔

(۲۳) رب کی صفت اَکرم کیوں لائی گئی؟۔

(۲۴) آپ کا دل کیوں گھبرانے لگا؟۔

(۲۵) سردی کا احساس کیوں ہوا کہ چادر اوڑھنی پڑی؟۔

(۲۶) آپ ﷺ نے اپنی جان ہلاک ہونے کا اندیشہ کیوں فرمایا؟۔

(۲۷) حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کے الفاظ "إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحمِلُ الكَلَّ، وَتَكسِبُ المَعدُومَ، وَتَقرِي الضَّيفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الحَقِّ" کی تشریح کیا ہے، نوائب کو حق کے ساتھ کیوں مقید کیا؟۔

(۲۸) حضور ﷺ کو ورقہ کی طرف ابن عم کے ساتھ کیوں منسوب کیا گیا؟۔

(۲۹) ناموس سے کیا مراد ہے؟۔

(۳۰) ورقہ کا باوجود نصرانی ہونے کے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کی طرف ناموس کی تنزیل بیان کرنا کس لیے ہوا؟۔

(۳۱) حضور ﷺ کو اپنے مکہ سے اخراج پر استعجاب کیوں ہوا؟۔

(۳۲) فترتِ وحی پر آپ کو اضطراب کیوں ہوا؟۔

(۳۳) زمانہ فترت وحی کتنی مدت تک رہا؟۔

(۳۴) حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصل صورت میں آپ ﷺ کے سامنے کتنی مرتبہ ظاہر ہوئے؟۔

(۳۵) فترتِ وحی پر آپ بار بار آسمان کی طرف کیوں دیکھتے تھے؟۔

(۳۶) آپ نزولِ وحی پر کیوں مرعوب ہوئے؟۔

(۳۷) رجز سے کیا مراد ہے؟۔

(۳۸) فترتِ وحی کے بعد کثرت سے اور متواتر وحی کا نزول کیوں ہوا؟ اور آپ ﷺ پر مجموعی طور سے وحی کا کتنی مرتبہ نزول ہوا؟۔

(۳۹) متابعت کسے کہتے ہیں اور اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اور متابعت سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟۔

(۴۰) اس حدیث کو ترجمۃ الباب سے کیا مناسبت ہے؟۔

ان چالیس مباحث کی تفصیل زندگی بخیر رہی تو ان شاء اللہ تعالیٰ پھر عرض کی جائے گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

الدرس الرابع عشر

تیسری حدیث پہلے درس میں ایک طالب علم پوری پڑھ چکے تھے، اس لیے آج کے درس میں طویل حدیث کے شروع کا کچھ حصہ پڑھا، پھر حضرت والا قدس سرہ نے اس طرح درس شروع فرمایا:

یہ تیسری حدیث ہے بداء ت وحی کے باب کے تحت، اس حدیث میں چالیس بحثیں شمار کرائی تھیں، اب ہر ایک کی تفصیل عرض کی جاتی ہے۔

پہلی بحث : حدیث مذکور کا قابل حجت واستدلال ہونا

پہلی بحث یہ تھی کہ اس حدیث کی راوی حضرت عائشۃ رضی اللہ تعالی عنہا ہیں، بداء ت وحی کی کیفیت بیان فرمارہی ہیں، حالاں کہ بداء ت وحی مکہ میں ہوئی تھی اور یہ اس وقت موجود نہ تھیں، معلوم ہوا کہ یہ حدیث مرفوع نہیں مرسل ہے، حالاں کہ امام بخاریؒ نے التزام فرمایا ہے کہ اپنی اس صحیح بخاری میں وہ مرفوع احادیث ہی لائیں گے تو اس حدیث کو خلاف التزام مرسل کیوں لائے ؟۔

نیز مرسل حدیث تو محدثین کے یہاں حجت نہیں، اس سے کوئی چیز ثابت نہیں کی جاتی تو یہاں کیفیت نزول وحی اس سے ثابت کرنا کس طرح درست ہوگا؟۔

اس کے دو جواب ہیں :اول یہ کہ احادیث مراسیل کی دو قسمیں ہیں: ایک مرسلِ صحابی، دوسرے مرسلِ تابعی، جو احادیث مراسیل حجت نہیں، وہ مراسیل تابعی ہیں اور صحابی کی مراسیل حجت ہوتی ہیں (۱) ، یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا راوی حدیث ہیں اور وہ صحابیہ ہیں، پس ان کی روایت بالکل مقبول ومعتبر ہے۔

(۱) قال النووي :هذا الحديث من مراسيل الصحابة فإن عائشة لم تدرك هذه القضية، فتكون سمعتها من النبي - ﷺ - أو من صحابي، ومرسل الصحابي حجة عند جميع العلماء. (مرقاة المفاتيح، ۹/ ۳۷۲۷)

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم مانتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا بوقت نزولِ وحی موجود نہ تھیں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے حضورا کرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں سنا، اور گفتگو ارسال وعدم ارسال میں ہے، نہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے عند نزولِ وحی وجود وعدمِ وجود میں، پس صحبت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرینۂ قویہ ہے کہ ضرور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن کر ہی بیان فرمایا ، اس لیے یہ روایت حکماً مرفوع ہے، حاصل یہ کہ حدیث میں صورۃً ارسال ہے اور معنیً رفع ہے، اس لیے روایت مرسل محض نہیں رہی ، پس عدم حجیت کا اشکال باقی نہیں رہا(١) ، یہ پہلی بحث ہوئی۔

دوسری بحث نبی کے خواب کا وحی ہونا

دوسری بحث یہ ہے کہ رویائے صالحہ کا سلسلہ کیوں جاری فرمایا گیا، اور رویائے صالحہ سے آغازِ وحی اور بداءتِ وحی کس طرح ثابت ہوا؟ ۔

یا یوں کہئے کہ قبل نبوت چھے ماہ تک خوابات کیوں پیش آتے رہے؟ حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ رویائے صالحہ کے تسلسل کا معاملہ کیوں فرمایا؟ اور ان کو من الوحی کیوں فرمایا؟ یہ بحث بہت غور سے سننے کی ہے، معمولی نہ خیال کی جائے ، نہایت ہی اہم بحث ہے، اس کے بیان کے لیے چند مقدمات کی ضرورت ہے اور وہ پانچ مقدمات ہیں۔

پانچ اصول یا تمہیدی مقدمات

اول تخلیق انسان اور حصول کمال کا فطری جذبہ

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ انسان اس عالم میں حصولِ کمال کے لیے بھیجا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر طبیعت میں فطری طور پر یہ جذبہ موجود ہوتا ہے، خواہ وہ کسی بھی کام

(١) عمدۃ القاری، ١/٩٦، ٩٥.

اور کسی بھی حال میں ہو، یہی چاہتا ہے کہ میں اس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جاؤں، ہر ذی فن کمال کا متمنی ہوتا ہے، زارع زراعت میں ترقی اور کمال تک پہنچنا چاہتا ہے، تاجر اپنی تجارت میں ترقی اور کمال کا ساعی ہوتا ہے، صنعتی وحرفتی شخص اپنی صنعت وحرفت میں عروج وکمال کا کوشاں ہوتا ہے، حتیٰ کہ چاند تک پہنچنے کی کوشش میں ایک سے ایک تیز رفتار گویا برق رفتار آلہ کا تیار کرنا اور بار بار ناکامی کے باوجود سعی جاری رکھنا، حصولِ عروج وکمال سے ملول ہو کر نہ بیٹھ جانا بلکہ اپنی سائنس میں عقل وفہم سے ہر بات کے سلجھانے اور زیادہ سے زیادہ عقل کی رسائی اور غور وفکر کی گہرائی میں پہنچنا چاہتا ہے، طبیب فن طب میں سب سے آگے بڑھنا اور اعلیٰ درجہ پہنچنا چاہتا ہے۔

دوسرا مقدمہ کمال حصول شئے کی شرط جمع شرائط رفع موانع ہے

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ کسی چیز کو بدرجہ کمال حاصل کرنے کے لیے دو چیزیں لازم وضروری ہوتی ہیں: ایک وجود شرائط، دوسرے رفع موانع، بدون اس کے درجۂ کمال کا حصول ناممکن ہوتا ہے۔

آپ حضرات بھی کمال علمی کے طالب ہیں، سو جب تک آپ موانع حصول علم میں رہیں گے، اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیابی نہ پاسکیں گے، اور سب سے بڑا مانع وہ اختلاط ہے، یعنی غیر ضروری تعلقات، اس کے ہوتے ہوئے علم صحیح طور سے حاصل نہیں ہوسکتا، یہ جملہ معترضہ تھا جو میرے نزدیک ضروری ہے، چوں کہ طبیعت میں طلبہ کے ساتھ محبت وشفقت ہے، اس لیے جہاں ذرا موقعہ دیکھتا ہوں، اذہان متوجہ کرنے کے لیے ضروری بات عرض کردیتا ہوں جس سے

سلیم الطبع کو احساس ہوجاتا ہے اور وہ صحیح کوشش میں لگ جاتا ہے، تو حصولِ شئ بدرجۂ کمال ارتفاعِ موانع اور تحققِ شرائط پر موقوف ہوتا ہے۔

تیسرا مقدمہ: تحصیل کمال کے لیے مناسبات ومتعلقات کا ہونا ضروری ہے

تیسرا مقدمہ کسی شئ کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے مناسبات کا اختیار کرانا بھی ضروری ہے، قاعدہ عقلیہ مسلمہ ہے: **الشئ اذاثبت ثبت بلوازمه ومتعلقاته** (۱)۔

چوتھا مقدمہ: حصول فیض کے لیے مفیض سے اتصال وربط کا ہونا ضروری ہے

چوتھا مقدمہ یہ کہ جس سے فیض حاصل کرنا ہوتا ہے، اس سے اتصال ضروری ہوتا ہے اور حصول اتصال کے لیے اس کے مقابل اور ضد سے انقطاع ضروری ہوتا ہے، **بدون انقطاع عن الضد** اتصال حاصل نہیں ہوسکتا۔

پانچواں مقدمہ: حصول کمال کے لیے تدریج کا ہونا ضروری ہے

پانچواں مقدمہ یہ ہے کہ حصول کمال کے لیے تدریج وترتیب بھی لازم اور ضروری ہوتی ہے (۱)، چنانچہ واقعہ اور مشاہدہ ہے کہ جس چیز کا وجود دفعی اور فوری

(۱) أحسن الحواشي على أصول الشاشي، ص ۱۲۱، ط: دار الكتب العلمية، بيروت.

(۲) قلت وهو مقتضى الأمور التدريجية في الأمور الدينية والدنيوية. (مرقاة المفاتيح، ۹/ ۳۷۲۸)

ہوتا ہے، اس میں کمال نہیں ہوتا، جیسا کہ فی زمانناڈاکٹری علاج میں فوری فائدہ تو ہوجاتا ہے مگر مرض کا استیصال نہیں ہوتا اور صحت میں کمال نہیں ہوتا، برخلاف طبی اور یونانی علاج کے، کہ اس میں اگرچہ نفع بہ تدریج اور رفتہ رفتہ ہوتا ہے اور حصولِ صحت میں دیر لگتی ہے، مگر مرض کا ازالہ اور استیصال ہوجاتا ہے، اور صحت بدرجۂ کمال حاصل ہوجاتی ہے۔

اسی طرح فی زماننا سائنسی جدید دریافت سے انڈوں میں تیزی کے ساتھ خاص مقدار حرارت پہنچادینے سے بچے تو جلدی نکل آتے ہیں، مگر ان میں ایک نقص رہ جاتا ہے کہ کمزور ہوتے ہیں۔

برخلاف مرغیوں کے نیچے تین ہفتوں تک رکھے رہنے کے کہ اس سے بہ تدریج حرارت پہنچ کر جو بچے نکلتے ہیں، ان میں وہ نقص نہیں رہتا، ان میں حرارت غریزیہ بدرجۂ کمال ہوتی ہے اور غذاءقوی اور لذیذ ہوتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ کمال کے لیے حصول تدریج ضروری ہوتا ہے، کمال تک پہنچنا بہ تدریج ہی ہوا کرتا ہے، کسی شئے کو بہ تدریج درجۂ کمال تک پہنچانا ہی تربیت ہے، پس بدون تربیت وتدریج کمال حاصل نہیں ہوسکتا۔

اب تو یہ چاہتے ہیں: بس پھونک ماردو، کچھ بھی نہ کرنا پڑے، جلدی سے نصاب پورا ہوجائے، چنانچہ میزان سے ہی طفرہ شروع کردیتے ہیں، کتابیں چھوڑ چھوڑ کر اگلی کتابوں میں شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں، کوئی کنز چھوڑ رہا ہے، کوئی شرح وقایہ چھوڑ رہا ہے، ہدایہ میں شریک ہونا چاہتا ہے اور معمولی معمولی اعذار کو آڑ بنارہا ہے، مثلاً کہتا ہے کہ ابّا نے یہی حکم فرمایا ہے۔

اسی لیے استعدادیں ناقص رہ جاتی ہیں، ان میں کمال پیدا نہیں ہوتا، چوں کہ کمال کے لیے تو مبادی ومقدمات کا اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے، تاکہ مبادی ومقدمات طے کرتے ہوئے ترتیب وتدریج کے ساتھ دل بڑھنے اور حوصلہ کھلنے

لگے، ورنہ میری اور آپ کی طرح قدم قدم پر استاذ وشاگرد دونوں کو پریشانی پیش آتی ہے، سخت دِقت ودشواری کا سامنا ہوتا ہے، پسینہ آجاتا ہے، چوں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ بنیں، عبارت دانی اور ترجمہ کا سلیقہ آجائے، ترکیب الفاظ کا فہم پیدا ہوجائے، ورنہ جب آگے پہنچیں گے تو یہ حال ہوگا کہ پڑھنے میں جی نہیں لگتا، جی گھبراگھبرا جاتا ہے، اکتاہٹ ہورہی ہے، کیوں کہ مبادی ومقدمات میں خامی رہ گئی تو پھر دل چسپی کیسے ہو، برخلاف اس کے کہ جس کی بنیاد اچھی ہوتی ہے، وہ پابندیٔ حاضری اور مطالعہ وتکرار اور حوصلہ کے ساتھ سب کام کرتا ہے اور ٹھیک انجام دیتا ہے، یہ جملہ معترضہ مثال کے طور پر پیش کیا۔

ان تمہیدی مقدمات خمسہ کے بعد اب غور فرمائیے کہ حق تعالیٰ آپ ﷺ کو ایک کمال پر فائز فرمانا چاہتے ہیں، اور کمال بھی کیسا؟ کمالِ انتہائی، یعنی نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں، اور نبوت بھی وہ جو انتہائی درجہ نبوت کا ہے، انسانی کمالات میں کوئی کمال اس سے بڑھ کر تو کیا برابر بھی نہیں ہوسکتا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے: ایک جزو مادی ہے اور وہ جسم عنصری ہے، اور ایک مجرد ہے، وہ روح ہے تو جسم وروح سے مرکب کا نام انسان ہے۔

اس لیے لازماً انسانی کمالات دو قسم کے ہوتے ہیں: جسمانی اور مادی کمالات اور غیر مادی یعنی روحانی کمالات، اور یہ بات بدیہی الثبوت ہے کہ جسمانی کمالات سے روحانی کمالات اعلیٰ اور بلندترین ہیں اور روحانی کمالات میں سب سے بلند اور سب سے اعلیٰ کمال نبوت یعنی نبی ہونا ہے اور اس میں بھی خاتمیت نبوت ہے، تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ نبوت ایسا کمال ہے جو نہایت ہی اعلیٰ اور بلند ہے، انسانیت کا انتہائی عروج ہے، اس سے حق تعالیٰ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرف فرمانا چاہتے ہیں۔

یہ تو حکم مقدمہ اولیٰ ہوا کہ آں حضرت ﷺ کو کمالِ انتہائی سے مشرف ہونا یعنی صاحب نبوت اور صاحب وحی ہونا ہے۔

اور وحی ایک غیر مادی اور روحانی چیز ہے جس تک پہنچنے کے لیے وسائط اور مقدمات سے گذرنا بہ حکم مقدمہ ثانیہ ضروری ہے، اس لیے عالمِ مجردات وروحانیت سے اتصال اور عالمِ مادیات سے انقطاع بہ حکم مقدمہٗ ثالثہ ورابعہ ناگزیر ہے، پھر اس اتصال وانقطاع میں ترتیب وتدریج ہونا امر لابدی ہے؛ تا کہ رفتہ رفتہ اس عالم سے مناسبت اور اتصال ہوجائے جو مقتضیٰ ہے مقدمہٗ خامسہ کا، اس لیے اولاً منامات وخوابات میں رویائے صادقہ کا سلسلہ شروع فرمایا، چوں کہ ایسی حالت جس میں مادیات سے انقطاع اور مجردات سے اتصال ہو، وہ نوم ہی ہے، چنانچہ مثل مشہور ہے کہ سویا مویا برابر ہوتے ہیں، حدیث میں بھی النَّوْمُ أَخُو الْمَوْتِ (۱) فرمایا ہے۔ چوں کہ نیند اور موت دونوں حالتوں میں مادیات سے انقطاع ہوتا ہے اور عالم مجردات سے مناسبت واتصال ہوتا ہے، اس لیے نوم میں اس عالم کی سیر کرائی جانے لگی؛ تا کہ آپ ﷺ کو وہاں کی چیزوں سے ایک مناسبت ہوجائے اور بہ تدریج رفتہ رفتہ اجنبیت اور غیر مانوسیت دور ہوکر روحانیت اور غیبیات کے احمال واثقال کا تحمل ہو سکے۔

اب جب کہ حالت نوم میں مغیبات اور روحانیات سے آپ کا اتصال ہوگیا، وہاں آپ کے سامنے ایک چیز آ گئی اور صبح ہوتے ہی صاف طور سے نظر آ رہا ہے کہ جیسا دیکھا تھا، ویسا ہی ہو رہا ہے تو آپ کا جی خوش ہو رہا ہے کہ حالت نوم میں جو کچھ دیکھا، وہ غلط نہیں تھا، بالکل صحیح تھا، اسی کے مطابق ظہور ہو رہا ہے ، چوں کہ خواب میں جس عالم سے اتصال ہوتا ہے، وہ عالم مثال کہلاتا ہے،

(۱) المعجم الأوسط للطبرانی، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ رضی اللہ تعالی عنہما، مَنِ اسْمُهُ أَحْمَدُ، رقم الحدیث: ۹۱۹.

چوں کہ دنیا کی تمام چیزوں کی وہاں مثال موجود ہیں، اصل ترتیب یہ ہے کہ ہر چیز عالم حقیقت اور عالم امر سے عالم مثال میں آتی ہے، پھر اس کے بعد دنیا میں کسی شئ کا وجود ہوتا ہے۔

عالم امر، عالم مثال، عالم دنیا

اوّل درجہ عالم امر کا ہے، اسی کو عالم مجردات بھی کہتے ہیں، یہاں کی چیزوں میں مادہ اور صورت ومقدار بالکل نہیں ہوتی، صرف حقیقت محضہ ہوتی ہے، اسی لیے اس کو عالم حقیقت کہتے ہیں، غرض عالم مجردات، عالم حقیقت، عالم امر یہ تینوں نام ایک ہی عالم کے ہیں، بلکہ ایک چوتھا نام عالم غیب بھی اسی کا ہے، اس لیے کہ یہاں کی چیزوں کے مشاہدہ کی کوئی صورت ہی نہیں، اسی لیے یہ عالم مدارک انسان سے بالکل غائب ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ عالم مثال کا ہے، یہاں کی چیزوں میں مادہ تو نہیں ہوتا مگر طول عرض — جس کو مقدار کہتے ہیں وہ — ہوتی ہے، اس لیے یہاں کی چیزیں صورت پذیر ہوتی ہیں، جیسے آئینے میں، صورت مثالی، طول وعرض دکھتی ہے، اسی طرح یہاں کی چیزوں میں طول وعرض، پھیل پھیلاؤ تو ہوتا ہے، مگر مادہ نہیں ہوتا، اس لیے یہ عالم بین بین ہے کہ نہ مطلق غیب ہی ہے، نہ بالکل شہود بلکہ خاص خاص حالات اور خاص خاص طرق سے یہاں کی چیزیں مدرک ومعلوم ہو جاتی ہیں، مثلاً رویائے صادقہ، کشف وغیرہ سے۔

بہر حال! چوں کہ یہ عالم مادیات پر مشتمل نہیں ہوتا، اس لیے اس کو عالم مجردات سے بھی قرب ومناسبت ہے، اور طول وعرض اور اشکال وصور لیے ہوئے مقداریات پر مشتمل ہوتا ہے جیسا کہ مادیات میں یہ چیزیں ہوتی ہیں، اس لیے اس کو عالم مادیات، یعنی عالم دنیا وعالم شہود سے بھی قرب ومناسبت ہے، لہٰذا یہ ایک درمیانی چیز ہوئی، اسی لیے اس کا نام عالم مثال کے علاوہ عالمِ برزخ بھی ہے،

چوں کہ برزخ درمیانی ہی چیز کو کہتے ہیں۔

اس کے بعد تیسرے درجے میں عالم دنیا جو مادیات پر مشتمل ہے، اسی لیے عالم مادیات کہلاتا ہے، اور بوجہ مادی کثافت کے تمام اشیاء مشاہدۂ انسان میں آتی ہیں؛ اس لیے اس کو عالمِ شہود کہتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ کسی حکمت و مصلحت الٰہیہ سے عالم مثال میں صورتیں الگ اور عالم دنیا میں مادی اقتران سے کچھ فرق کے ساتھ الگ ہیں، مثلاً علم کی صورت عالم مثال میں دودھ کی ہے اور آفاتِ دنیا کی صورت وہاں سانپ کی ہے۔

لہٰذا اگر خواب میں دودھ دیکھے تو اس کی تعبیر علم ہوتی ہے اور اگر خواب میں پاخانہ دیکھے تو تعبیر ہوگی کہ دنیا حاصل ہوگی، معلوم ہوا کہ جو چیزیں یہاں ہیں، وہ وہاں بھی ہیں، صورتوں کا کچھ فرق ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ پہلے اُس عالم میں وجود ہوتا ہے اور اس کے بعد دنیا میں، اس لیے اس عالم میں آنے سے پہلے حالت منام میں حق تعالیٰ آپ کو امور غیبیہ دکھا رہے ہیں، اس کے بعد خواب میں دیکھا ہوا دنیا میں ظہور پذیر ہو رہا ہے، اس کے خلاف نہیں ہو رہا، تو آپ کی طبیعت کِھلتی اور کُھلتی اور حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے، اُدھر ذوق وشوق اور اس عالم کی طرف زیادہ سے زیادہ التفات ہوتا جا رہا ہے اور اس عالم مادیات سے نظر ہٹتی اور اٹھتی جا رہی ہے، انقطاع مادیات بدرجہ کمال ہو رہا ہے، اور ترقی فرمائی جا رہی ہے، تو ذات باری تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کمال تک پہنچانے کے لیے اس طرح مناسبات سے ابتدا فرمائی گویا کہ وحی جلی سے پہلے وحی حقی وحی معنوی یعنی رویائے صادقہ کا سلسلہ پیش فرمایا جو کہ مناسبات وحی جلی میں سے ہے بلکہ ایک قسم کی وحی ہی ہے اس لیے آغازِ وحی رویائے صادقہ سے ہونا ظاہر اور ثابت ہو گیا۔

یہ دوسری بحث تھی کہ رویائے صادقہ سے ابتدائے وحی کس طرح ہوئی اور کیوں ہوئی؟، اس کا جواب آپ کے سامنے آچکا کہ اس صورت سے رفع موانع

وتحقق شرائط اور اختیار مناسبات بہ انقطاع مادیات اور اتصال بہ عالم مجردات کے ساتھ تدریجاً کمال کو پہنچنا یعنی نبوت کا شرفِ صدور وظہور مقصود تھا، اس لیے رویائے صالحہ صادقہ سے ابتدا و بداءتِ وحی ہوئی، یہ بحث ختم ہوگئی، الحمدللہ تعالیٰ۔

رویائے صالحہ سے وحی کی ابتداء

اس بحث کے بعد تیسری بحث یہ ہے کہ رسول یا نبی پر نزول وحی بہ وصف نبوت ہوتا ہے بہ الفاظ دیگر یوں کہئے کہ وحی کا نزول نبی ہونے کے بعد ہوتا ہے اور رؤیائے صالحہ قبل از نبوت تھے، تو ان رویائے صالحہ سے آغاز وحی، بداءت وحی کس طرح مانی جائے؟۔

جواب یہ ہے کہ وجودِ نبوت تو آپ کے اندر ازل ہی سے تھا، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: **كُنتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّينِ** (۱)، ظہور نبوت اس عالم میں ہوا، گویا پہلے نبوت مخفی تھی؛ اس لیے ظہورِ نبوت سے پہلے رویائے صالحہ کی صورت میں وحی بھی خفی ہوتی رہی، پھر جب نبوت کا ظہور ہوا تو وحی بھی جلی طور پر آنا شروع ہوئی، اس لیے رویائے صالحہ سے آغازِ وحی میں کوئی خفا اور اشکال نہیں۔

---

(۱) تفسیر کی کتابوں میں یہ قول بصورتِ حدیث بہ کثرت موجود ہے، تفسیر رازی (سورۂ بقرہ ۲۵۳:) بحر محیط (سورۂ انعام ۱۵۳:) وغیرہ متعدد تفاسیر میں یہ قول بلا سند بہ صورتِ حدیث موجود ہے لیکن اس پر محدثین نے کلام کیا ہے، ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: وأما ما يدور في الألسنة بلفظ: (» كنت نبيا وآدم بين الماء والطين «) فقال السخاوي: لم أقف عليه بهذا اللفظ، فضلا عن زيادة " »وكنت نبيا ولا ماء ولا طين« ، وقال الحافظ ابن حجر في بعض أجوبته: إن الزيادة ضعيفة وما قبلها قوي. وقال الزركشي: لا أصل له بهذا اللفظ، ولكن في الترمذي » :متى كنت نبيا؟ قال: (وآدم بين الروح والجسد«). قال السيوطي: وزاد العوام ولا آدم ولا ماء ولا طين، ولا أصل له أيضا. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح ۳۶۸۴/۹) جیسا کہ ملاعلی قاریؒ نے اپنے کلام میں اشارہ فرمایا ہے کہ حدیث ازروئے معنی صحیح اور قوی ہے، چنانچہ ایک حدیث انھوں نے ذکر کی ہے: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ مَتَى وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ؟ قَالَ: وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالجَسَدِ۔ (سنن الترمذی، بَابُ فِي فَضْلِ النَّبِيِّ ﷺ، رقم الحديث: ۳۶۰۹) اور اس جیسی دوسری احادیث سے اس کی تائید ضرور ہوتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رویائے صالحہ مومنین کے لیے چھیالیسواں حصہ نبوت کا ہوتا ہے (۱) مگر مومن ہونا شرط ہے یعنی صرف کلمہ پڑھ کر رہ جانا کافی نہیں بلکہ مومن متقی پرہیزگار ہو، جس کا خلاصہ صدقِ مقال واکل حلال ہے، جس مومن میں یہ شرط ہے، وہ مومنِ صحیح معنیٰ میں مومن ہے، ایمان کے ثمرات اور ایمان کے برکات کے ظہور کا ایسا ہی شخص محل ہوتا ہے، قرآن وحدیث میں بیان شدہ فضائل ایسے ہی مومن کے لیے ہیں، پس ایسے مومن کے خواب سچے ہوتے ہیں، الا ماشاء اللہ۔

ایسے مومن کے علاوہ اگر اور کسی شخص کا خواب کبھی سچا ہو جائے تو یہ نادر اور اتفاقی بات ہوگی، اس میں یعنی اتفاقاً ونادرً اخواب کے سچا ہونے میں مسلمان کی بھی خصوصیت نہیں بلکہ کافر کا بھی خواب کبھی سچا ہوسکتا ہے، یہ صرف اتفاقی صدور ہے جو کسی کمال اور خصوصی امتیاز کی علامت نہیں ہوسکتا، جیسے ایک دفعہ ایک سفر میں بعض احباب کے اصرار پر ہم نے جو بندوق چلائی تو کئی پرندے گر گئے، حالاں کہ نشانہ اور مشق نہیں تھی بلکہ اس سے قبل کبھی چلائی بھی نہ تھی پس یہ محض اتفاقی صدور تھا۔

آگے چوتھی بحث سے لے کر بہت سی بحثیں ہیں، اب ان کا بیان جب کہ آپ صبح سے پڑھتے آرہے ہیں اکتاہٹ اور تھکن ہوگئی اچھا نہیں، جب تک آپ کو دلچسپی رہتی ہے میرا بھی جی چلتا رہتا ہے ورنہ طبیعت رُک جاتی ہے، اس لیے آج کا بیان یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

ہمیشہ اتباع سنت مدنظر ہو، اپنی طلب علم میں درجۂ کمال علم کے لیے موانع کو رفع کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے، جائیے، خدا حافظ۔

---

(۱) صحیح البخاری، ۱۰۳۵/۲، عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ تعالی عنہ، کتاب التعبیر، بَابٌ :الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ، رقم الحديث : ۶۹۸۷.

الدرس الخامس عشر

ثالث حدیث پاک کی عبارت کا کچھ حصہ ایک طالب علم نے قرآت کیا، اس کے بعد حسب ذیل بیان شروع فرمایا:

وحی کی تیسری حدیث میں چالیس بحثیں شمار کرائی تھیں، جن میں سے تین بحثوں کا بیان کل ہو چکا تھا، آج چوتھی بحث ہے، جہاں تک حق تعالیٰ کو منظور ہوگا، عرض کیا جائے گا، غور اور توجہ سے سنئے۔

رویائے صالحہ کی مدت

چوتھی بحث یہ تھی :رویائے صالحہ کتنے عرصہ تک رہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حافظ حدیث علامہ بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ رویائے صالحہ کا سلسلہ چھ ماہ تک رہا(۱)۔

رویائے صالحہ کا وحی سے چھیالیسواں حصہ ہونا

پانچویں بحث رویائے صالحہ وحی کا کون سا حصہ ہیں؟ سوکل کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ رویائے صالحہ وحی کا چھیالیسواں حصہ ہوتے ہیں اور راز اس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رویائے صالحہ کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چھ ماہ تک رہا، اور وحی کا تواتر وتسلسل ۲۳ ر سال تک رہا تو مدت رؤیا کو مدت وحی کے ساتھ چھیالیسویں حصہ ہی کی نسبت رہی، اس لیے رویائے صالحہ وحی کا چھیالیسواں حصہ ہوا۔

رویاء کو فلق صبح کے ساتھ تشبیہ کی وجہ

چھٹی بحث یہ تھی رویائے صالحہ کو فلق صبح کے ساتھ کیوں تشبیہ دی؟ اس کی

(۱) وحكى البيهقي أن مدة الرؤيا كانت ستة أشهر .(عمدالقاری : ۱/ ۶۲)

وجہ یہ تھی کہ یہ بتلانا تھا کہ آپ ﷺ کے خوابات ایسے نہیں ہوتے تھے، جن کوخوابات پریشاں، الجھے ہوئے خیالات، اضغاث احلام کہا جاتا ہے کہ ان کی کچھ تعبیر نہیں ہوتی بلکہ آپ ﷺ کے خوابات نہایت واضح، صاف اور سچے ہوتے تھے، جیسے صبح کا ظہور، تڑکے کا نو(۱)۔

دوسرے اس تشبیہ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح رات کی تاریکی جو عالم پر چھائی ہوئی ہوتی ہے، اور عالم کو ظلمتوں سے گھیر لیتی ہے، فلق صبح اس کے کوچ کا اعلان کرتی ہے، اسی طرح غیر حسّی مختلف ظلمتیں جو سطح عالم پر چھائی ہوئی تھیں، وہ آپ ﷺ کی ذات پاک سے دور ہونے والی تھیں اور نور کا ظہور ہونے والا تھا، اس لیے خوابی ومنامی وحی کو فلق صبح سے تعبیر کیا۔

تیسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جس طرح فلق صبح (نور سحر) سے دل کو سرور ہوتا ہے، اسی طرح ان خوابات سے بھی آپ ﷺ کو سرور ہوتا تھا، قلب مبارک ان خوابات سے فرحت ومسرت اور شوق ودلچسپی محسوس کرتا تھا۔

چوتھی وجہ : جس طرح فلق صبح سے حسّی نور کا ظہور ہوتا ہے، اسی طرح انوارِ نبوت کا ان خوابات سے سلسلۂ ظہور وابستہ تھا، اسی لیے ان خوابات کو آغاز وحی اور بداءت وحی فرمایا گیا(۲)۔

خلوت کا بیان

ساتویں بحث یہ ہے کہ خلوت کو آپ کے لیے کیوں محبوب بنایا گیا؟ کس

(۱) قال المهلب :هی تباشیر النبوة و کیفیة بدئها، لأنه لم یقع فیها ضغث، فیتساوی مع الناس فی ذلك، بل خص بصدقها كلها. (شرح صحیح البخاری لابن بطال : ۱/۳٦)

(۲) و إنما عبرت عن صدق الرؤیا بفلق الصبح ولم تعبر بغیره :لأن شمس النبوة كان مبادئ أنوارها الرؤیا إلی أن تم نورها وبرهانها، وظهرت أشعتها. (شرح البخاری، للسفیری، ۱/۱۸۹)

لیے خلوت گزینی کرائی گئی؟ سو اب تک کے بیان سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ خوابات کے ذریعہ عالم بالا سے مناسبت اور ایک خصوصی التفات پیدا فرمایا گیا تھا، چوں کہ حالت نوم اور خواب میں عالم سفلیات سے یکسوئی اور علیحدگی اور انقطاع ہوتا ہے اور عالم علویات کی طرف روح کا ایک خاص اتصال ہوتا ہے، اس لیے وہاں کی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں، اور روح میں ایک خاص الخاص کیف پیدا ہوتا ہے، اسی سے یہ بات معلوم ومفہوم ہورہی ہے کہ خلوت گزینی کوعلویات سے مناسبت پیدا ہونے اور روح میں بالیدگی اور ترقی حاصل ہونے میں دخل عظیم ہے، پس حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کے قلب مبارک میں اس حقیقت کوظاہر فرمادیا(۱)۔

نیز کل کے بیان میں عرض کیا گیا تھا کہ ظہورنبوت تدریجاً فرمانا تھا، اس لیے اس تدریج کے پیش نظر اول حالت نوم کے ذریعہ انقطاع ویکسوئی عطا فرمائی، اب اس سے ترقی کرکے یہ ترقی کا دوسرا قدم ہے کہ بیداری میں بھی خلوت اور یکسوئی اختیار کرائی جارہی ہے، اور انقطاع عن الخلق قلباً وروحاً کے ذریعہ اتصال عالم آخرت کرایا جارہا ہے۔

غارحراء کا خلوت کے لیے انتخاب اوراس کی چار وجوہ

آٹھویں بحث: خلوت کے لیے غارِحراء کیوں منتخب ہوا؟ اور غارِحراء کہاں ہے؟ سو اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے جدامجد حضرت عبدالمطلب نے اس جگہ خلوت گزینی فرمائی تھی تو ایک خاندانی وآبائی تعلق اور مناسبت اس انتخاب کا باعث ہو(۲)۔

---

(۱) عمدة القاری، ۱/۶۰.

(۲)فتح الباری، ۱۲ ص ۴۰۹.

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں انبیائے سابقین نے بھی خلوت فرمائی تھی، یہ ایک روحانی مناسبت بھی باعث انتخاب ہوئی۔

تیسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہاں بیت اللہ شریف پر بھی نظر پڑتی اور اس کی زیارت ہوتی ہے جو کہ بجائے خود ایک مستقل عبادت ہے، اس طرح تین عبادتیں جمع ہوجاتی ہیں، خلوت گزینی، اسمائے الٰہیہ کا ورد، اور بیت اللہ شریف کی زیارت(۱)۔

چوتھی وجہ غار حراء کے انتخاب للخوت کی یہ ہے کہ غار حراء مکہ سے صرف تین میل کے فاصلہ پر ہے کوئی بعید جگہ نہیں کہ جہاں کوئی پہنچنا چاہے تو نہ پہنچ سکے، اور اہل مکہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ آپؐ غار حراء میں تخلیہ فرماتے ہیں، اور یہ بھی معلوم تھا کہ اور کوئی شخص وہاں آپ ﷺ کے پاس نہیں آتا، پس جب کہ آپ ﷺ کہیں باہر دور و دراز جگہ بھی تشریف نہیں لے جاتے تھے، اِدھر کوئی اور انسان بھی آپ ﷺ تک رسائی نہیں رکھتا تھا تو اب آگے چل کر جو آپ نے کلام الٰہی اور پیغام ربانی پیش فرمایا ہے، اس پر اس شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ یوں کہا جاسکے کہ (نعوذ باللہ) آپ یہ بات کسی سے سیکھ کر یا سن کر کہہ رہے ہیں، یہ اکتسابی چیز ہے، فلاں سے سیکھ کر ہمیں سنا رہے ہیں، کوئی غیبی اور وہبی آسمانی چیز اور نبوت نہیں، ان حالات میں غارِ حراء میں خلوت گزینی کرانے سے اس شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہوسکتی۔

بخلاف اس کے کہ اگر خلوت کہیں دور دراز جا کر اختیا فرماتے اور پھر واپس تشریف لا کر آپؐ یہ کلام ربانی، وحی الٰہی کا، نبوت کا اظہار فرماتے، تو اہلِ مکہ فوراً کہ دیتے کہ کہیں سے سیکھ کر آئے ہیں، اور کسی اہل علم سے حاصل کر کے ہمیں بتلا رہے ہیں، اس بدگمانی سے بچانے کے لئے قریب ہی جگہ یعنی غار حراء میں

(۱) فتح الباری، ۱۲ ص ۴۰۹.۲

خلوت نشینی من جانب اللہ تعالیٰ کرائی گئی۔

جب آپ حضرات نے خلوت کے لیے انتخاب کے وجوہ سن لیے تو اب خلوت کی افادیت وعظمت کے بارے میں سنئے۔

خلوت کی اہمیت وافادیت

غور فرمائیے، حدیث شریف کے الفاظ خلوت کی اہمیت، عظمت اور افادیت پر صاف دلالت کرر ہے ہیں، چوں کہ جو چیز سرکار دو عالم ﷺ کے لیے محبوب بنائی گئی، ظاہر ہے کہ وہ معمولی چیز نہیں ہوسکتی بلکہ نہایت اہم واعظم ہوگی، اس کے فوائد اور اس کے ثمرات وبرکات کا کوئی کیا بیان کرسکتا ہے۔

تاہم **مالایدرك كله لايترك كله** کے پیش نظر مختصر بیان پر اکتفاء کیا جاتا ہے، سو سنئے اور غور سے سنئے! خلوت سے قلب کی ظلمت دور ہوتی ہے، قلب میں صفائی آتی ہے، قلب میں آئینہ کی صفت پیدا ہوتی ہے، انوارِ الٰہیہ کا محل بننے کی صلاحیت آتی ہے، حقیقت شناسی، حقیقت بینی کی قوت بہ درجہ کاملہ پیدا ہوتی ہے۔

خلوت انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی شان اور اولیاء کرام کی ولایت کی دلیل اور نشان ہے، ذریعہ ترقی وعروج روحانی ہے۔

خلوت ہی سے کمال ایمان اور صحیح معنیٰ میں انسان ہوتا ہے، اس لیے خلوت خود ایک عبادت ہے، بلکہ عبادت کی جڑ اور عبادت کا اعلیٰ فرد ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ خلوت بڑی عبادت ہے، خلوت ایسی چیز ہے جس سے ابواب ہدایت مفتوح اور کشادہ ہوتے ہیں۔ بہرحال! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خلوت سے انسان کو کمال عبادت اور دین کی درستی میں مدد ملتی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ جب لوگوں سے علیحدہ ہوکر گوشہ نشین ہوگئے اور خلوت میں رہنے لگے اسی وقت آپ ﷺ کو نزول وحی اور اعطاء نبوت کی خبر عظیم سے سرفراز فرمایا گیا۔

پس اس طریق نبوت یعنی خلوت کو جو اختیار کرے گا، مقسوم کے مطابق اس

کو وراثت نبوت یعنی مقام ولایت سے نوازا جائے گا، کیوں کہ نبی کے اندر دوشان ہوتی ہیں، یا یوں کہئے کہ نبی دوفضیلت سے نوازا جاتا ہے: ایک شانِ نبوت دوسرے شانِ ولایت، وہ جو ابن عربی نے فرمایا ہے: **الْوِلَايَةُ أَفْضَلُ مِنَ النُّبُوَّةِ** (۱) اس سے یہی ولایت مراد ہے جو نبی میں نبوت کے ساتھ ہوتی ہے، اب نبوت تو ختم ہوگئی، ولایت میں نیابت باقی ہے، پس مقام ولایت سے نوازا جائے گا، خلوت کے ان ثمرات وبرکات سے خلوت کی شانِ عظمت اور اس کی وسعت افادیت آپ کو بہ خوبی واضح ہوگئی۔

اب خلوت کے لغوی اور شرعی معنیٰ سنئے، حدیث میں الخلآء کا لفظ ہے، سو یہ خلوت کے ہم معنیٰ ہے، یہ دونوں مرادف الفاظ ہیں، ان کے لغوی معنیٰ ہیں اکیلا رہنا، اور اصطلاح شریعت میں مطلقاً اکیلا رہنا خلوت نہیں کہلاتا، بلکہ جسمانی خلوت کے ساتھ قلبی خلوت بھی ہو، اور قلبی خلوت بھی مطلقاً نہیں بلکہ غیر ضروری اور فضول اور مضر تعلقات اور خیالات، وساوس وخطرات سے دل خالی ہو، اور خدا کے ساتھ دل لگانا متوجہ کرنا ہو، شریعت میں خلوت کی یہی حقیقت ہے، پس اکیلے رہنے میں اگر دل میں طرح طرح کے خیالات، وساوس وخطرات آنے لگیں تو حقیقی خلوت منعدم ہوگی، خلوت کی صرف صورت بے حقیقت رہ جائے گی جس پر حقیقی خلوت کے خواص وآثار، فوائد وثمرات جو عرض کیے گئے، وہ حاصل نہ ہوں گے، جیسا کہ عارف شیرازیؒ نے فرمایا ہے۔ ؎

چو ہر ساعت از تو بہ جائے رود دل	بہ تنہائی اندر صفائے نہ بینی
ورت مال وجاہ است وزرع وتجارت	چو دل باخدا ایست خلوت نشینی (۲)

اب حدیث کے جملہ **ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ** پر غور فرمائیے، ترجمہ سنئے!

---

(۱) القول النبی عن ترجمة ابن العربی ص ۲۱۵/۔

(۲) جب ہر وقت تیرا دل ہر جگہ بھٹکتا ہو، تو خلوت میں بھی تو رونق نہ دیکھے گا اور تیرے پاس مال ومرتبہ اور کھیتی وتجارت ہو، جب کہ تیرا دل خدا سے لگا ہو، تب (بھی) تو خلوت نشین ہے۔

آپ ﷺ کی طرف خلوت وتنہائی محبوب و پسندیدہ بنادی گئی، اکیلا رہنا، یکسو رہنا آپ کو محبوب ہو گیا، آپ ؐ کو من جانب اللہ خلوت سے محبت، دل چسپی اور طبعی لگاؤ عطا کر دیا گیا۔

ان الفاظ اور اندازِ کلام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ خلوت باعث ترقی ھدایت ہے، جیسا کہ **ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الخَلاءَ**، خلوت کے ذکرو بیان کے بعد "**حَتَّى جَاءَهُ الحَقُّ**" سے ظاہر ہے، بلکہ خلوت خود نفس ہدایت کا بھی سبب ہے، جیسا کہ علمائے ربانیین اور عرفائے محققین جو کہ حقیقت شناسانِ کلامِ خدا وکلامِ رسولِ خدا ہوتے ہیں، ان کے کلام میں اس کی تصریح ملتی ہے۔

چنانچہ ہمارے حضرت (تھانویؒ) جو کہ مجدد وقت اور محقق کامل واکمل تھے، فرماتے تھے کہ اگر کسی سے کچھ بھی کام نہ ہو سکے تو کم از کم ایک وقت روزانہ کے لیے ایسا مقرر کرلے جس میں سب سے الگ ہو کر خاموش بیٹھا رہا کرے، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بھی اس کو راستے پر لگادے گا۔

معلوم ہوا کہ خلوت ذریعۂ ھدایت اور مقدمۂ ولایت ہے، اور یہ قاعدہ عقلیہ مسلمہ ہے کہ **مقدمة الشئ فی حکم الشئ**(١)، اس لیے خلوت کا محبوب ہوجانا گویا من جانب اللہ تعالیٰ ہدایت عطا ہوجانا ہے، تو ثابت ہوا کہ یہ دولت خلوت آپ کو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی جیسا کہ حُبِّبَ صیغۂ مجہول سے ظاہر ہے، اور جب یہ ہے تو اس سے بات نکل آئی کہ ہدایت ایک وہبی چیز ہے، کسبی نہیں، غیر اختیاری ہے، اختیاری چیز نہیں، اسی طرح اور نصوص سے بھی ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کا معاملہ، بندہ کا اختیاری نہیں بلکہ خدا کے قبضے کی چیز ہے، ارشاد ربانی ہے: ﴿يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط﴾ [النور: ٣٥]،

(١) لأن مقدمة الشيء قد تسمى باسم ذلك الشيء. (العدة في أصول الفقه للقاضي أبي يعلى، ٨٠٩/٣، حَيْثُ أَلْحَقَ مُقَدِّمَةَ الشَّيْءِ بِالشَّيْءِ. (المستصفى للغزالی، ٢٩٣/١)

دوسری جگہ ہے: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ ﴾ [القصص: ۵۶] اور ایک جگہ فرمایا: ﴿ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ ﴾ [إبراهیم: ۴]۔

ان نصوص کے استحضار سے جیسے اصحاب رشد و ہدایت کے لیے اپنے پر نظر کرنے اور اپنا کمال سمجھنے، غرض! عجب وغرور، فخر وتکبر وغیرہ تمام باطنی خرابیوں کی جڑ کٹ جاتی ہے، اسی طرح گنہگاروں، ہمت کمزور رکھنے والوں کے لیے دوسری نصوص مایوسی سے مانع ہیں، مثلاً: ﴿ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ ﴾ [الزمر: ۵۳]، دوسری جگہ ﴿ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ ﴾ [یوسف]، ایک جگہ فرمایا: ﴿ ا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ ﴾ [الإسراء]

ان نصوص میں غور کرنے اور حقیقت سمجھنے سے بھی ہمت بلند ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ بات جاننا اور یقین کرنا ضروری ہے کہ جو شخص طلب صادق اور کوشش اختیار کرتا ہے، اس کو حق تعالیٰ ہدایت عطا فرما ہی دیتے ہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ ﴾ [العنکبوت: ۶۹] جو لوگ ہمارے بارے میں جد و جہد کوشش ومحنت، بہ مخالفت دشمن نفس کرتے ہیں ہم انھیں ضرور ہدایت عطا فرماتے ہیں۔

حصولِ ولایت

اسی کا دوسرا نام ولایت خاصہ ہے تو گویا ولایت بطور ثمرہ ونتیجہ موہوب ہے، اور اس پر اگرچہ انسان کا پورا اختیار نہیں لیکن اس کے اسباب پر ضرور اختیار ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ ﴾ [الإسراء] ان اسباب کے اختیار پر

مسبب یعنی ہدایت کا ترتب حق تعالیٰ فرما دیتے ہیں، اور ہدایت ہی کیا، تمام اسبابِ دنیا کی یہی بات ہے کہ اسباب پر تو انسان کا کچھ اختیار ہوتا ہے مگر مسببات پر بالکل قابو و اختیار نہیں ہوتا، وہ وہبی، موہوب من اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں، مثلاً زراعت کرنا کہ کھیت میں بیج ڈال دینا تو انسان کے اختیار میں ہے مگر بیج کا بار آور ہونا، یہ کسی انسان کے اختیار میں نہیں۔ لیکن عادتُ اللہ تعالیٰ یہ ہے کہ جو کوئی باقاعدہ زراعت کرتا ہے، اس کو ثمرہ مل ہی جاتا ہے، کھیت بار آور ہو ہی جاتا ہے۔

اس لیے حدیث شریف کے اس جملہ **ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الخَلاءُ** سے کوئی اشکال نہیں، کیوں کہ اگر خلوت و ہدایت کی توفیق من جانب اللہ تعالیٰ ہونے کے سبب یہ چیزیں عطائے ربانی اور انعاماتِ الٰہیہ سے ہیں تو یہاں عالمِ اسباب میں اللہ تعالیٰ نے مادیات وروحانیات کو سلسلۂ اسباب سے وابستہ فرما دیا ہے۔

بالخصوص ایمان و ہدایت کے درجات حاصل کرنے میں اسباب کا دخل زیادہ ظاہر ہے، اسباب اختیار کیے جائیں تو حق تعالیٰ ان کے مسببات عطا فرما ہی دیتے ہیں۔

فائدہ حدیث

نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان جب عبادت کے لیے باہر جائے تو اپنے گھر والوں کو اور متعلقین کو اس جگہ کی اطلاع کر جائے۔

کیوں کہ رسول اللہ ﷺ جب غارِ حراء کی طرف جاتے تو آپ ﷺ کے گھر والوں کو جگہ کی خبر بھی ہوتی تھی، اور اس بات کی بھی کہ آپ ﷺ کس لیے وہاں جا رہے ہیں۔

ذیلی فوائد اربعہ

اس میں بہت سے فوائد ہیں، مثلاً بیماری، حادثہ پیش آنے پر اس کے پاس

جانا سہل ہوگا۔

دوسرے یہ کہ گھر والوں کو اپنا ارادہ اور جگہ بتلانے سے تشویش و پریشانی سے حفاظت اور اطمینان ومسرت ہوگی، ورنہ مختلف مقامات کی طرف جہاں جہاں جانا ممکن ومحتمل ہوگا، خیال دوڑائیں گے اور پریشان ہوں گے تو ان کو خبر کر کے جانے میں اس پریشانی سے حفاظت رہے گی اور خوشی اس وجہ سے ہوگی کہ ان کو معلوم ہوگا کہ عبادت کے لیے سب سے الگ رہنا چاہتے ہیں اور عبادت میں مشغولی چاہتے ہیں، دشمن وغیرہ کے خوف سے نہیں چھپ رہے، اور مسلمانوں بالخصوص گھر والوں کو خوش کرنے میں ثواب اور اجر ظاہر ہے۔

تیسرے یہ کہ اس خبر کر کے جانے میں گھر والوں کو اور دوستوں کو بھی خلوت وعبادت کی دعوت وترغیب ہے، کیوں کہ جو کام بار بار کسی کے سامنے کیا جاتا ہے تو عام عادت ہے کہ اس کے دل کو حرکت ہوتی ہے اور شوق ورغبت پیدا ہوتی ہے۔

چوتھے یہ کہ جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عبادت کے واسطے الگ جارہے ہیں تو جو کوئی بھی اس سے تعلق رکھنا چاہے گا، اسی قاعدے کے موافق تعلق رکھے گا اور اس کے کام میں خلل انداز نہ ہوگا، اور اس کے برخلاف ذوق رکھنے والوں کے اختلاط سے حفاظت اور تشویش سے نجات ہوگی۔

کسی دینی کام میں اندھا دُھند لگنے کی ممانعت اور حقوق واجبہ کی حفاظت

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ذکر وشغل وغیرہ کسی بھی دینی کام کے لیے ایک طرفہ خیال، ایک طرفہ نظر کر کے اندھا دھند، حقوق ضروریہ اور دینی ودنیوی ذمہ داریوں میں مقدم ومؤخر پہچانے بغیر، اہم اور غیر اہم میں فرق وتمیز کے بلالحاظ

محض اپنے ذوق وشوق میں چل کھڑے ہوتے اور گھر سے باہر چلے جاتے ہیں، وہ لوگ سخت غلطی کرتے ہیں۔

چوں کہ ایسا کرنا سنت محمدیہ اور شریعت اسلامیہ کے بالکل خلاف ہے، اس لیے کہ آں حضرت ﷺ کی عادتِ شریفہ عبادت کے لیے جگہ بتلا کر جانا، انتظام ضروری کرکے، امور خانہ انجام دے کر جانا یہ اس حدیث میں صاف طور پر مذکور ہے۔

پھر آپ ﷺ نے ایسی خلوت گزینی نہیں فرمائی کہ گھر والوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہو، بلکہ آپ ﷺ صرف چند دنوں کے لیے وہاں عبادت کے لیے جاتے، پھر گھر والوں کی ضرورت کے لیے تشریف لاتے پھر کچھ دنوں کے لیے تشریف لے جاتے۔

معلوم ہوا کہ مخلوق سے بالکل الگ ہوجانا اور بیوی بچوں سے ہمیشہ کے لئے بے تعلق ہوجانا سنت نہیں جیسا کہ آپ کے اس فعل مبارک سے ظاہر ہے، علاوہ ازیں حدیث قولی بھی ہے، ارشاد نبوی ہے: لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَام (۱)، اس میں انقطاع کلی اور تبتل تام سے صاف ممانعت فرمادی کہ اسلام میں رہبانیت نہیں کہ نکاح ہی نہ کیا جاوے اور مخلوق سے بالکل الگ تھلگ ہوجائے، پس رہبانیت سنت اور ثواب کی چیز نہیں، لہٰذا بیوی بچوں کے تعلق کو تصوف کے خلاف خیال کرنا اور ان سے بے تعلقی کو خلوت اور یکسوئی کے لیے شرط سمجھنا بالکل غلط اور سراسر باطل ہے، بلکہ اتلافِ حقوق ہوکر معصیت ہے۔

---

(۱) تفسیر کی کتابوں میں یہ قول بصورتِ حدیث بہ کثرت موجود ہے، تفسیر رازی (سورۂ مائدہ ۸۳:) بحر محیط (سورۂ مائدہ ۸۳:) وغیرہ متعدد تفاسیر میں یہ قول بلا سند بہ صورتِ حدیث موجود ہے لیکن اس پر محدثین نے کلام کیا ہے، البتہ مضمونِ حدیث صحیح اور ثابت ہے، صاحب کشف الخفاء نقل فرماتے ہیں: قال ابن حجر لم أره بهذا اللفظ، لكن في حديث سعد بن أبي وقاص عند البيهقي: ''إن الله أبدلنا بالرهبانية الحنيفية السمح''. اسی طرح دار قطنی میں ایک حدیث ہے: إِنِّي لَمْ أُومَرْ بِالرَّهْبَانِيَّةِ. (سنن الدارمی، عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رضی اللہ تعالی عنہ، بَابٌ فِي النَّهْيِ عَنِ التَّبَتُّلِ، رقم الحديث: ۲۲۱۵.)

حقوق واجبہ مقدم ہیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عبادت حقوقِ واجبہ کو پوری طرح ادا کرنے کے بعد ہی ہو سکتی ہے، چوں کہ حضور اکرم ﷺ کا خلوت گاہ سے تشریف لاتے رہنا گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے ہوتا تھا تو جس طرح گھر والوں کے حقوق واجب ہیں، اسی طرح دوسروں کے حقوقِ واجبہ کا ادا کرنا اور پوری طرح ادا کرنا یہ بھی ضروری ہے،اس کے بعد مستحبات میں مشغول ہونا درست ہوگا، خلاصہ یہ کہ حقوق واجبہ کو تلف کر کے خلوت وعبادت کرنا، کہیں چلّہ گذارنا حقیقت میں عبادت نہیں بلکہ ہلاکت ہے، گو ظاہر بیں اس کو عبادت سمجھتے ہوں۔

مبتدی کے لیے خلوت ہونا اختلاط سے بچنا ضروی ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ مبتدی کے لئے خلوت اور گوشہ نشینی ہی بہتر ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ ابتدائے امر میں اکیلے ہی رہتے تھے اور انتہائے مقدر پر پہنچنے کے بعد آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ گھر والوں کے درمیان ہی رہ کر عبادت کرتے تھے، حتّٰی کہ سجدہ کے وقت گھر والوں کا پیر دبا دیتے؛ تا کہ وہ اپنا پیر سمیٹ لیں اور سجدہ کے لیے جگہ ہو جائے ،لیکن ابتدا میں آپ نے گھر میں رہ کر یکسو رہنا اختیار نہیں فرمایا، بلکہ غارِ حراء میں تشریف لے جاتے تھے،معلوم ہوا کہ خلوت درجلوت، بلفظ دیگر خلوت درانجمن مبتدی کے لیے مناسب نہیں ہوتی ، بلکہ اس کو خلوت کاملہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

برخلاف منتہی کے کہ اس کو خلوت درانجمن حاصل ہو جاتی ہے، اس کو اہل وعیال اور احباب کی صحبت توجہ الی اللہ تعالیٰ سے مانع نہیں ہوتی۔ ع

خلوت وچلہ برو لازم نماند

لیکن منتہی کو بھی ایک وقت خلوت کاملہ کا مقرر کرنا چاہئے۔

خلوت کی قسمیں

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خلوت وتخلیہ یعنی مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں : ایک اختیاری وکسبی، دوسرے وہ جو اللہ سبحانہ کی طرف سے موہوب ہو، بندہ پر غیر اختیاری طور پر فائز ہو، تخلیۂ کسبیہ کی مثال آں حضرت ﷺ کا غارِ حراء میں خلوت وعبادت فرمانا ہے، اور تخلیۂ وہبیہ وہ ہے جس کے لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا آپ ﷺ کو سینے سے لگانا اور دبانا ہوا۔

بہرحال طریق وصول الی اللہ میں مجاہدہ ضروری اور لازمی ہے، اس کے بغیر کامیابی نہیں ہوتی، خواہ مجاہدہ خود کیا جائے، یا غیبی طور سے کرایا جائے، یا دونوں طریقے جمع ہو جائیں۔

حدیث سے تخلیہ کا تحلیہ پر مقدم ہونا بھی ظاہر ہے، جس کے حضرات صوفیہ محققین قائل ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اولاً تخلیہ ومجاہدہ اختیار فرمایا، حتیٰ کہ آپ ﷺ نے اپنی انتہائی کوشش اور طاقت صرف فرمادی، یہ تخلیہ اختیاری تھا، پھر حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ عطاّت ثلثہ کی صورت میں تخلیۂ وہبیہ غیر اختیاری ہوا، اس طرح تکمیل تخلیہ کے بعد تحلیہ ہوا یعنی آپ ﷺ کو وحیٔ الٰہی کلامِ الٰہی سے مشرف فرمایا گیا۔

دلالت حدیث بر اختیار اسباب

حدیث میں آپ کا غارِ حراء میں خلوت کے لیے توشہ لے جانا مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خلوت گاہ اور جائے اعتکاف اور مقامِ مراقبہ میں جاتے وقت توشہ ساتھ لینے کی کوشش ہو، پس جو لوگ ترک اسباب کو تصوف کے لیے شرط اور مشغولیٔ اسباب کو مانع سمجھتے ہیں، وہ غلطی اور دھوکے میں ہیں۔

اب ایک سوال ہوسکتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے کتنے دن خلوت گزینی اختیار فرمائی؟ نیز یہ چیز قبل نبوت ہی کی تھی یا بعد اعطائے نبوت بھی اس خلوت گزینی کی صورت جاری رہی؟۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس باب میں روایات مختلف ہیں: بعض روایات میں خلوت گزینی کی مدت ایک ماہ آتی ہے (۱) اور بعض روایات میں خلوت گزینی کی مقدار چالیس دن بھی آتی ہے (۲)، اگرچہ وہ زیادہ قوی نہیں، تاہم ایسی روایات سے اگرچہ فرائض۔ واجبات ثابت نہ ہوں اور فرضیت وجوب کے لیے گو ایسی روایات سے استدلال نہ کیا جاسکے۔ لیکن فضائل و مستحبات میں ایسا ضعف قادح و مانع اور حارج نہیں ہوتا، اس لیے اس کی استحبابیت پر اس روایت سے استدلال صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔

حدیث کی دلالت بر اصول محققین، چلہ کشی

اس سے مشائخ محققین نے چلّہ کشی کا اصول استنباط کیا ہے، مشائخ طریقت کے یہاں (جو صحیح معنیٰ میں نا تبین رسول اللہ ﷺ ہیں جنھیں ظاہر و باطن دونوں رُخوں میں اتباع سنت کا بہت زیادہ اہتمام ہوتا ہے) یہ خلوت گزینی کا طریق وصول الی الحق کی راہ میں منازل قرب کے طے کرنے اور مدارج میں ترقیات

(۱) صحیح مسلم، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رضی الله تعالی عنهما، بَابُ بَدْءِ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ.

(۲) قال في قوت الإحياء :ولم يصح عنه - ﷺ - أكثر منه، نعم روى الأربعين سوار بن مصعب وهو متروك الحديث. قاله الحاكم وغيره، وأما قوله تعالى :{وَوَاعَدْنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ} [الأعراف :۱۴۲] فحجة للشهر، والزيادة إتمامًا للثلاثين حيث استاك أو أكل فيها كسجود السهو فقوي تقييدها بالشهر وأنها سُنّة. نعم الأربعون ثمرة نتاج النطفة علقة فمضغة فصورة والدر في صدفه. (القسطلانی، ۶۲/۱)

پانے میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لیے اکثروں کا معمول، خلوت وچلہ گذارنا رہا ہے، چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ شیخ داتا گنج بخشؒ کے حجرے میں لاہور چلہ کش رہے، اسی طرح اور بزرگوں کے بھی چلہ کشی وخلوت گزینی کے واقعات ہیں جن کے ذکر سے زیادہ طول ہوجائے گا، اس لیے بس مثال کے لیے ایک ہی واقعہ کا ذکر کافی سمجھئے! ، یہ گفتگو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت گزینی کی مقدار ومدت کے سلسلہ میں عرض کی گئی ہے۔

خلوت نشینی بعد نبوت بھی اختیار رہی

اب رہی یہ بات کہ یہ خلوت گزینی قبل نبوت ہی ہوئی یا بعد میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار فرمایا؟ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعطائے نبوت کے بعد بھی غارِحراء تشریف لے جاتے تھے، کیوں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اعطائے نبوت سے قبل آپ کے پاس تشریف نہیں لائے۔

اور مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوتوشہ دینے آپ کے پاس غارِحراء تشریف لارہی تھیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوان کے آنے کی اطلاع دی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کورب العالمین کا سلام کہنا اورجنت میں موتیوں کے گھر کی بشارت دینا(۱)۔

اسی طرح ابوداودشریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی حدیث موجود ہے، فرماتی ہیں کہ مجھ کورسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اونٹنی دی اور فرمایا کہ اس پر سامان توشہ وغیرہ باندھ دیا کرو، میں یہ خدمت انجام دے دیتی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دودو تین تین دن کے لیے جنگل تشریف لے جاتے تھے(۲)۔

(۱) مشکوۃ المصابیح، ص۵۷۳، باب مناقب ازواج النبی ﷺ ،عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ، رقم الحدیث: ۶۱۸۵.

(۲) سنن أبی داود، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰہُ تعالی عَنْهَا، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْهِجْرَةِ وَسُكْنَى الْبُدُوِ، رقم الحدیث: ۲۴۷۸.

پھر اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا کہ خلوت ویکسوئی کے لیے جنگلوں میں چلے جاتے تھے بلکہ ان بیرونی خلوتوں کے علاوہ خود مکان مبارک پر بھی خلوت کے لئے ایک جگہ اور ایک وقت کو ایسا مخصوص فرما رکھا تھا جس میں کسی کی بھی گنجائش نہ تھی، غالباً الفاظ حدیث یہ ہیں: **لِي مَعَ اللهِ وَقْتٌ لا يَسَعُ فِيهِ مَلَك مُقَرَّبٌ، وَلا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ** (۱) اور راز اس میں یہ تھا کہ اختلاط خلق کا ایک اثر ہوتا ہے جس کو حجاب عن الحق کہنا چاہیے، جس کو آں حضرت ﷺ باوجود ہمہ وقت توجہ الی اللہ کے حاصل رہنے کے کہ آپ ﷺ کا تو لمحہ لمحہ رضائے الٰہی کے مطابق مرضیٔ حق سے مقرون، ہر کام حتّٰی کہ معمولات بشریہ اکل وشرب وغیرہ بھی تمام کے تمام امرِ حق سے اور انھیں کی رضاء جوئی کی خاطر ہوتے تھے، ہر وقت آپ ﷺ کا قلبی رخ متوجہ اور مصروف بحق ہی رہتا تھا، تاہم ایک بواسطۂ تعلیم وتبلیغ خلق توجہ ہوتی ہے اور ایک بلاواسطہ براہ راست بلاحیلولت ہوتی ہے، دونوں میں فرق ضرور ہوتا ہے۔

اسی فرق کے احساس کے پیش نظر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **إِنَّهُ لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي** (۲) کہ کبھی میرے قلب پر بھی غبن آجاتا ہے، یہ وہی حضور وتوجہ الی الحق میں بوجہ مشغولیٔ امور تبلیغ خلائق ذرا فرق آجانے اور قلب انور پر بار ہونے، طبع لطیف پر تکدر وگرانی آجانے کی بات تھی، جس کو آپ ﷺ نے اپنے درجہ

(۱) يذكره المتصوفة كثيرا، وهو في رسالة القشيري لكن بلفظ: لي وقت لا يسعني فيه غير ربي، ويشبه أن يكون معنى ما للترمذي في الشمائل، ولابن راهويه في مسنده، عن علي في حديث طويل: كان ﷺ إذا أتى منزله جزأ دخوله ثلاثة أجزاء: جزءا لله تعالى، وجزءا لأهله، وجزءا لنفسه، ثم جزأ جزأه بينه وبين الناس. (المقاصد الحسنة في بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسنة، ص۵۲۵، رقم الهديث: ۹۲۶.)

(۲) صحيح مسلم، عَنِ الْأَغَرِّ الْمُزَنِيِّ رضى الله تعالى عنه، بَابُ اسْتِحْبَابِ الِاسْتِغْفَارِ وَالِاسْتِكْثَارِ مِنْهُ، رقم الحديث: ۲۷۰۲.

عالیہ کے اعتبار سے غبن سے تعبیر فرمایا جس کے ازالہ کے لیے آپ خلوت ویکسوئی کی ضرورت محسوس فرماتے تھے؛ تا کہ خلق سے منقطع ویکسو ہو کر بلا واسطہ اور براہِ راست نورحق کی طرف متوجہ ہوں، اور انوارقدس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پر منعکس ومتجلّی ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب انور میں ایک خاص کیفیت نورانیہ کی غذا پہنچے جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحِ الطف وانور کی حیات کے لیے ممد ومعاون ہوتی تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خلوت وتخلیہ کا ہمیشہ ہی اہتمام فرمایا، یہی ہے وہ نبوت میں ولایت جس کو کہا گیا ہے کہ **الولایۃ افضل من النبوۃ۔**

خانقاہ کی اصل اور سند

یہاں سے معلوم ہوا کہ چلّہ کشی کرنے اور خانقاہوں میں بیٹھنے اور انقطاع وتبتل اختیار کرنے کی معقول اور مقبول سند اور دلیل قوی طور پر ہے، تو اہل اللہ کی چلّہ کشی مشکوٰۃ نبوت سے مقتبس ہے۔

اور اصل ماخذ آیت ﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ﴾ [الأعراف: ۱۴۲] ہے، کیوں کہ اس آیت سے حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کو آپ کی قوم بنی اسرائیل سے علیحدہ ہو کر چلّہ گذارنے کا حکم بتلانا مقصود ہے، اسی طرح ایک حدیث قدسی میں تخلیق انسان کے تقلبات وتطورات کو ہر چالیس دن کے بعد ہونا بیان فرمایا ہے کہ رحم مادر میں چالیس دن نطفہ کی شکل پھر علقہ ہو کر چالیس دن رہتا ہے پھر مضغہ ہوجاتا ہے اور چالیس دن اسی حال پر رہتا ہے (۱)، معلوم ہوا کہ چالیس دن اور چلّہ کو تغیر حالات میں ایک خاص دخلِ ترقی محمود اور مطلوب ہے۔

(۱) صحیح البخاری، عَنْ عَبْدِ اللهِ رضی الله تعالی عنه، بَابُ خَلْقِ آدَمَ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِ وَذُرِّيَّتِهِ، رقم الحدیث: ۳۳۳۲.

پس خانقاہی طریق کو شریعت کے خلاف اور چِلّہ کشی کو لَا رَهْبَانِيَّة فِي الْإِسْلَام کے خلاف سمجھنا سراسر غلط اور محض باطل ہے۔

جذبہ عبادت کا فطری ہونا

نویں بحث ، جب کہ حق تعالیٰ نے آپ کو طریق عبادت ابھی تعلیم نہیں فرمایا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **تحنّث** یعنی عبادت کیوں اور کس طرح فرماتے تھے؟۔

اس کے کئی جوابات ہیں: ایک یہ کہ اسمائے الٰہیہ کا ورد فرماتے تھے، دوسرے یہ اگرچہ ابھی وحئ جلی کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا مگر الہامی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طریق عبادت بتلادیا گیا تھا یعنی وحی حقی کے ذریعہ طریق عبادت تعلیم فرمادیا گیا تھا(۱)۔

رہا یہ کہ کیوں عبادت فرماتے تھے؟ یہ بات کوئی باعث سوال اور قابل اشکال نہیں ہوسکتی ، چوں کہ فطرت سلیم خود شرک سے نفور اور توحید کی طرف داعی ومقتضی ہوتی ہے، عبادت کی طرف لے چلتی ہے، اور نبی کی فطرت تو نہایت ہی اعلیٰ ہوتی ہے(۲)۔

---

(۱) الرابع ما قيل أن عبادته عليه وسلم قبل البعث هل كانت شريعة أحد أم لا فيه قولان لأهل العلم وعزى الثاني إلى الجمهور إنما كان يتعبد بما يلقى إليه من نور المعرفة واختار ابن الحاجب والبيضاوي أنه كلف التعبد بشرع...والقائل بالأول اختلف فيه على ثمانية أقوال أحدها أنه كان يتعبد بشريعة إبراهيم الثاني بشريعة موسى الثالث بشريعة عيسى الرابع بشريعة نوح حكاه الآمدي الخامس بشريعة آدم حكي عن ابن برهان السادس أنه كان يتعبد بشريعة من قبله من غير تعيين السابع أن جميع الشرائع شرع له حكاه بعض شراح المحصول من المالكية الثامن الوقف في ذلك وهو مذهب أبي المعالي الإمام واختاره الآمدي.(عمدة القاری، ۱/۱/۶۱)

(۲) فتح الباری، ۱۲/۱۰/۴۱.

پھر آں حضرت ﷺ تو سید الانبیاء ہیں، آپ ﷺ کی فطرت تو نہایت ہی اعلیٰ سے اعلیٰ ہے؛ اس لیے آپ کی طبع مبارک اور آپ ﷺ کی سلامت فطرت تو کیوں عبادت کو مقتضی نہ ہوتی ؟ پس عبادت با قتضائے فطرت تھی۔

ذکرِ لیالی کی وجہ

دسویں بحث یہ ہے کہ باوجود عبادت شبانہ روز کے رات ہی کے ذکر کی کیا خصوصیت تھی؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ راتوں کا ذکر اس لیے فرمایا گیا کہ رات آرام وسکون کے لیے ہوتی ہے اور دن کام کے لیے، اس لیے راتوں کی عبادت بتلانے سے دنوں کی عبادت تو بطریق اولیٰ سمجھی جائے گی کہ جب آرام کے وقت بھی عبادت فرماتے تھے تو دن میں بطریق اولیٰ عبادت فرماتے تھے اور یہ کلام کی بلاغت ہے کہ ایسا لفظ لایا جائے کہ معنیٰ ومطلب کو حاوی ہو، بات اس طرح کہی جائے کہ اس کے تمام متعلقات خود بہ خود اس میں مندرج اور داخل ہوجائیں، اگر ایام ولیالی دونوں کا ذکر کیا جاتا تو عبارت طویل ہوجاتی اور **الکنایة ابلغ من التصریح** (۱) کے قاعدہ کے پیش نظر کلام بلیغ بھی نہ ہوتا۔

جَاءَہُ الحَق کا مطلب

گیارھویں بحث یہ ہے کہ "**جَاءَہُ الحَقُّ**" سے کیا مراد ہے؟ سو حق سے وحی مراد ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وحی کا ذریعہ یعنی مَلک مراد ہو (۲) ، نیز یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے اعطائے نبوت مراد ہو۔

---

(۱) مختصر المعانی، ۱/ ۴۴۱، ط :یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند.

(۲) فتح الباری، ۱۲/ ۴۱۰.

بارھویں بحث یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ غارِحراء میں کس ماہ میں وحی لے کر نازل ہوئے؟ سوحضرت جبرئیلؑ رمضان المبارک کی سترھویں تاریخ کو دربار رسالت میں وحی لے کر حاضر ہوئے تھے جیسا کہ روایت میں مذکور ہے(۱)۔

تیرھویں بحث: کتاب وصحیفہ تو سامنے نہیں تھا پھر اقرأ فرما کر قرآت کس چیز کی کرائی جارہی تھی؟۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ کے سامنے دیباج یعنی ریشم کے کپڑے پر لکھا ہوا پیش کیا گیا تھا(۲)، دوسرے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لکھا ہوا تو نہ تھا مگر اقرأ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح میں کہتا جاؤں، آپ بھی کہتے جاویں، جیسے بچے کو معلم کہتا ہے کہ پڑھ اور مطلب یہی ہوتا ہے کہ جس طرح میں پڑھوں، میری نقل کرتے ہوئے تم بھی اسی طرح کہو(۳)۔

اخذ وتغطیہ کا بیان اور اس کے وجوہ

چودھویں بحث یہ ہے کہ "مَا أَنَا بِقَارِئٍ" فرمانے پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اخذ وتغطیہ کا معاملہ کیوں فرمایا؟۔

سو بات یہ تھی کہ آں حضرت ﷺ ماہِ ربیع الاول سے رمضان المبارک تک غارِحراء میں خلائق سے انقطاع فرمائے ہوئے تھے، مجاہدوں وریاضتوں میں بکمال توجہ مشغول تھے کہ جبرئیل علیہ السلام سترہ رمضان کو آموجود ہوئے اور آتے ہی بہ جائے اس کے کہ ذرا سکون پاتے، بیٹھتے، مزاج پرسی فرماتے، فوراً فرمایا :اقرأ! تو آپ ﷺ نے "مَا أَنَا بِقَارِئٍ" کے الفاظ میں گویا یہ ارشاد فرمایا ہے کہ آپ

(۱) فتح الباری، ۱۲/۴۱۱.
(۲) سیرۃ ابن ہشام، ۱/۱۵۴، ۱۵۳.
(۳) فتح الباری، ۱۲/۴۱۲.

تعجیل فرمارہے ہیں، میں اس وقت نہیں پڑھ سکتا، مجھے معاف رکھئے !، یہ میرے الفاظ ہیں جو اس کلام اور شراح کے کلام سے مفہوم ہورہے ہیں، گویا یہ ترجمہ سیدھا سادھا اور بھولا بھالا ہے۔

ہاں تو یوں فرمارہے ہیں کہ مجھے معاف رکھئے، میں بالفعل پڑھنے سے معذور ہوں، آپ خود سمجھ لیں، آپ ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں، انجان نہیں، تجربہ کار ہیں، پس حضرت جبرئیلؑ سمجھ گئے کہ یوں فرمارہے ہیں : چھے ماہ گذر گئے، مجاہدوں، ریاضتوں اور مشقتوں سے اوقات گذررہے ہیں، غارِحراء میں پیر بھی نہیں پھیلتے، جسم دکھ رہا ہے، دماغ کمزور، قوت لایموت پر اکتفاء، برابر چلہ کشی کا سلسلہ، ایسی حالت میں قرآت کرنا معمولی بات نہیں، اس کے فراغت پانے اور قوت پکڑنے اور طاقت پانے کی ضرورت ہے اور آپ آتے ہی فرمارہے ہیں :اقرأ تو میں اچانک، ایک دم دماغ اور قلب وجسم کو اس طرف کیسے لگاؤں؟ جسم تھکا ماندہ اور چور چور ہے، اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام اخذ وتغطیہ کے ذریعہ گویا بزبان حال فرمارہے ہیں کہ میں تو آپ کا خادم ہوں، (یہ عاشقانہ کلام ہے، عالمانہ کلام نہیں) جیسے بڑے بوڑھے دست شفقت پھیرنے کے لیے ہوتے ہیں۔خیر یہ معاملہ ایک دفعہ فرمانے کے بعد کہا:اقرأ۔ کہ اب تو پڑھ لیں۔

آپ ﷺ نے اس پر مَا أَنَا بِقَارِئٍ کے ذریعہ بہ زبان حال گویا یہ فرمایا کہ ابھی میں اس قابل نہیں ہوا، ابھی کہاں تکان اترا؟۔

دوسری مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اخذ وتغطیہ کا معاملہ کرکے فرمایا :اقرأ۔آپ ﷺ نے پھر جواب میں مَا أَنَا بِقَارِئٍ فرمایا جس کا حاصل اور ترجمہ گویا یہ ہے کہ ابھی اچھی طرح تکان نہیں اترا، ابھی تو کچھ کچھ اترا ہے، اس لیے ابھی تک میں پڑھنے کے قابل نہیں ہوا، ابھی تو تکلف ہوگا، میں تو اور طرف کی کیفیات اور تاثرات لیے ہوئے ہوں، اس جواب کے بعد حضرت جبرئیل

علیہ السلام نے تیسری مرتبہ اخذ وتغطیہ کی خدمت انجام فرمائی، پھر عرض کیا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ [العلق] گویا یوں فرمارہے ہیں کہ اب تو آپ ٹھیک ہوگئے، اب تو آپ خود پڑھ سکتے ہیں، غرض حضرت جبرئیلؑ اخذ وتغطیہ یعنی دبانا، خادمانہ طور سے انجام فرمارہے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ کے اقرأ کہنے پر جواب ارشاد فرمایا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، اس پر جبرئیلؑ نے آپ کو اخذ وتغطیہ کیا۔

اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اس اخذ وتغطیہ سے حضرت جبرئیلؑ کی آپ ﷺ پر خاص قوت وفضیلت ثابت ہوتی ہے، چوں کہ اس اخذ جبرئیل اور تغطیہ سے آں حضرت ﷺ کے اندر ایک اہلیت اور استعداد پیدا ہوگئی جو پہلے آپ ﷺ میں موجود نہ تھی، ورنہ پہلے اگر ضعفِ قوت، ضعفِ استعداد کی بات نہ تھی تو آپ ﷺ مَا أَنَا بِقَارِئٍ کیسے فرماتے؟۔

اس اشکال کے تین جوابات پیش کیے تھے، یہ سب جوابات چلتے ہوئے اور بچوں کے تھے(۱)۔

اخذ وتغطیہ کی چوتھی وجہ اور اس کے آٹھ مقدمات

آج جب چوتھے جواب کی باری آئی، آپ حضرات نے طبیعت مکدر کردی، میں ایک کمزور آدمی اور بیمار، ابھی سفر سے واپسی ہوئی، ابھی یہاں پڑھانے کے لیے آگیا، اور آپ حضرات میں کوئی کہیں پھر رہا ہے، کوئی کسی حجرہ میں جارہا ہے! پڑھنے کے لیے آئے ہو یا اِدھر اُدھر پھرنے؟ جس کو نہیں پڑھنا، اپنے گھر

(۱) یہ اخذ وتغطیہ تین مرتبہ ہونے کی وجوہات ثلٰثہ تھیں جو ذکر فرمائی گئیں۔ نصیر احمد جامعی عفی عنہ۔

جائے !، خیر بتوفیقہٖ تعالیٰ عرض کیا جائے گا۔

یہ جواب علمی ہے بخاری شریف کی شان کے لائق ہے، اس کے لیے مقدمات ہیں، مگر پہلی بات یہ ہے کہ کسی اور طرف نہ دیکھئے یا تو میری طرف دیکھئے یا نیچی نگاہ رکھئے !۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ جس وحی کو نازل فرما رہے ہیں، وہ اپنے لفظی ومعنوی واحکامی حیثیت سے نہایت فصاحت ، نہایت بلاغت اور جمیع امور انسانیہ کو لیے ہوئے ہے، خواہ وہ متعلقہ بہ معاد ہوں یا متعلقہ بہ معاش، متعلقہ بہ جسم ہوں یا بہ روح، متعلقہ بہ عناصر مادیہ ہوں یا بہ عناصر مجردہ، یا متعلقہ بہ سیاست ہوں، انفرداً ہوں یا اجتماعاً، ان تمام کو اپنے اندر لیے ہوئے وحی نازل ہو رہی ہے، پھر وہ وحی ایک آدھ ساعت یا ایک دو دن یا ایک دو ہفتہ یا دو ماہ، ایک دو سال کے لیے یا ایک دو صدی کے لیے ہی نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہے، اس شان کے ساتھ وحی کا نزول ہو رہا ہے۔

دوسرا مقدمہ: جیسے حضور ﷺ پر وہ کلام، وحیٔ منزّل اس شان کے ساتھ نازل ہے، اسی طرح منزل الیہ ذات محمد ﷺ کو بھی خاص شان یعنی نور عربیت، نور اجتہادیت، نور نبوت، نور خاتمیت، نبوت کے مجموعہ انوارِ اربعہ کے ساتھ مبعوث کیا گیا۔

تیسرا مقدمہ: كَلَامُ الْمُلُوكِ مُلُوكُ الْكَلَامِ کہ بادشاہوں کا کلام بھی کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔

چوتھا مقدمہ : جس درجے کا متکلم ہوتا ہے، اسی درجے کی اس کے کلام میں صولت وشوکت، عظمت وہیبت ہوتی ہے۔

پانچواں مقدمہ : عظمت وہیبت وجلالتِ کلام کا اثر مخاطَب پر مخاطِب کی حیثیت معرفت کے بہ قدر ہوتا ہے یعنی مخاطب کے قلب میں متکلم کی حیثیت کی جس درجہ معرفت ہوگی، اسی درجے کا مخاطب پر تاثر ہوگا۔

چھٹا مقدمہ :اس معرفتِ شانِ جلالت وعظمت وخوف وہیبت سے مخاطب بعض مرتبہ مغلوب الحال ہوجاتا ہے، یعنی مخاطب میں کلام شاہی کی جلالت وہیبت وخوف سے اختلالِ حواس اور مغلوبیت آجاتی ہے۔

ساتواں مقدمہ :ایسی حالت میں متکلم اس مخاطب وسامع کے ساتھ رفع اختلال اور دفع مغلوبیت کے لیے ایسا معاملہ اور طرز اختیار کرتا ہے جس سے خوف وہیبت وعظمت تو بڑھتی رہے مگر اختلال اور مغلوبیت دفع ہوجائے۔

آٹھواں مقدمہ :اس رفع اختلال ودفع مغلوبیت کے لیے وہ خاص طرز جس کو متکلم استعمال کرتا ہے، متکلم کا تصرف ہے، اور وہ تصرف چھے قسم پر ہے ان کو تصرفاتِ ستہ کہا جاتا ہے، تفصیل اس طرح ہے کہ اول تصرف کی دو قسمیں ہیں: (۱) تصرف جسمانی (۲) تصرف روحانی، پھر تصرف روحانی کی دو قسمیں ہیں: (۱) روحانی ارادی (۲) روحانی طبعی، جسمانی کی چار قسمیں ہیں: (۱) جسمانی عنصری ارادی، (۲) جسمانی غیر عنصری ارادی (۳) جسمانی طبعی عنصری، (۴) جسمانی طبعی غیر عنصری، یہ کل چھے تصرفات ہیں۔

جب ان مقدمات کے ساتھ یہ چھے تصرفات معلوم ہوگئے تو اب سمجھئے کہ حضرت جبرئیلؑ نے حضور ﷺ کو لفظ اقرأ کے ساتھ مخاطب کیا تو آپ ﷺ نے نورِ عربیت ونورِ اجتہادیت ونورِ نبوت ونورِ خاتمیتِ نبوت، ان انوارِ اربعہ سے فوراً اس کو جان لیا کہ مقصود محض لفظ کی قرأت نہیں بلکہ اس کے انتہائی معانی ومطالب قیامت تک کے زمانوں اور انسانوں کی افہام وتفہیم، تبلیغ واشاعت، بہ جدوجہد، بہ مشقت، بہ مقابلۂ اعداء ومخالفین ودھمکئ قتل واخراج بہ جمیع احکامِ متعلقہ انسان تا قیامت، ان تمام کے ساتھ مجھ سے اقرأ مطلوب ہے۔

تو آپ ﷺ نے اس استحضار کی عظمت سے متأثر ہوکر مَا أَنَا بِقَارِئٍ فرمادیا کہ میں اس قرأت کے قابل ولائق نہیں، نیز لا أقرأ نہیں فرمایا جس کے معنیٰ یہ

ہیں کہ میں نہیں پڑھتا یعنی اگر چہ پڑھ سکتا ہوں مگر نہیں پڑھتا، جو اعراض پر دال ہوتا، بہر حال! مَا أَنَا بِقَارِئٍ فرمایا کہ چوں کہ کلام الملوک کی عظمت وحیثیت، رعب ود بدبہ وجلالت کا اس درجہ استیلاء ہوا کہ قرأت کی تاب نہیں رہی۔

اور میرے حواس بالفعل اس درجہ متأثر ہیں کہ اس کے متعلق سب امور کے ساتھ قرأت ہونا بھی مشکل ہے، اس لیے میں کیسے پڑھوں؟ غرض مخاطب یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی شان کے اعتبار سے تأثر لیا، اور یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں چوں کہ بعض دفعہ امتحان میں محنتی، مطالعہ کا خوگر، تکرار کا عادی، اسباق میں حاضر باش جب ممتحن کے سامنے بیٹھتا ہے تو سب بھول جاتا ہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کے سامنے مشاہدہ کیا ہے، بڑے بڑے علماء بڑے بڑے اساتذہ، بڑے بڑے مشائخ اور مشاہیر مقررین اور بڑے بڑے فخر کے ساتھ خاموش بنا دینے کا دعویٰ کرنے والے دیکھے کہ جب سامنے آئے تو مرعوب وہیبت زدہ رہ گئے، بول نہیں سکے، چنانچہ علی گڈھ میں میرے سامنے کا واقعہ ہے، اس وقت اپنی نوعمری تھی، حضرت کانگریس کی شرکت روا نہیں رکھتے تھے۔

غرض! علی گڈھ میں ایک نوتعلیم یافتہ لیڈر، بڑے لحیم شحیم اور قدآور کانگریسی خیال کے تھے، وہ آئے اور حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں، عصر کے بعد کا وقت تھا، حضرت نے اجازت فرمادی اور ایک کمرہ میں چلے گئے، ذرا ہی دیر میں باہر آے، پوچھا گیا: کیا ہوا؟ کہا بات نہیں چلی، بس دو ہی منٹ میں خاموش کان دبا کر چلے گئے۔

اسی طرح ہائی کورٹ کے جج ایک دفعہ اوقاف کا انتظام غیر مسلم حکومت کو دینے کے بارے میں وفد لے کر گفتگو کرنے کے لیے تھانہ بھون حضرت والاؒ کی خدمت میں پہنچے، جو اور بھی بہت سی جگہوں کے علماء سے گفتگو کر کے جری ہو چکے تھے، لیکن یہاں تھانہ بھون حضرت کے سامنے چند منٹ میں دم بخود ہو گئے اور متحیر

رہ گئے۔ حضرت والاؒ نے اس گفتگو میں یہ بات ثابت اور مدلل فرمائی تھی کہ اوقاف امورِ دیانات سے ہیں، اس لئے ان میں حکومت غیر مسلم کی مداخلت جائز نہیں۔

اسی طرح مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مشہور مقرر ہیں، حتیٰ کہ عشاء کے بعد ایک دفعہ سہارنپور میں تقریر شروع کی نہایت جوش وخروش کے ساتھ، یہ حال تھا کہ سردی کا موسم تھا مگر جوشِ تقریر میں حرارت وگرمی پیدا ہوئی تو شیروانی اتار دی پھر صدری بھی اتار دی، تقریر کرتے کرتے صبح ہوگئی، سامعین کا یہ حال تھا کہ کوئی اٹھنے کی ہمت نہ کرسکتا تھا، لیکن جب تھانہ بھون تشریف لائے تو ان کا خود بیان ہے کہ اسٹیشن پر اترتے ہی میں مرعوب ہوگیا۔

اور جوں جوں خانقاہ کے قریب ہوتا جاتا ہیبت بڑھتی جاتی، جب خانقاہ کے دروازہ پر قدم رکھا، اسی وقت پاؤں لرزنے لگے اور چہرہ مبارک پر نظر پڑی تو میں بالکل ہی بھاری ہوگیا، حضرت نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا، میں پاس بیٹھ گیا، لیکن جو خیالات تھے، سب سے سکوت! کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوسکی۔

تو ایسے ایسے سماں حضرت کے یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں تو یہ نظائر اس بات پر پیش کیے کہ کلام کی جلالت وخوف و ہیبت آدمی پر اثر انداز ہوکر حواس باختہ اور مرعوب ومغلوب بنا دیتی ہے، تو متکلم اس کو بے تکلف بناتا ہے، مغلوبیت کو دفع کرتا ہے، چہرہ بشرہ سے، خوش طبعی وغیرہ سے۔

پس اسی طرح حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تم اقرأ کہہ رہے ہو اور میں اس اقرأ کے اندر کے انتہائی معانی ومطالب کے رعب و ہیبت سے بالفعل اس قابل نہیں ہوں کہ میری زبان اٹھ سکے تو آپ (ﷺ) مَا أَنَا بِقَارِئٍ کہہ کر معذرت وعذر پیش فرما رہے ہیں۔

اب ضرورت ہے کہ اس اختلالِ حواس اور رعب و ہیبت کے اس مانع کو دفع کیا جائے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ ان تصرفات میں سے کوئی تصرف

اختیار کیا جائے ، لہٰذا ذات باری تعالیٰ بہ توسط جسم غیر عنصری حضور ﷺ کی طرف تصرف وتوجہ فرمارہے ہیں، بہ ایں طور کہ جبرئیلؑ جسم غیر عنصری طبعی کے ساتھ اخذ وتغطیہ فرمارہے ہیں تا کہ یہ مانع رفع ہوجائے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اخذ وتغطیہ کی کیا ضرورت تھی؟ نظر کافی تھی، جواب یہ ہے کہ بے تکلف بنانا ہے، جیسے کوئی باہر سے آنے والا شخص کسی باعظمت وجلال ہستی کے حضور میں مرعوب ہوتا ہے، اس سے معانقہ کر کے اس کو اظہارِ تعلق سے بے تکلف بنایا جاتا ہے، اسی طرح یہاں اخذ وتغطیہ کے ذریعہ حضور ﷺ سے تکلف اٹھایا جارہے، اوراس سے کمال بے تکلفی اور کمال تعلق بہ جسم عنصری طبعی مقصود ہے۔

پہلی مرتبہ اخذ وتغطیہ کے بعد حضرت جبرئیلؑ نے پھر اقرأ کہا ، آپ ﷺ نے پھر عذر فرمایا کہ ابھی اتنا اثر نہیں ہوا کہ نورِ عربیت سے آگے پہنچ سکوں، پھر اخذ وتغطیہ کیا اور اقرأ کہا، آپ ﷺ نے پھر عذر فرمایا کہ ابھی مسامات نہیں کھلے، ابھی رکاوٹ باقی ہے، مَا أَنَا بِقَارِئٍ ابھی میں نور اجتہادیت تک پہنچا ہوں۔ پھر اخذ وتغطیہ سے اظہار محبت و تعلق کیا، پھر اسی طرح اخذ وتغطیہ کیا، اب آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب طبیعت کھل گئی، چہرہ کھل گیا، وہ اختلال ومغلوبیت کا اثر ختم ہوگیا، چوں کہ جس درجے کا اثر عظیم ہوتا ہے، ویسے ہی آہستہ آہستہ رفع ہوتا ہے۔

سو آپ ﷺ کی شان کے اعتبار سے اثر بھی نہایت درجہ تھا، اسی واسطے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کا قول ہے کہ اے لوگو! تم تو معصیت کے خوف سے توبہ کرتے ہو، اور ہم کفر سے ڈرکر توبہ کرتے ہیں کہ کسی کو کیا خبر کہ کل اس کی کیا حالت ہوجائے! یہ عظمت معرفت کا اثر ہے، تو حضور ﷺ کی شان جامعیت کے اعتبار سے آپ ﷺ پر عظمت ورعب بہت زیادہ تھا، اسی اعتبار سے رفع

بھی آہستہ آہستہ چوتھی مرتبہ میں کامل طور سے ہوا، اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھ دیا:
﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③﴾[العلق] یہ حضرت جبرئیلؑ کا تصرف تھا جو توجہات اربعہ میں خاص توجہ تھی بہ جسم عنصری طبعی، اس کے اختیار کرنے سے یہ بات پیدا ہوگئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مغلوبیت رفع ہوگئی۔

توجہ کی اقسام اربعہ

توجہ چارقسم کی ہے :(۱) انعکاسی (۲) القائی(۳) اصلاحی (۴)اتحادی، یہ توجہ توجہ اتحادی تھی، تفصیل اس کی یہ ہے۔

توجہ انعکاسی

اس کو ذرا غور کے ساتھ بہ حضور قلب سنئے! توجہ انعکاسی اسے کہتے ہیں کہ شیخِ وقت کے باطن میں جو انوارِ ذکر راسخ اور جو کیفیات جا گزیں ہوتی ہیں، طالب صادق پر اس کی مجلس میں ان انوار و کیفیات کا حسب استعداد اثر ہوتا ہے۔

طالب میں قلبی احساسات، پاکیزہ کیفیات پیدا ہوجاتی ہیں، شیخ کی ہم نشینی سے دنیائے ملعونہ سے نفرت اور آخرت کی رغبت، لوگوں سے کھچاوٹ، اعراض، اور حق کی طرف کشش اور میلان ہوتا ہے مگر یہ اثر صرف مجلس ہی تک محدود رہتا ہے، جہاں مجلس سے شیخ یا طالب الگ ہوا، یہ کیفیت جاتی رہی۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے! جیسے ایک عطر فروش ہے، وہ عطر حجرہ میں لایا، یا مکان پر پہنچا، اگر چہ اس نے پاس بیٹھنے والوں کو عطر نہیں لگایا، نہ کوئی شیشی دی، نہ پھایہ ہی دیا، تاہم جو لوگ اس کے پاس بیٹھیں گے، پاس بیٹھنے تک عطر کی خوشبو سے ان کے دماغ معطر و محفوظ ہوتے رہیں گے اور مجلس میں مہک پھیلتی رہے گی،

گواس کی مجلس میں کوئی شخص طبیعت مکدر اور منقبض لے کر آیا ہو۔ مثلاً کوئی شخص ریل سے اتر کر آیا دھویں وغیرہ سے طبیعت میں بے نشاطی لئے ہوئے یا بس میں پٹرول وغیرہ انجن کی بدبو سے دماغی کوفت کے ساتھ آیا مگر جوں ہی عطر فروش کے پاس پہنچا، خوشبو سے طبیعت میں نشاط فرحت پیدا ہو جائے گی مگر مجلس عطر فروش سے علیحدہ ہوتے ہی خوشبو دماغ سے نکل جائے گی اور جلد ہی اس کے اثرات زائل ہو جاویں گے، اس کی عمر اور اس کی بقاء نہ ہوگی۔

تو جیسے یہاں عطر فروش کو کچھ فعل ارادی وقصدی نہیں کرنا پڑا، محض غیر اختیاری طور پر ہم جلیس کے دماغ میں انعکاسات آ گئے تھے پھر جلدی ہی وہ تعطر نہیں رہا، تعطل ہو گیا، ایسے ہی شیخ کی مجلس میں طالب صادق وقتی اور آنی طور پر باطن شیخ کے انوار وکیفیات اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور مجلس سے علیحدگی ہوتے ہی جلدی یہ اثرات ختم بھی ہو جاتے ہیں، اس کو توجہ انعکاسی کہتے ہیں۔

توجہ القائی

دوسری توجہ القائی، القاء کے معنیٰ واقع کرنا، ڈالنا۔ شیخ نے طالب صادق کے متعلق ارادہ کیا کہ جو انوارِ ذکر وانوارِ تقویٰ میرے قلب میں ہیں، وہ اس کے قلب میں بھی آجائیں، چنانچہ شیخ کی اس توجہ اور قصد سے طالب کے دل میں محض انعکاسی طور پر نہیں، اور محض سرسری وخیالی نہیں بلکہ واقع طور پر ہو گئے، مگر چوں کہ یہ کسی فعلِ طالب وتوسلِ اسبابی سے نہیں بلکہ القاء سے یہ اثرات آئے، اس لیے اس صورت میں بھی بقاء اور کوئی خاص قوت نہیں، گو پہلے سے زیادہ ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے، جیسے کسی شخص کے یہاں چراغ روشن ہے — یہ اول تو استاذ سے سنی ہوئی پھر حضرت والاؒ کے ارشاد سے اس پر عجیب روشنی پڑ گئی تو — یہ چراغ والا خود اس دوسرے شخص کے چراغ کو روشن کر دیتا ہے، وہ چراغ لے کر

چلتا ہوا، مگر اس چراغ کی روشنی میں ایسی قوت نہیں کہ ہواؤں کے مقابلہ میں بھی باقی رہ سکے بلکہ ہلکا سا جھونکا بھی اس کو گل کر دے گا۔

ٹھیک اسی طرح شیخ کی اس توجہ القائی کا اثر ایسی قوت نہیں رکھتا کہ نفسانی وشیطانی اور دوست نما دشمنوں کے اغواء ات سے یہ نور نہ بجھ سکے، ایسا کمزور بھی نہیں جیسا توجہ انعکاسی کا اثر کمزور تھا، اس سے بہرحال قوی ہے، اس لیے یہ اثر اور نور صرف مجلس شیخ سے اٹھتے ہی ختم نہیں ہوگا، بلکہ دوسروں کی اثر اندازی سے ختم ہوگا۔

توجہ اصلاحی کا بیان

تیسری توجہ اصلاحی، وہ یہ ہے کہ شیخ ذکر کے انوار وکیفیات کو اس کے قلب میں راسخ کرنا اور جمانا چاہتا ہے مگر یہ دیکھتا ہے کہ فی الحال اس میں سہارا نہیں، لہٰذا پہلے اس کے قلب میں ان انوار وکیفیات کے بقاء وقیام کی معالجات وتدابیر ،طرقِ اصلاح سے صلاحیت واستعداد پیدا کرتا ہے۔

اس کو یوں سمجھئے کہ مثلاً کسی شخص کے یہاں ایک حوض ہے، وہ اس میں صاف شفاف پانی بھرنا چاہتا ہے، اب ظاہر ہے کہ کسی جگہ سے نالی کے ذریعہ پانی آئے گا لیکن صاف شفاف پانی کے لیے پہلے حوض کو، ریت، مٹی، میل، کچیل، کوڑا کرکٹ اور گندگیوں سے پاک کرنا بھی ضروری ہے، اس کو بھی صاف کیا جائے گا، تب کہیں حوض میں صاف وشفاف پانی آئے گا اور جمع ہوگا۔

ٹھیک اسی طریقے سے قلب کو اخلاق رذیلہ کی گندگیوں سے صاف کرنا ہوگا، معالجات وتدابیرِ مختلفہ سے اخلاقِ حسنہ وملکاتِ فاضلہ سے اس کے اندر صفائی پیدا ہو جائے ،اس بادہ پیمائی اور درستی وصفائی وشفافی سے اہلیت وصلاحیت وقابلیت کے حصول کے بعد شیخ اپنے انوارِ راسخہ کو اس پر واقع کرتا ہے، چوں کہ

اب محل میں انوار وکیفیات کے ضبط کی صلاحیت واہلیت پیدا ہوگئی، اب وہ انوار اس کے قلب میں روشن اور جگمگاتے ہیں، اب ان کو نہ مجلس سے اٹھنا ختم کرتا ہے، نہ شیاطین ودوست نما دشمن کے اغواءات ختم کرتے ہیں۔

اب قلب میں رچاؤ، رسوخ اور باہر کے مضر اثرات کی رکاوٹ پیدا ہوگئی، اگر کوئی خراب اثر آوے تو نور قوتِ مدافعہ ہے اور ایسا عمدہ قمقمہ ہے کہ دس قسم کے چراغ بھی اس کے سامنے مات ہوجائیں لیکن ان سے وہ نور کی قوت متأثر نہیں۔

جب معمولی نور بھی متأثر نہیں کرسکتا تو کسی ظلمانی چیز سے کیوں متأثر ہوسکتا ہے، جیسے صاف پانی کو ایک آدھ چیز خراب ومکدر نہیں کرتی، ہاں عرصہ تک کرکٹ آ کر جمتا رہے تو البتہ پانی مکدر ہوجائے گا، اسی طرح اس طالب نے اپنے نور کی حفاظت سے کسی وقت اگر اعراض کرلیا، جان جان کر مضر جگہوں پر پہنچا اور غفلت برتنا شروع کی تو نور میں خلل آجائے گا، مگر شیخ نے ایسی صلاحیت پیدا کردی ہے کہ اگر حفاظت رکھے گا تو وہ نور بڑھتا رہے گا۔

جیسے قابل، ذی استعداد طالب علم مطالعہ کرتا رہا تو اس کی قابلیت وعلمیت بڑھتی ہی رہے گی، اگر غفلت برتی اور عرصہ تک غافل رہا تو ایسا کرنے سے البتہ نقصان ہوگا پھر جب تیقظ کرے گا تو پھر ویسی ہی حالت ہوجائے گی، بلکہ ممکن ہے کہ پہلے سے بھی بڑھ جاوے کہ عبرت ہوگئی اور تجربہ کار ہوگیا کہ غفلت سے کیا نقصان ہوا، مگر یہ امتیاز واحساس استاذ کی برکت سے ہوا، ایسے ہی طالب کو نقصان کا احساس اور اپنی پہلی دوسری حالت کے مابین امتیازِ کمی بیشی شیخ کی بدولت ہوتا ہے، یہ توجہ اصلاحی کہلاتی ہے، اس میں پہلے تزکیۂ نفس اور تخلیۂ نفس پھر تحلیۂ قلب ہوتا ہے، اس کے بعد شیخ کی برکات وتوجہات اصلاحات سے بہ تدریج حصولِ انوار وکیفیات کا کمال پیدا ہوتا ہے، عامہ مشائخ کے یہاں یہی طریق معمول بہا ہے۔

توجہ اتحادی کا بیان

چوتھی توجہ اتحادی یہ ہے کہ شیخ اپنی روحانیت کے ساتھ اپنے حاضر باش کو اپنے سینے کے ساتھ تلبس کرتا ہے یا بلا اس کے اپنی روح کو اس کی روح کے ساتھ اتصال کر کے توجہ کرتا ہے اور اپنے اندر کی چیز بذریعۂ اتصال اس میں واقع کرتا ہے، اس میں سخت تعب ومشقت ہوتی ہے اور اس توجہ کا یہاں تک اثر ہوتا ہے کہ شیخ کی شکل وشباہت اور جسمانیت اس شخص میں آجاتی ہے۔

چنانچہ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے، یہ میں نے حضرت مولانا مدنی (۱) رحمۃ اللہ علیہ سے اور حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سنا ہے، یہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ تھے، نقشبندی سلسلہ کے بزرگ تھے، دہلی ان کا مزار ہے، میں ان کے مزار پر حاضر ہوا ہوں اور سرہند مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بھی حاضری

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ: ہندوستان کی معروف ومشہور شخصیت اور ہندوستانی مسلمانوں کے محسنِ اعظم ہیں کہ جنھوں نے جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لے کر تقسیم کے وقت جو حالات مسلمانوں پر آئے، اس میں آپ نے ان کی خوب مدد کی۔ آپ ایک جلیل القدر عالم، محدثِ عصر اور فقیہ الزمان تھے، ۱۹؍شوال ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ خاندانِ نبوت کے چشم وچراغ ہیں، حرمِ مدنی میں آپ نے ۱۸؍سال تک حدیث کا درس دیا ہے، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، صدرالمدرسین اور جمعیت علماء ہند کے سرخیل بھی رہ چکے تھے، جنگِ آزادی میں اپنے شیخ ومرشد حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ شانہ بشانہ شریک رہے اور مالٹا کی جیل میں اپنے استاذ کے ساتھ رہے اور وہاں آپ نے اپنے استاذ کی جو خدمت کی ہے، وہ ایک معروف ومشہور واقعہ ہے، اس کے علاوہ بھی آپ متعدد بار قید خانے جاچکے ہیں۔ جنگِ آزادی کے بعد سیاست سے یکسوئی حاصل کر کے فرقِ باطلہ کی تردید میں مشغول ہوئے۔ آپ کے تصنیفی کارناموں میں نقشِ حیات، مکتوبات، الشہاب الثاقب مشہور کتابیں ہیں، ۱۲؍جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء کو آپ کی وفات واقع ہوئی، مزارِ قاسمی میں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے برابر میں مدفون ہیں۔ رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ۔

کا اتفاق ہوا ہے۔

تو حضرت باقی باللہؒ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے یہاں ایک مہمان آئے لیکن ان کے یہاں اس دن فاقہ تھا، اب مہمان کی میزبانی کی فکر تھی کہ ایک نان بائی جو حضرت کی خدمت میں آمد و رفت رکھتا تھا، اس نے یہ احساس کیا اور حضرت سے کھانا لانے کی اجازت طلب کر کے گرم گرم کھانے لے آیا، حضرت اس سے بہت خوش ہوئے اور جوش میں فرمایا کہ تم نے ہمارا دل خوش کیا؛ اس لیے ہم اس کا صلہ دینا چاہتے ہیں، مانگو! کیا مانگتے ہو؟ اس نے کہا جو مانگوں گا، آپ دیں گے نہیں، فرمایا کہ نہیں، تم مانگو! جو مانگو گے، دیں گے، اسی طرح تین مرتبہ کہا، اس نے کہا کہ مجھے اپنے جیسا بنا دو!، فرمایا تم نے سخت سوال کیا۔

اس نے کہا میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ آپ نہیں دیں گے، فرمایا: یہ بات نہیں بلکہ تمھاری حیثیت سے یہ باہر ہے، اس نے کہا بس میں تو یہی چاہتا ہوں، اس پر حضرت انھیں ایک حجرے میں لے گئے اور سامنے بٹھا کر ان پر توجہ فرمائی، پھر باہر نکلے تو حاضرین کا بیان ہے کہ جسمانیت و شکل شباہت بھی اس شخص کی حضرت جیسی ہو گئی تھی، حتّٰی کہ حاضرین امتیاز نہیں کر سکے کہ حضرت باقی باللہ یہ ہیں، یا وہ ہیں۔

اگر پہچانا تو اس بات سے کہ وہ بے قابو تھے اور حضرت با تمکین تھے، اس سے ہم نے پہچانا کہ حضرت یہ ہیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ گرا اور روح پرواز کر گئی، اس پر اس زمانے کے بعض بزرگوں نے اعتراض کیا کہ شیخ کو اس کے قتل کا گناہ ہوا، شیخ کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا لیکن جواب یہ ہے کہ حضرت شیخ نے تو پہلے ہی اس کو اس سے منع فرما دیا تھا، وہ ہی نہیں مانا، اور حضرت وعدہ فرما چکے تھے، ادھر یہ بھی منکشف نہ تھا کہ وہ ختم ہی ہو جاوے گا؛ اس لیے قتل کا گناہ نہیں ہوا۔

یہ طریق توجہ اتحادی متقدمین میں تھا لیکن خال خال تھا، عمومی طریق متقدمین ومتأخرین کے یہاں توجہ اصلاحی کا ہے۔

طالب صادق کے لیے جب یہ توجہ کی اقسام معلوم ہوگئیں، تو اب سمجھئے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبرئیلؑ ایک خاص قوت دے کر بھیجے گئے تھے، اور ان کا یہ اخذ وتغطیہ بہ جسمِ غیر عنصری طبعی توجہ اتحادی ہے، اور چوں کہ حضور ﷺ کے ساتھ اس توجہ کا معاملہ تدریجاً ہے کہ پہلے کچھ ریاضت مجاہدات کیے اور وحیٔ حقی منامی سے بھی فارغ ہو چکے، اس پر بھی پہلی دوسری مرتبہ نہیں بلکہ مراحلِ کثیرہ کے بعد یہ توجہ کررہے ہیں، اس لیے آپ ﷺ اس خاص قوت کو سہار جاتے ہیں اور ان توجہات کے ساتھ انوارِ اربعہ جامع طریق سے آپ ﷺ پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اب جو تکان مجاہدات وعبادت وخلوت گزینی سے آپ ﷺ کو ہو گیا تھا وہ سب ختم ہو گیا، موانع مرتفع ہو چکے، لہٰذا چوتھی مرتبہ جبرئیلؑ کے کہنے پر آپ قرآت فرما دیتے ہیں اور مثل سابق اب کوئی عذر نہیں فرماتے، یہ تیسری تقریر تھی (۱)۔

تقریر حضرت شیخ الہندؒ

چوتھی تقریر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، اس کا کچھ معمولی سا حصہ عرض کروں گا، یہ تقریر حضرت کی نقلاً بعد نقلٍ چلی آتی ہے، فرماتے ہیں کہ اس وقت حضور ﷺ پر عبدیت کا غلبہ تھا، انوارِ اربعہ یعنی نورِ عربیت، نورِ نبوت، نورِ اجتہادیت، نورِ خاتمیتِ نبوت کی قوت مستور تھی، آپ ﷺ کے اندر جامع الخلائق یعنی جامعیت جن وانس اور جامع الانبیاء ہونے کی شان مغلوب ہے، یہ غلبۂ عبدیت آپ ﷺ اپنے کو اس لائق نہیں پا رہے ہیں کہ قرآت، تلفظ لسانی بھی فرما سکیں اور اس

(۱) تقریر بخاری شریف از حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ ۱/ ۸۵، ۸۶۔

باراِمانت کا اپنے کو اہل نہیں سمجھ رہے ہیں، جبرئیلؑ سامنے آتے ہیں اور بار بار آپ ﷺ کا مرتبہ پہچانوانا چاہتے ہیں تو ہر مرتبہ کچھ تخفیف گو ہو جاتی ہے مگر انوارِ اربعہ متجلیٰ نہیں ہوتے، حتی کہ چار مرتبہ جبرئیلؑ معنوی آئینہ پیش فرماتے ہیں مگر اپنی قوت آپ ﷺ پر ظاہر نہیں ہوتی، رفتہ رفتہ آخری مرتبہ یہ غلبہ ہٹ گیا، اب وہ آئینہ دیکھا تو آپ پر آپ کے مقامات من جانب اللہ متجلیٰ ہو گئے حتیٰ کہ مقامِ معراج بھی تجلی فرما ہو گیا، آپ نے بے ساختہ قرأت فرمادی۔

اور جب کسی پر اس کا مقام منکشف ہو جاتا ہے تو پھر اس کی ایسی حالت ہوتی ہے جیسا کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شیر کا بچہ کسی نے پالا، وہ بکریوں کے اندر رہتا اور بکریوں ہی کی طرح بہ صوتِ خفیف بولتا تھا، ایک دفعہ وہ جنگل میں کسی دریا پر پانی پینے چلا گیا تو اپنا عکس پانی میں نظر آیا تو سمجھا کہ میں تو بکری نہیں ہوں، میرا جسم سر اور چہرہ تو کچھ اور کہہ رہا ہے، چنانچہ وہ وہیں سے شیر کی طرح غرایا اور بکریوں پر حملہ کر دیا۔

تو جیسے اپنا عکس پانی میں دیکھ کر اس شیر کے بچے پر اپنی حقیقت اور قوت منکشف ہو گئی، اسی طرح حضرت جبرئیلؑ کی ذات مانند آئینہ سامنے آتی ہے تو آپ ﷺ پر اپنی تمام قوت منکشف ومستحضر ہو جاتی ہے اور گویا اب آپ ﷺ بہ زبانِ حال فرماتے ہیں کہ اب میں سمجھا کہ میرے اندر کیا قوت ودیعت ہے تو اے جبرئیل! اب ذرا پڑھ کر دکھاؤ تو میں بھی پڑھوں گا، چنانچہ اب جبرئیل علیہ السلام نے صرف لفظ اقرأ نہیں کہا بلکہ پانچ آیتیں پڑھیں: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿١﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿٢﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿٣﴾﴾ [العلق]۔

تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ذات باری نے جبرئیلؑ کو آئینہ بنا کر بھیجا تھا کہ آپ پر اپنی قوت منکشف ہو کر مغلوبیت کا اثر آپ سے دور ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوت پہچان لی تو مغلوبیت دفع ہو گئی، اس سے معلوم

ہوا کہ اخذ وتغطیہ سے جبرئیلؑ کی معلمیت وافضلیت لازم نہیں آتی، جیسا کہ میری اس تقریر سے معلوم ہو گیا۔

شبہ افضلیت و معلمّیت جبرئیلؑ کے جوابات

پھر بھی اگر کوئی کہے کہ اس سے تو فضیلت جبرئیلؑ لازم آتی ہے، تو جواب یہ ہے کہ جبرئیلؑ نے یہ قصد وارادہ نہیں کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اندر میرے اس فعل سے صلاحیت اور قوت پڑھنے کی پیدا ہو جائے بلکہ خود بہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے ہونے اور ملاصق ہونے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اپنی ودیعت شدہ قوت منکشف ہو گئی تو یہ خاصیت حضرت جبرئیلؑ کی جبلی وفطری ہے، ارادی اور اختیاری نہیں، پس نہ یہاں تعلیم ہے، نہ تربیت، کچھ بھی نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے جبرئیلؑ کے ارادہ وقصد کا دخل فرض بھی کرلیں تب بھی حضرت جبرئیلؑ کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، چوں کہ یہ قوت جبرئیلؑ کی جزوی فضیلت ہے اور جزوی فضیلت کلی فضیلت پر فائق نہیں ہوتی، جیسے مثلاً کسی میاں جی کو قاعدہ پڑھانے میں ملکہ ومہارت تامہ حاصل ہے اور امام بخاریؒ کو بہ ایں فضل وکمال یہ ملکہ ومہارت قاعدہ پڑھانے کی حاصل نہیں، لیکن بایں ہمہ امام بخاریؒ سے ان کا افضل ہونا لازم نہیں آتا۔

امی محض کو قرآت کا مکلف بنانے کا شبہ اور اس کا جواب

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کا امی محض سے اقرأ کہنا اور اس کو پڑھنے کا مکلف بنانا تکلیف مالا یطاق ہے، جس کی شریعت میں گنجائش نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری میں حدیث مرسل ہے کہ ایک ریشمی ٹکڑے پر یہ لکھا ہوا تھا اس کو سامنے کر کے کہا جا رہا ہے کہ اس کو پڑھئے گویا یوں کہا جا رہا

ہے کہ اقرأ ما کتب فی ھذا الدیباج ، جیسے بچہ نادان کو بھی اسی طرح پڑھایا جاتا ہے(۱)۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ امر تلقینی ہے نہ کہ تکلیفی ،جس کا حاصل یہ ہے کہ جو میں پڑھتا جاؤں، اس کو آپ بھی پڑھیں، جیسے بچہ کو اول اول استاذ کہتا ہے کہ پڑھ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ تکلیف مالایطاق ہے تو یہ عقلاً محذور ہے، شرعاً نہیں، چوں کہ ابھی تعلیمات شرعیہ قائم نہیں ہوئیں اور اشاعرہ کے یہاں حسن وقبح شرعی ہے، نہ کہ عقلی (۲)۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ تکلیف مالایطاق نہیں ، اس لیے کہ فی الفور کے لیے امر نہیں تھا بلکہ زمانۂ آئندہ کے لیے کہا جارہا ہے،آئندہ زمانہ میں پڑھیں۔

یہ چودھویں اور پندرھویں بحث تھی جو اخذ وتغطیہ فرمانے اور تین مرتبہ اقرأ فرمانے پر مَا أَنَا بِقَارِئٍ کہہ کر عذر فرمانے سے متعلق تھیں۔

سولہویں بحث

اب سولہویں بحث الجھد کے متعلق ہے کہ یہ مرفوع بھی ہوسکتا ہے، منصوب بھی ہوسکتا ہے اور بفتح الجیم بھی ہوسکتا ہے اور بضم الجیم بھی، مجھ کو مشقت پہنچی وتعب ہوا، یا جبرئیل کو مجھ سے تعب پہنچی ،یعنی وہ بھی تھک گئے،محنت پڑ گئی۔

ایک عجیب سوال اور اس کا جواب

اس پر شبہ ہوگا کہ نورانی فرشتہ ہزاروں بڑے بڑے شہروں کو آسمان تک اُٹھا کر پلٹ دے، اس وقت تو تھکے نہیں، اور اب ذرا سی بات میں وہ کیسے تھک

(۱) فتح الباری، ۱۲/ ۴۱۲.
(۲) تفسیر القرطبی، ۳ص ۴۳۰.

گئے، خوب سمجھے، مصر وغیرہ میں عربی ادب والے پڑھنے والے اس پر فخر کریں گے اور درس نظامی والوں پر ہنسیں گے۔

لیکن جواب دیا جائے گا کہ خواہ کیسے ہی ادب عربی میں آپ قابل ہو گئے، لیکن بخاری آپ سمجھ نہیں سکتے، عربی ادب والوں کو فضیلت جزوی ہے لیکن درس نظامی والوں کو کلی فضیلت ان کے اوپر حاصل ہے، نیز یہ درس نظامی والوں کا احسان ہے کہ ایک چیز آپ کے لیے چھوڑ دی، اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد مظہر صاحب (۱) رحمۃ اللہ علیہ بانی مظاہر علوم اس کی تاکید بھی فرما گئے کہ ادب کو مقصود نہ بنایا جائے۔

خیر اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اپنی اصلیت کو چھوڑ کر جب کوئی دوسرے کی اصلیت اختیار کرتا ہے تو اختیار کردہ کے آثار وخواص ولوازم آجاتے ہیں، اور اپنی اصلیت کے آثار ختم ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے حضرت شاہ اہل اللہ صاحبؒ (حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بھائی) نے سانپ کو کوٹ دیا اور پھر وہ ملک الجن کے یہاں بلائے گئے، مقدمہ ان کے خلاف دائر کر دیا گیا تھا کہ ایک جن نے اپنے قاضی کے یہاں کہہ دیا تھا کہ

(۱) مولانا محمد مظہر صاحبؒ: آپ کا تعارف یہ ہے: مولانا محمد مظہر صاحبؒ بن حافظ لطف علی بن حافظ محمد حسن۔ ۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے، دہلی میں حضرت مولانا مملوک علیؒ، شیخ صدرالدین، شیخ رشیدالدین وغیرہ سے علوم دین حاصل کیے اور حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ آپ مظاہرِ علوم سہارنپور کے بانیان میں سے ہیں اور مدرسِ اول بھی ہیں، یہاں آپ نے علوم آلیہ وعالیہ کی بیشتر درسی کتب کے علاوہ بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ تقریباً سبھی کتبِ احادیث پڑھائیں۔ مدرسہ کی تعلیم کا معیار بلند کرنے میں آپ کا بہت بڑا کردار ہے، آپ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے اور ان کی طرف سے خلافت بھی ملی، حالاں کہ آپ عمر میں ان سے بڑے تھے، یہی بات آپ کے اخلاص اور اعلی درجہ کے تواضع کی بین دلیل ہے۔ بہ روز شنبہ ۲۱/۳ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ (علمائے مظاہر علوم سہارنپور اور ان کی علمی وتصنیفی خدمات ص ۴۵)

میرا بیٹا اس نے قتل کر دیا، ہمیں قصاص دلوانا چاہیئے، جب ان سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ میں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا، تب اس جن نے کہا کہ وہ سانپ کا بچہ جو آپ نے مارا ہے، وہ میرا لڑکا تھا، آپ نے اقرار کیا کہ ہاں سانپ کا بچہ تو میں نے مارا ہے لیکن تم مجھ سے قصاص نہیں لے سکتے، کیوں کہ حدیث میں آتا ہے کہ جس کسی نے اپنی ہیئت بدل دی، اگر اس کو کوئی شخص غلط فہمی سے مار ڈالے تو اس مارنے والے سے قصاص یا خون بہا نہیں لے سکتے، جناتوں کے بادشاہ نے اس جن سے جو اس کے دائیں جانب بیٹھا تھا، پوچھا: کیا یہ حدیث سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے؟، اس نے کہا: **سمعت رسول الله ﷺ يقول من قتل في غير زيّه فدمه هدر** (۱)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان سے کہا : **هل سمعت رسول الله ﷺ كذا و كذا ؟**، اس نے کہا ہاں!، اس کے علاوہ پھر اور حدیثیں ان سے ان کی صحابیت کے باعث علو سند کے لیے سنیں اور پھر وہاں سے لوٹ کر ان سب احادیث کو جمع کیا اور ایک رسالہ احادیث جنّیہ میں لکھا، ٹھیک اس جن کے سانپ کی شکل میں آنے کی طرح حضرت جبرئیلؑ بھی اپنے آثار وخواص چھوڑ کر بشری لوازم وخواص جسمانیہ کے ساتھ آئے تھے، لہٰذا بشریت کے آثار کے باعث مشقت وتھکن محسوس ہوئی، اس لیے ان کی طرف جہد کی نسبت صحیح ہے کہ ان کو مشقت پہنچی۔

حضرت شاہ اہل اللہؒ کا صحابی جن سے ملاقات کرنا پھر بھی تابعی نہ ہونا

اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ حضرت شاہ اہل اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب جن صحابی کو دیکھ لیا اور ایمان کی حالت میں دیکھا اور ایمان ہی پر قائم رہے تو تابعی ہونا صادق

(۱) ملفوظاتِ محدث کشمیریؒ، ص ۳۴۳، ۳۴۴۔

آ گیا، سو کیا حضرت شاہ اہل اللہؒ تابعی ہوگئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تابعی ہونا زمانۂ تابعیت کے ساتھ خاص تھا، اس لیے شاہ اہل اللہؒ تابعی نہیں ہوئے، چوں کہ زمانۂ تابعیت بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔

سترہویں بحث

اب یہاں پر یہ سوال اور بحث آجاتی ہے کہ ان پانچ آیات کے ساتھ ابتدائے وحی کیوں ہوئی؟ نیز ان آیات کو بدایتِ وحی کیوں شمار کیا جاتا ہے؟ جب کہ دوسری روایات اس کے خلاف ہیں، چنانچہ علامہ زمخشریؒ نے نقل کیا ہے أَكْثَرُ الْمُفَسِّرِينَ عَلَى أَنَّ الْفَاتِحَةَ أَوَّلُ مَا نَزَلَ (۱) کہ اکثر مفسرین کے نزدیک سورۂ فاتحہ سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت ہے اور حضرت جابرؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ مدثر سب سے پہلے نازل ہو (۲)، تو ابتدائے وحی میں روایات متضاد ہیں، اور اجتماع ضدین عامۃ الناس کے کلام میں بھی پسند نہیں پھر احادیث میں کیوں کر گوارا کیا جائے۔

آپ کے لیے اس کا جواب مشکل نہیں ہے، کیوں کہ جانتے ہیں کہ ابتدا کی تین قسمیں ہیں : حقیقی، اضافی، عرفی، پس یہاں یہ پانچ آیتیں ابتدائے حقیقی پر محمول ہیں، اور باقی اضافی وعرفی ہیں، یہ تطبیق شرح تہذیب کے طرز پر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے یہ کہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے : تبدل حیثیات سے حکم بدل جاتا ہے (۳)، سورہ فاتحہ کا نزول اولی ہے ایک حیثیت سے اور دوسری آیات کا اوَّلی نزول ہے دوسری حیثیات سے۔

---

(۱) تفسیر الکشاف، ۴/۷۷۵، تفسیر سورۃ العلق.

(۲) صحیح البخاری، ۲/۷۳۲، کتاب التفسیر، بَابُ {وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ} [المدثر : ۵] رقم الحدیث : ۴۹۲۵.

(۳) أَمَّا إِذَا تَعَلَّقَ حُكْمُ الشَّرْعِ بِهَذَا الذَّاتِ مِنْ حَيْثُ الِاعْتِبَارِ فَإِذَا تَبَدَّلَ الِاعْتِبَارُ تَبَدَّلَ هَذَا الْمَجْمُوعُ. (شرح التلويح على التوضيح للتفتازانی، ۱/۳۲۴)

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک درجہ قرآت اور تعلیم کا ہوتا ہے اور ایک مناجات وعبادات کا ، ایک تعلیم احکام کا، پس فاتحہ کا نزول اوّلی من حیث المناجات والعبادات ہے اور سورۂ مدثر کا نزول احکام کے اعتبار سے اول ہے، اوران پانچ آیتوں میں تعلیم قرآت کی حیثیت سے اوّلیت ہے، اول چیز قرآت کی تعلیم وتعلم ہے، اس کے بعد حمد وثنا نازل ہوئی ہے پھر احکام نازل ہوئے ہیں، تو ان حیثیات سے ہر ایک کا نزول اوّلی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نزول دو طرح ہوا، ایک تو یہ کہ اول فجائی نزول ہوا، اس کے بعد پھر نزول ختم ہو گیا، پھر کچھ عرصہ بعد نزول شروع ہوا، اور مسلسل پے در پے ہوتا چلا گیا، تو اس حیثیت سے کہ سورہ مدثر کچھ عرصہ کے بعد نازل ہوئی، گویا ایک نیا نزول شروع ہوا، اس لیے یہ بھی اس اعتبارِ خاص سے نزول اوّلی کی حامل ہوئی۔

الغرض ان تینوں روایات میں کسی قسم کا تعارض نہیں، ہر ایک کا اعتبارِ خاص سے نزول اولی ہے مگر ان پانچ آیات کو اولیت حقیقیہ حاصل ہے (۱) ، ان پانچ آیات میں قرآت وتعلیم بتلانا ہے کہ آپ ﷺ حالت نومی سے انقطاع عالم کے ساتھ غار حراء میں عبادت کی طرف آئے ہیں، اور خوب عبادات ومجاہدات، چلہ کشی ،مناجات، ذکر اسمائے الٰہی سب ہی کچھ کرتے ہیں مگر گوشہ نشینی، ذکر وغیرہ معتد بہ نافع نہیں ، اس میں امت کے لیے تعلیم ہے کہ جہل کے ساتھ ریاضت ومجاہدہ تمہارے لیے معتد بہ نافع نہیں، بلکہ اندیشہ ضرر ہے؛ اس لیے محض اپنے شوق سے کیفیات والی چیزوں کو لینا بدون علم سے بہرہ ور ہوئے ٹھیک نہیں کہ دیکھو! ہم اپنی خاص مخلوق کو جو کہ ہمارے خاص بندے ہیں اور خاص ہمارے ہی لیے

(۱) المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج للنووي، ۸۹/۱، كتاب الإيمان، باب بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ.

باخلاصِ تام انقطاع عالم کے ساتھ خاص طور سے ہماری طرف متوجہ ہیں، اس ذات گرامی (ﷺ) کو بہ ایں اوصاف مکلف کیا جارہا ہے کہ اقرأ: پڑھئے! تو تم تو اس کے درجے کو کہاں پہنچ سکتے ہو؟، لہٰذا بطریق اولیٰ اس بات کے مُکلف ہو کہ تعلیم حاصل کرو۔

قبول عبادت کی دو شرطیں

کسی عبادت کے قبول ہونے کی دو شرطیں ہیں: ایک اخلاص، دوسرے شرع (یعنی حکم الٰہی) کے مطابق ہونا، ان دونوں میں سے اگر کسی ایک کا بھی انعدام اور فقدان ہوگا تو وہ کام، وہ عبادت قبول نہیں ہوگی، تو ان آیات میں عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص، اقتضاء النص، وجوہ اربعہ سے بندگانِ خدا کو علم وحی کی طرف اہمیت کے ساتھ متوجہ کیا جارہا ہے کہ اس کے حاصل کرنے کا اہتمام کیا جاوے۔

الغرض وطیرۂ قرأت کی تعلیم کے لیے اقرأ کے ساتھ ابتداء فرمائی، معلوم ہوا کہ جہالت کے ساتھ مجاہدات، ریاضات، عباداتِ محضہ درجۂ قرب وقبولیت کے لیے کفایت نہیں کرتے بلکہ لایعبأبہ میں سے ہیں، اسی لیے تحصیل علم بقدرِ ضرورت ہر مسلمان کے ذمے فرض ہے، ہر مسلمان اس کا مکلف ہے اور بقدرِ ضرورت علم دین کا تارک مرتکب کبیرہ ہے، اور یہ عرفی طریقۂ تعلیم پر موقوف نہیں بلکہ کسی محقق سے پوچھ پوچھ کر یا سن سن کر ہو یا کسی معتبر کتاب سے پڑھ کر ہو، اگرچہ وہ اردو ہی کی کتاب احکام شرع سے متعلق ہو، بہر حال بقدرِ ضرورت علم دین حاصل کرنا فرض ہے۔

اب یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۞ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۞ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۞﴾ ان لفظوں کے ساتھ کیوں شروع فرمایا، دوسرے الفاظ بھی تو تھے، اس میں کیا مصلحت ہے؟۔

جواب یہ ہے کہ چوں کہ حضرت جبرئیلؑ بار بار اقرأ فرماتے ہیں، اور حضور

ﷺ مَا أَنَا بِقَارِئٍ فرمار ہے ہیں، تو آپ کو خلجان اور نا امیدی ہو رہی ہے، مستبعد خیال فرمار ہے ہیں، اس لیے آپ استبعاد کو رفع فرمانے کے لیے یہ الفاظ لائے کہ آپ کی حالت کا تقاضا ان ہی آیات کے ہبط ونزول کا تھا، جن کا حاصل یہ ہے کہ تم قرأت کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو؟ مستبعد خیال نہ کرو، نہ یہ سمجھو کہ میں قرأت پر قادر نہیں ہوں کہ اس اقرأ کے اندر جو مفہومی، لفظی، لسانی، حفظی، منتہائے علوم پر پہنچنا اور تبلیغ آپ کو بیک وقت مستحضر ہو کر مستبعد اور مشکل معلوم ہوتا ہے، یہ کوئی چیز نہیں، آپ تو اپنے پروردگار کی طرف نظر فرمائیے، جو ہر قسم کی پرورش اور تربیت کا مالک اور پوری طرح قادر ہے، تو جب اللہ رب العالمین کی امداد ساتھ ہو تو پھر مشکل بھی مستبعد نہیں رہتا(۱)؛ اس لیے اِقْرَا کے بعد بِاسْمِ رَبِّكَ فرمایا۔

آپ ﷺ چوں کہ اہل لسان اور افصح الفصحاء اور ابلغ البلغاء ہیں، اس لیے ان الفاظ کو سنتے اور دیکھتے ہی فوراً سمجھ گئے کہ اللہ پر نظر اور ان سے استعانت کے ساتھ بالکل آسان ہے، باسم کی با استعانت واستمداد کے لیے ہے۔

معلوم ہوا کہ مربی کی طرف توجہ اور اس پر اعتماد ہو تو سالک کے لیے مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے اور ہر قسم کے خلجان اور الجھن سے نجات ہو جاتی ہے اور کامیابی آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔

بِاسْمِ رَبِّكَ میں یہ بات رکھی ہوئی کہ جس ذات نے آپ ﷺ کو اس درجے تک پہنچانے میں مدد کی ہے، وہ اب بھی موجود ہے، لہٰذا وہ آپ ﷺ کو کمال منتظر تک پہنچانے کے لیے کافی ہے، اس لیے بجائے لفظ اللہ کے رب کا لفظ اختیار فرمایا، جس میں اشارہ ہے کہ جس ذات نے رحم مادر سے تربیت اور پرورش فرماتے فرماتے آپ ﷺ کو اس حد تک پہنچا دیا، وہی آپ ﷺ کو مقاصد اربعہ تک پہنچا نے والے ہیں جس کے لیے لفظ الْأَكْرَمُ دلیل ہے۔

---

(۱) فتح الباری، ۱/۳۰.

اٹھارہویں بحث

یہاں بظاہر لفظ **اسم** زیادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن غور کرنے سے حقیقت منکشف ہوجاتی ہے، چنانچہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "با" چوں کہ مختلف معانی کے لیے مستعمل ہوتی ہے، ان میں سے قسم کے لیے ہونا بھی ہے، یہاں اس احتمال کو رفع کرنا ملحوظ ہے، اگر رب پر باء داخل ہوتی تو قسم کے معنیٰ مفہوم ہوتے جیسے **برب الکعبة** میں رب پر باء قسم کے لیے ہوتی ہے لیکن اس کو دوسرے حضرات نے پسند نہیں فرمایا، چوں کہ باء کے قسمیہ ہونے کا احتمال تو جب ہوتا ہے کہ محل بھی اس کی گنجائش رکھتا ہو، اور یہاں موضع قرأت ہے جو کہ قسم کا موقع ومحل نہیں ہوتا۔

اس لیے اس سوال یا اشکال کا دوسرا جواب یہ ہے، اور یہ بہت ہی غور سے سننے وسمجھنے کے قابل ہے۔

بات یہ ہے کہ انسان مخلوق ہے اور حق تعالیٰ خالق ہیں، اور دونوں میں یعنی خالق ومخلوق کے درمیان مناسبت اور ربط کا ہونا ضروری ہے اور یہاں خالق اور مخلوق کے درمیان مناسبت نظر نہیں آتی ، چوں کہ خالقِ برتر وجوب وقدم کی شان سے متصف ہیں، اور مخلوق امکان وحدوث اس کی ضد سے متصف ہے، تو وہ واجب، یہ ممکن، وہ قدیم، یہ حادث، دونوں کے درمیان کوئی تناسب وتوافق نہیں بلکہ تضاد اور تباین ہے، ربط ومناسبت مفقود ومعدوم ہے، اور مابین الخالق والمخلوق ربط کا ہونا ضروری ہے، اور یہاں براہ راست نہیں تو ضرورت پیش آئی کہ درمیان میں کوئی واسطہ اور ذریعہ ووسیلہ ہو، تاکہ مخلوق خالق سے فیض حاصل کر سکے، اس کے بغیر اکتساب فیض ممکن نہیں۔

سو وہ وسیلہ اور ذریعہ اس لیے ضروری تھا کہ ذات خالق اور مخلوق کے

درمیان کوئی واسطہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے مخلوق کو خالق کا فیض پہنچ سکے، مخلوق محروم فیض اور مبغوض نہ رہ جائے۔

پس صورت یہ ہوئی کہ اس ذات پاک واجب الوجود قدیم بالذات کے لیے کچھ صفات وکمالات ہیں، اوران صفات کے لیے اسماء ہیں، یہ اسماء صدور فیض من الحق الی الخلق کاواسطہ ہیں۔

اسمائے الٰہیہ مخلوق کے لیے ذریعۂ حصولِ فیضِ خالق ہیں

تومن حیث الافاضة والاستفاضة یہ اسماء واسطہ ہیں، اس طرح کہ ذات کی تاثیر صفات میں اور صفات کی اسماء میں ہوتی ہے، اسمائے الٰہیہ مخلوق کے لیے مصدرِ تاثیرات ہیں، جیسے انسان کا جسم جوارح واعضاء میں مؤثر ہوتا ہے، اور اعضاء مصدرِ اعمال ہوتے ہیں، اور مقصد انسان سے اعمال ہیں، ان اعمال کے صدور کے لیے واسطہ اعضاء ہیں، مگر بغیر صدور اعمال واسطہ ہونا نہیں ہوسکتا، اور جس طرح اعمال وجوارح محسوس ومبصر ہوتے ہیں مگر ان کا تعلق جو باطن سے ہوتا ہے، وہ نظر نہیں آتا اور محل تعلق دو چیزیں ہیں: اخلاق اور روح۔ صدور اعمال محتاج الی الاخلاق والصفات ہے اور اخلاق وصفات محتاج الی الروح ہیں۔

ان صفات واخلاق کے بغیر افعال کا صدور اتم واکمل نہیں ہوگا، اس لیے غیر مہذب الاخلاق کے اعمال کا اعتبار نہیں، اس کے افعال غیر معتبر ہیں، چوں کہ مصدرِ اعمال محکم نہیں، جب منبع ومصدر ہی ٹھیک اور قوی مستحکم نہیں تو اعمال کا بھی قوت وحسن میں اعتبار نہیں۔

چنانچہ دیکھ لیجئے کہ انسان کے تین دشمن ہیں: نفس وشیطان وکافر۔ ان تینوں کا مقابلہ متعلق بالجوارح ہے، مثلاً کوئی جہاد کرتا ہے تو یہ صفت شجاعت اور صبر کا محتاج

ہے، اس کے بغیر ممکن نہیں، اگر ہوا بھی تو کمزوری اور ضعف کے ساتھ ہوگا، اور کمزور وضعف چیز کاٴن لم یکُن ہوتی ہے، تو محض جوارح سے یہ عمل جہاد اور دشمنان دین سے مقابلہ کمزور اور غیر معتد بہ وغیر معتبر ہوگا، اگر کسی جذبے سے کیا بھی تو ثبات واستقلال نہ ہوگا، چوں کہ دلی شجاعت نہیں اور صبر جو صفتِ حسن ہے، وہ نہیں، جرأت وملکہ ومہارت جو ایک باطنی صفت اور روحِ اعمال واستقلال ہے، وہ نہیں۔

تو جہاد کا صدور اعضاء سے اور اعمال واعضاء کا تعلق ایک باطنی وصف اور صفت سے ہے، وہ صفت ہی روح اعمال ہے جو روح انسانی سے وابستہ ہے، تو اعمال اور روحِ انسانی کے درمیان واسطہ ایک صفت اور کمال باطنی کا ہونا ثابت ہو گیا۔

یہاں سے یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا کہ انسان صرف ایک جسدِ محض اور فقط صورتِ مادیہ اور ڈھانچہ کا نام نہیں بلکہ روح انسانی حقیقتِ انسان ہے، اور روحِ انسانی وجودِ خلائق وصفات کو مقتضی ہوتی ہے۔

تو انسان فی الحقیقت وہ ہے جو صاحب اخلاق وصفاتِ کمال بہ ملکات فاضلہ ہو، من جملہ ان کے ایک انسانی ہمدردی بھی ہے، جس کی ایک صورت حاجت مند کی حاجت روائی کرنا بھی ہے، اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بدوں سوال حاجت روائی ہو، جو ظاہری عمل کا مبنیٰ اور عمل باطنی ہے تو واسطۂ عمل یہ صفت ہوئی، معلوم ہوا کہ انسان کے افعال واعمال کے صدور کا واسطہ صفات ہیں۔

ٹھیک اسی طرح مخلوق وخالق کے درمیان واسطۂ صفات ہونا چاہئے تھا، مگر حق تعالیٰ کی صفات کا معاملہ انسانی مخلوق کے صفات کی طرح نہیں کہ انسان سے اس کی صفات کا انفکاک ہوجاتا ہے اور حق تعالیٰ سے انفکاک ممکن نہیں، تو گویا ذات وصفات الگ الگ چیزیں نہیں اور واسطہ کے لیے فی الجملہ غیریت لازم ہے، اس لیے صفات الٰہیہ واسطہ ہونے کے بہ جائے اسمائے صفات واسطہ ہوئے۔

اسمائے الٰہیہ کا اثر

اور خالق کا نام تو خالق کا ہے جو کہ نہایت اعلیٰ ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ مخلوق کے نام بھی اثرات رکھتے ہیں، دیکھئے! ہمارے محاورے میں کہا جاتا ہے کہ آپ کا نام لینے ہی سے کام بن جاتا ہے، سفارش کے لیے آپ کے جانے یا لکھنے کی ضرورت نہیں، اور کہہ دیا جاتا ہے : جاؤ! فلاں سے ہمارا نام لے کر کہہ دینا، یا یوں کہہ دینا کہ تمہارا سلام اور ہمارا نام بس اتنا کافی ہے، اس نے کہا بہت اچھا، چلا گیا پھر واپس آکر اطلاع دیتا ہے کہ صاحب آپ کا نام لے دینے ہی سے کام ہو گیا۔

تو جب مخلوق کے نام کا یہ اثر ہے تو خالق تو پھر خالق ہی ہے، اس کے ناموں میں تو کیوں نہیں! ضرور آثار ہوں گے اور کس قدر ہوں گے، یہ احاطہ بیان سے باہر ہے۔

اس لیے حق تعالیٰ کے کلام میں ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ'' ارشاد ہوا کہ نام لے کر شروع فرما دیجئے! بس وہ آپ ﷺ کو کمال منتظر تک پہنچا دیں گے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلمکو یہ قرأت اپنی ذات کی طرف نظر کر کے اور اپنی عبدیت کو دیکھ کر ہی تو مستبعد معلوم ہوتی ہے۔

آپ اپنے رب کی طرف تو نظر فرمائیے کہ جس نے معدوم کو موجود کر دیا، تو وجود کے بعد صفتِ قرأت دینے پر کیسے قادر نہیں ہوگا؟ تو اسم خالق سے آپ کو مخلوق اور معدوم سے موجود کیا، اور اسم رب سے ربوبیت اور تربیت فرمائی تو وصف قرأت بھی آپ کو دینا اس پر نہایت سہل اور آسان ترین ہوگا، آپ بیک لخت با نوارِ اربعہ کمال منتظر تک پہنچیں گے۔

آگے ترقی کر کے ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ فرمایا کہ انسان کے تعارف

کی حاجت نہیں، وہ ناپاک چیز سے پیدا ہوا ہے، ایسی ناپاک اور گندگی چیز سے کہ مٹی بھی اس سے بہتر ہے کہ خود تو طاہر اور دوسرے کے لیے مطہر ہے، پانی کے قائم مقام ہوتی ہے، تو ارشاد ہوتا ہے کہ ایسی ناپاک چیز کو جب ہم نے وصف قدرت کے اسم قادر وقدیر سے اشرف المخلوقات بنا دیا، جیسے صفت وجود کے لیے اسم جواد اور صفت کرم کے لیے اسم کریم اور علم کے لیے عالم وعلیم، قدرت کے لیے قادر وقدیر، اسی طرح ہر صفت کے اسم موجود ہیں، اور اسم میں اس صفت کی تاثیر اور اثرات ہوتے ہیں۔

تاثیر اسماء الٰہیہ کا عجیب واقعہ

جیسے حسن بصریؒ (۱) کے لیے حجاج (بن یوسف) نے جب جلاد کو قتل کا حکم دیا اور اس نے تلوار اٹھائی تو حضرت حسن بصریؒ نے "یاباطن" کہا، اس اسم باطن کی تاثیر سے وہ مخفی پوشیدہ ہوگئے اور جلاد کو نظر نہیں آئے، اپنا سا منھ لے کر رہ

(۱) حسن بصریؒ: آپ کبارِ تابعین میں سے ہیں، علامہ صفدیؒ فرماتے ہیں: الْحسن بن يسَار الْبَصْرِيّ الْفَقِيه الْقَارئ الزَّاهِد العابد سيد زَمَانه إِمَام أهل الْبَصْرَة بل إِمَام أهل الْعَصْر، حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ۲۲ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت عمرؓ نے اپنے مبارک ہاتھ سے تحنیک فرمائی، آپ کی والدہ حضرت ام سلمہؓ کی خدمت کرتی تھیں اور بسا اوقات آپ کو ان کے یہاں لے جاتی تھیں تو حضرت ام سلمہؓ ان کے منہ میں اپنے پستان رکھتی تھیں، یہ کوئی کم سعادت نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بصرہ آگئے، حضرت علیؓ سے مدینہ منورہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے عابد، زاہد اور ہر فن میں مہارت کے حامل تھے۔ حضرت ابوموسی اشعریؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابنِ عباسؓ وغیرہ سے احادیث روایت کرتے ہیں اور آپ سے تابعین اور تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت روایت کرتی ہے، ۸۹ر سال کی عمر میں رجب ۱۱۰ھ کو شبِ جمعہ میں آپ نے وفات پائی، اور ازدحام کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کی عصر کی نماز فوت ہوگئی، اس دن جامعِ بصرہ میں عصر کی نماز نہیں ہوئی، رحمه الله تعالى رحمة واسعة۔ (الوافی بالوفیات، ج ۱۲ ص ۱۹۱)

گیا، اور تلوار نیچی کرلی، جب نیچی کرلی تو "یاظاھر" کہا: اب اس اسم ظاہر کی تاثیر سے سامنے ظاہر اور نظر آنے لگے، اس نے پھر تلوار اٹھائی تو پھر "یاباطن" کہہ کر غائب، تلوار نیچی کرلی، پھر "یاظاھر" کہہ کر سامنے موجود، اسی طرح بہت سی مرتبہ ہوا، اور حجاج دیکھتا رہا، بالآخر حجاج نے انھیں چھوڑ دیا اور معافی چاہی اور درخواست کی کہ میرے واسطے بددعا نہ کرنا۔

معلوم ہوا کہ ممکن وحادث مخلوق کا استفاضہ بواسطۂ اسمائے الٰہیہ ہوتا ہے، چنانچہ رزق کی کشادگی کے لیے مشائخ اسم "یاباسط" کا ورد بتلاتے ہیں، اور حفاظت کے لیے "یا حفیظ" اور مقدمہ والے کو "یاعزیز"، ان اسماء سے مدد طلب کی جاتی ہے، لیکن حصول مدد کے لیے قوتِ طبع بدرجۂ یقین ہونا لازم ہے، اس لیے صوفیاء کے یہاں اسماء سے ربط قائم کرایا جاتا ہے اوراذ کار کرائے جاتے ہیں، ایک ضربی الله کبھی دوضربی الله، الله، کبھی نفی لا إله إلا الله، کبھی صرف اثبات إلا الله، کبھی لاحول کا ورد کرا کے مخلوق سے ہٹایا جاتا ہے۔

تو یہ لفظِ اسم پر گفتگو چل رہی ہے کہ بظاہر لفظ اسم زائد اور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے صرف "بِرَبِّكَ" کا کہنا بھی تو کافی ہوجاتا، اس کا جواب آپ حضرات کو معلوم ہوگیا کہ یہ اسماء واسطہ ہیں مخلوق وخالق کے درمیان، اسی لیے قرآن پاک میں اس جگہ کے علاوہ بھی اسمِ رب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ارشاد ہے : ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۞﴾ [الأعلى] ، دوسری جگہ ہے: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ [المزمل : ٨] ، چوں کہ اسمائے الٰہیہ میں تاثیرات رکھی ہوئی ہیں، ہر اسم کی خاصیت اور اس کے آثار والوان الگ الگ ہیں، جب صحیح طور وطریق سے اس کا ورد کیا جائے گا، تو اس کے اثرات ضرور ظاہر ہوں گے۔

بہرحال! یہ بات ثابت ہوگئی کہ مخلوق کے لیے اس ذات والاصفات کے

اسمائے صفات واسطۂ فیض وحصولِ فیض ہیں، لہٰذا یہ اسم کا لفظ زائد نہیں بلکہ باء کے قسمیہ ہونے کے احتمال کے لیے رافع بھی ہے، اور یہ بھی بتلانا ہے کہ اسم ہی کے ذریعہ رب سے استعانت اوراعانت ہوتی ہے اس لیے اسم کو یہاں بہ طور واسطہ لایا گیا ہے، یہ اٹھارویں بحث تھی۔

انیسویں بحث

اب انیسویں بحث یہ ہے کہ اسم ذات کے بہ جائے اسم صفت، پھر صفات میں سے صفت ربوبیت کا کیوں ذکر فرمایا؟ یا یہ کہ لفظ اللہ یا رحمٰن وغیرہ کیوں نہیں فرمایا؟۔

سواس کی وجہ یہ ہے کہ صفت ربوبیت کا مطلب کسی شئے کو تدریجاً اور رفتہ رفتہ کمال درجہ تک پہنچادینا ہے، چوں کہ یہ صفت صرف باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منتہائے کمال تک پہنچانے کا ذکر مقصود ہے،جس میں بدرجۂ اکمل واتم علوم کے ذریعہ تربیت بھی داخل ہے جس کا اقرأ میں ذکر ہے، اس لیے یہ صفت ذکر فرمائی ،جس میں اشارۃً بتلانا ہے کہ تم قرأت کو مشکل وبعید نہ سمجھو! تم رب سے استعانت اور مدد طلب کرو، وہ تمھیں کمال انتہائی تک پہنچادیں گے، چوں کہ لفظ رب ہر قسم کی پرورش مادی، روحانی، جسمانی، اعصابی، اعضائی، جاہی، باہی، مالی، جانی ،قلبی،روحانی،عرفانی،تمام اقسام تربیت کو جامع ہے، جب بندہ یا ربیکہتا ہے تو لبیک یا عبدی جواب آتا ہے۔

اس لیے رب کا لفظ بتلا رہا ہے کہ ہم آپ کی کمال تربیت کریں گے اور نبوت کے انتہائی درجات تک پہنچادیں گے، یہ انیسویں بحث تھی کہ صفت ربوبیت کے ذکر میں کیا نکتہ ہے؟۔

بیسویں اوراکیسویں بحث

اب بیسویں اوراکیسویں بحث یہ ہے کہ رب کی صفت ''خلق'' کے ساتھ کیوں ذکرفرمائی ؟ ، اور پھر خلق انسان کی تخصیص کیوں فرمائی ؟ ۔

اس کی تفصیل کان لگاکر دھیان کے ساتھ سنئے ، ﴿الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾﴾ ایک ترکیب اس کی یہ ہے کہ خلق کا مفعول خاص یعنی مخاطب کی ضمیر مقدر ہو، جیسا کہ سیاقِ کلام یعنی ''رَبِّكَ'' اس پر دال ہے، اس صورت میں اولاً تخلیق خاص کا ذکر ہوگا ، ثانیاً تخلیق عام یعنی جنس انسان کی تخلیق کا ہوگا۔

تخلیق انسان میں غوروفکر

نکتہ اس میں یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوخود آپ ہی کی تخلیق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود ناسوتی کو یاددلایا، اوراپنی پیدائش میں غوروفکر کرنے کی طرف متوجہ فرمایا ہے کہ آپ جواس وقت بہ ایں اوصاف ظاہرہ وباطنہ احسن الخلائق اور جسمانی جمال وکمال کے ساتھ متصف ہیں، آپ ایک بشراورانسان ہیں، اورانسان علق یعنی خون کی ایک بے قدر پھٹکی سے بنایا گیاہے، پھر اس خون کی پھٹکی کی بھی اصل اور ابتداکے متعلق سوچا جائے کہ قطرۂ ناپاک، محض نجس اور قابلِ نفرت حقیقت کا حامل ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَكُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا ﴿۱﴾﴾ [الدھر] کہ انسان ایک وقت معدوم محض تھا، ذکر کے قابل اور کوئی چیز نہ تھا، نیزارشاد ہے: ﴿وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِیۡ قَرَارٍ مَّكِیۡنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ٭ ثُمَّ

اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ﴿۱۴﴾ [المؤمنون]۔مٹی کے اجزائے نفیسہ کو غذا کی صورت بخشی جس کو ''سُلٰلَہ'' مٹی کا خلاصہ فرمایا پھر اس کو نطفہ بنایا اور یہ ظاہر ہے کہ غذا براہِ راست قطرۂ منی کی شکل میں نہیں آتی بلکہ غذا قادر مطلق کے تصرفات سے مختلف تغیرات سے گذر کر قطراتِ خون پھر قطرات خون سے کس کس طرح کہیں جا کر قطرات منی تیار ہوتے ہیں۔

پھر مرد اور عورت کے اختلاط سے دونوں ہی کے قطراتِ منی باہم مخلوط ہو کر عورت کے رحم میں ایک مدت تک برقرار رہنے کے بعد قدرتِ خالق کے تصرفات سے خون کی پھٹکی بنتی ہے، پھر یہ خون کی پھٹکی تغیر پذیر ہو کر گوشت کا ٹکڑا ہو جاتی ہے، پھر اس سے ہڈیاں وغیرہ دوسرے اعضاء بنائے جاتے ہیں کہ انسان کا جسم مکمل تیار ہو کر ایک عمدہ شکل وصورت کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کو عورت کے پیٹ سے بہ ایں قدوقامت پیدا فرماتے ہیں۔

انسان کی پیدائش اس طور سے ہوتی ہے، اس ساری تفصیل کو باری تعالیٰ نے اجمالی طور سے ایک جملہ ﴿خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ﴾ میں ارشاد فرما کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی انسانی پیدائش میں غور فرمانے اور سوچنے کی طرف اشارہ فرمایا تا کہ آپ ﷺ اپنی ذات اور اس کے حالات پر نظر فرما کر حق تعالیٰ کی اپنے حال پر قدیمی عنایات اور بہ غایت فضل وکرم کے ساتھ ربوبیت اور تربیت کو ربِّ اکرم کی شان وصفت سمجھ لیں، اور اس کا استحضار فرما کر امرِ قرأت کو نہ تو دشوار ہی سمجھیں اور نہ گھبرائیں، اس ربِّ اکرم کی عنایات پر بھروسہ کر کے شروع فرمادیں، چنانچہ آپ ﷺ نے قرأت شروع فرمادی۔

اس لیے ان دو آیتوں، دو جملوں میں اول آپ کی تخلیق کو اجمالاً بیان فرمایا پھر اس کی من وجہٍ صراحۃً اور من وجہٍ اشارۃً تفصیل فرمائی اور یہ اول اجمال پھر تفصیل کلام کی بلاغت ہے، بلاغت سے کلام مؤثر اور ذہن نشیں ہو جاتا ہے،

چنانچہ تفصیل بعد الاجمال کے متعلق قاعدہ مشہور ہے کہ اس سے کلام اوقع فی النفس ہوجاتا ہے، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تدریجاً معرفت کے منازل طے کرائے گئے کہ اول معرفت نفس کرائی اور اس کے ذریعہ یہ قاعدہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ" (۱) اوپر پہنچا کر عارف رب بنادیا۔

پھر عارف کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہر کام کے اول ہی سے رب قادر وقدیر اور فعال لما یرید پر نظر رکھتا ہے؛ اس بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر اپنے سے ہٹ گئی اور قادر مطلق کی قدرت اور رب تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ پر پڑی، اور فوراً اپنی سی کوشش اور توکل برخدا کے ساتھ قرآت شروع فرمادی، پھر کیا تھا، بس ساری مشکلات کا جھیل لینا سہل اور آسان ہوگیا، اور نصرتِ پروردگار سے سب مراحل طے ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فائز المرام ہو گئے۔

اور اس موقعہ پر کسی عارف کا یہ قول کتنا برمحل ہوگیا : ؎

کوشش وہمت کیے جا، ہاں توکل برخدا	کامیاب آخرت ہونا اگر منظور ہے

غرض ان آیتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلبۂ عجز کو صاف کردیا گیا، اور ان آیتوں کی تلاوت کردی گئی، یہ حکمت تھی صفت خلق کے ذکر فرمانے میں۔

خلق کے مفعول کو حذف کرنے کے نکات

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود تمام

(۱) قال النووي :غير ثابت، وقال ابن السمعاني :هو من كلام يحيى بن معاذ الرازي رضي الله عنه.(الدرر المنتثرة في الأحاديث المشتهرة للسيوطى، ص۱۸۵) وللحافظ السيوطي فيه تأليف لطيف سماه "القول الأشبه في حديث من عرف نفسه فقد عرف ربه"، وقال النجم :قلت :وقع في أدب الدين والدنيا للماوردي، عن عائشة :"سئل النبي صلى الله عليه وسلم :من أعرف الناس بربه؟ قال :أعرفهم بنفسه".(كشف الخفاء، ۳۱۲/۲،رقم الحديث:۲۵۳۲.)

انسانوں بلکہ تمام مخلوقات سے مقدم اور سب کے وجود کا باعث ہے، گویا سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل میں وجود کی دولت سے نوازے گئے۔

علاوہ ازیں اس وصف کی تخصیص میں یہ نکتہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں اول ظہور اسی نعمت کا ہوتا ہے، اسی لیے ذکر میں بھی مقدماً بیان ہوا، نیز خلق دلیل ہے خالق پر اور سب سے اہم واقدم معرفت خالق ہے۔

نیز خلق کا مفعول تعمیم کی خاطر حذف کیا گیا ہے، تو مفعول ایک امر عام ہے، تقدیر عبارت یہ ہے کہ "**خلق المخلوقات**" یعنی آسمانوں، زمینوں اور ان میں چاند، سورج، سیاروں اور زمین میں غذاؤں کو پیدا کیا، یہ سب انسان کی تخلیق سے پہلے خدمت انسان کے لیے بنائے اور پیدا کیے گئے ہیں۔

انسان بعد میں ان سے فائدہ اٹھانے، نفع حاصل کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اے انسانو! تمہارے لیے تمام دنیوی کائنات ومخلوقات کو پیدا فرمادیا اور خادم آگے ہوتا ہے اور مخدوم پیچھے آتا ہے، اس لیے خلق مخلوقات کو مقدم اور خلق انسان کو مؤخر بیان فرمایا گیا۔

نعمت خلق کا بھرپور انعام انسان پر

یا یوں کہا جائے کہ نعمتِ خلق کا زیادہ انعام انسان مخلوق پر ہے، یعنی حق تعالیٰ نے یوں تو ساری ہی بے شمار مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے، اس لیے خلق وتخلیق کی نعمت میں تمام کائنات اور جملہ مخلوقات شریک ہیں، لیکن ان میں سے انسان اس خلق وتخلیق کے اعلیٰ درجے پر فائز اور احسنِ تقویم سے مشرف ہے۔

چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝٤﴾ [التین] کہ ہم نے انسان کو خوبصوتی اور حسن وجمال اور کمال کے اعلیٰ درجے کے سانچے میں ڈھالا ہے، اس کے جسم کی ظاہری ساخت اور بناوٹ

کو دیکھئے !، جانوروں کی طرح نہیں، اس طور پر کہ سر اور چہرہ اور پورا جسم زمین کی طرف جھکا ہوا ہو، بلکہ مستقیم القامت ہے، سر اور چہرہ پورے جسم کے اوپر رکھا، اونچا اور معزز بنایا، اعضاء دیکھئے تو نہایت معتدل، آنکھ ناک کان نہایت مناسب انداز پر رکھے، جانوروں کی طرح نہ کان بڑے بڑے لٹکے ہوئے، نہ بالکل چھوٹے چھوٹے سطح جسم سے ملے اور چپکے ہوئے بلکہ نہایت معتدل، ناک کو دیکھئے کہ نہ ایسی بڑی جیسی ہاتھی کی سونڈ، نہ ایسی دبی اور بیٹھی ہوئی جیسی اور چوپایوں کی بلکہ درمیانی کمیت وکیفیت کے ساتھ پورے اعتدالی انداز پر رکھی۔

اسی طرح دانتوں اور ہونٹوں اور دیگر تمام اعضاء دیکھتے چلے جائیے تو تمامی خلائق میں انسانی جسم کی ساخت بالکل نرالی اور انوکھی شان اور اعلیٰ ترین نقشہ ونشان پر ملے گی، اسی لیے حدیث شریف میں یہ دعاء تعلیم فرمائی گئی کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے اس ظاہری شکل وصورت کو دیکھے، مثلاً آئینہ کے ذریعہ تو عُجب وخود بینی میں مبتلا نہ ہوجائے، اپنے کو اعلیٰ غیر کو ادنیٰ خیال کر کے غرور وتکبر نہ کرے، بلکہ حق تعالیٰ کے فضل وکرم، عطاء وانعام کا استحضار کرے اور اس کی قدر اور اس خصوصی نعمت کا شکر کرے اور مزید فضل وکرم کی درخواست اور عجز ونیاز ظاہر کرے، اپنے کو ہر وقت اس کے دستِ کرم کا محتاج بلکہ سراپا احتیاج ہونا مستحضر کرے، اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں عرض کرے: **اللَّهُمَّ أَحْسَنْتَ خَلْقِي، فَأَحْسِنْ خُلُقِي** (۱) کہ اے اللہ! جیسے آپ نے اپنے جود وکرم سے مجھ ذرۂ حقیر اور نطفۂ بےقدر کو بغیر میرے اختیار کے حسنِ ظاہر اور اعلیٰ جسمانیت سے نوازا ہے، مجھے اس کا استحضار فرما کر میرے اندرون کو بھی باطنی حسن وکمال، اچھے اخلاق وصفات حاصل کرنے میں میرے اختیار کو لگا کر دولت باطنی بھی عطا فرما دیجئے۔

---

(۱) شعب الإيمان، عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضی الله تعالى عنه، فصل في الحلم والتؤدة والرفق في الأمور كلها، رقم الحديث: ۸۱۸۳.

یہ بات ضمناً بیچ میں آ گئی، بات اصل یہ چل رہی تھی کہ انسان دوسری مخلوقات سے بدرجہا اچھی شکل وصورت پر ہے، بس ایک عجیب مورت ہے، یہ تو انسانی تخلیق کے ظاہری رخ کا ذکر تھا، اب باطنی رخ ملاحظہ فرمائیے!، غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان اندرونی اعضاء مثلاً عقل ودماغ میں ساری مخلوق سے بڑھ چڑھ کر ہے، اخلاق واعمال کے وہ مادے اور قابلیتیں اس میں خالقِ اکبر نے رکھی ہیں جن کے ذریعہ خالقِ کائنات کے صفات وکمالات کا یہ مظہراتم بن گیا۔

حدیث خلق اللّٰہ آدم علی صورتہ کا مطلب

یہی وہ بات ہے جس کو حدیث میں خَلَقَ اللّٰہُ آدَمَ عَلَی صُورَتِهِ (۱) (أی ظهوره وصفة كماله وجماله) میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس کے سب سے پہلے فرد حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام ہیں، اس کو اپنی صورت یعنی صفت جمال وکمال پر پیدا فرمایا ہے، تو اوصاف کمالیہ بالقوۃ اس میں ودیعت ہیں، تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰہ (۲) ہے اسی بالقوۃ استعداد وقابلیت سے کام لینے، اور ان صفات کمال کو قوت سے فعل میں لانے کا امر فرمایا ہے، اسی واسطے ساری مخلوق سے اسی انسان کو منتخب کیا گیا اور تمغۂ خلافتِ الٰہیہ سے نوازا گیا، یہاں تک کے بیان سے آپ نے بخوبی سمجھ لیا کہ انسان کو حق تعالیٰ نے کس قدر بہترین شکل وصورت پر پیدا فرما کر احسن الخلائق ٹھہرایا ہے۔

اس میں کیسی قوتیں اور ظاہری وباطنی خوبیاں اس کے وجود میں رکھ دی

(۱)صحیح البخاری،عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَرضی اللّٰہ تعالی عنه،بَابُ بَدْءِ السَّلَامِ،رقم الحدیث:۶۲۲۷.

(۲)فتح الباری فی الذب عن الألبانی، ص ۵۴، الفصل فی الحدیثین اللذین لا أصل لهما.

ہیں، اس کا قوام ایسی ترکیب سے بنایا ہے کہ اگر یہ اپنی صحیح فطرت پر رہ کر ترقی کرے تو ہر مخلوق اس کی برابری اور ہمسری سے عاجز رہ جائے گی، خیر اور بھلائی میں اس قدر ترقی کرے کہ فرشتوں سے بھی آگے نکل جائے، مسجودیت ملائک کی شان کا حامل ہو جائے۔

غرض تمام مخلوقات میں سے اس خاص مخلوق انسان پر زیادہ انعام ہے کہ علق جیسے جماد محض، بے حس، بے شعور، بے علم، بے ادراک کو اس درجہ ترقی عطا فرمائی کہ ظاہری و باطنی جمال وکمال کا جامع بنا دیا، اس لیے ﴿الَّذِیْ خَلَقَ﴾ میں بہ تقدیر مفعول "المخلوقات" ذکر خلائق کی تعمیم کے بعد ذکر انسان کی تخصیص میں انسان کی اہمیت شان پر دلالت ہے اور اس پر تنبیہ ہے کہ انسان اس نعمتِ عظمیٰ اور انعامِ عظیم کو سمجھے اور اس کا تقاضا پورا کرے، اور اس کا تقاضا کثرتِ ذکر اور دوامِ ذکر و اطاعت ہے۔

رفع خطرات عجز کا بیان

اب اس طرح گویا آپ ﷺ کے دل میں اس خطرہ کے آنے کی بندش ہوگئی کہ حق تعالیٰ کا کلام قدیم ہے اور میں اور میرا پڑھنا حادث ہوگا، تو کلام قدیم میری زبان پر کیسے آسکتا ہے؟ ﴿الَّذِیْ خَلَقَ﴾ سے جواب ہو گیا کہ جو پروردگار ہے، وہی خالقِ ہر شئے ہے، پس وہ کلام قدیم کو حروف کی صورت میں لا کر آپ ﷺ کی زبان پر جاری فرمادے گا۔

اور اگر یہ خطرہ ہو کہ کلامِ الٰہی نہایت بلند مرتبہ ہے اور انسان ایک ذلیل چیز سے بنا ہے، تو عزیز، ذلیل کے مقام پر کیسے آسکتا ہے؟ تو یہ سوچئے!، خیال فرمائیے کہ اگرچہ انسان ابتدا میں ایک بے قدر اور ذلیل مادہ تھا لیکن جب ہم نے اس میں تخلیقی تصرفات کیے اور ایک قطرہ سے اعضائے کثیرہ بنا دئے اور وہ

بھی اس شان سے کہ ان سے افعالِ الٰہی صادر ہونے لگے، ہم نے روحِ لطیف اس کے جسم کثیف سے متعلق کردی، وہ بھی اس شان سے کہ لطافتِ روح اور اس کے لطائف اپنی جگہ اپنے مقام پر رہتے ہیں اور کثافتِ جسم اپنی جگہ، ان میں باہم تصادم نہیں، اور یہ سب کا سب ایک ایسے مادے سے بنادیا جو سراسر نجاست اور سراپا ذلت تھا، تو اب اس میں کیا استبعاد ہے کہ کلامِ قدیم کو قوائے متخیلہ اور آلاتِ ناطقہ سے وابستگی بھی عطا فرمادیں اور کلام قدسی اپنی صفتِ ازلیت وقدیمیت پر بھی رہے، یہ گفتگو ﴿الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿۲﴾﴾ کی توضیح وتشریح کے سلسلے میں آگئی۔

مِنْ عَلَقٍ فرمانے کا نکتہ

اب یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انسان کی پیدائش اور تخلیق کے مراحل اوّلیہ میں سے "علق" ہی کو کیوں ذکر فرمایا؟ حالاں کہ اس سے قبل عناصرِ اربعہ سے مرکب غذا مادی اور اس سے نطفہ کی تخلیق ہوتی ہے، پھر علق وعلقہ بنایا جاتا ہے، پھر اس سے مضغہ اور ترکیب عظام اور لحم وشحم وپوست اور نفخِ روح کے مرحلوں سے بھی گذرنا ہوتا ہے۔

سو بات یہ ہے کہ "علق" چوں کہ درمیانی حالت ہے تو گویا یہ لفظ اپنے ماقبل اور مابعد کے تمام حالات کی طرف اشارہ کررہا ہے، مطلب یہ ہے کہ جس رب تعالیٰ نے ولادت سے لے کر اس وقت تک آپ ﷺ کی تربیت عجیب نرالی شان سے فرمائی، جس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ سے بڑا اونچا کام لیا جانے والا ہے، تو کیا وہ آپ ﷺ کو بیچ ہی میں چھوڑ دے گا؟ ہر گز نہیں، اسی کے نام کی برکت ومدد سے آپ کی تعلیم ہوگی تو جس نے آپ کی تربیت جسمانی فرمائی اور جو اتنی زبردست قدرت رکھتا ہے کہ تمام چیزوں کو جو معدومِ محض تھیں اور وجود

سے محروم تھیں، (انھیں) وجود عطا فرما دیا، اور ذواتِ کائنات کو پیدا فرما دیا، کیا وہ تم میں صفت قرأت پیدا نہیں کرسکتا؟ اور جس نے جماد لایعقل کو جیتا جاگتا، چلتا پھرتا، سنتا دیکھتا اور عاقل بنا دیا، کیا وہ ایک عاقل کامل اور ایک امی کو قاری و عالم نہیں بنا سکتا؟ وہ یہ سب کچھ کرسکتا اور ضرور کرسکتا ہے، یہاں تک استبعادِ رفع اور امکان ثابت فرما دیا، جب امکان ثابت ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ یہ امرِ قرأت مستبعد نہیں اور امی کو قاری و عالم بنا دینا مشکل نہیں بلکہ ممکن اور سہل وآسان ہے۔

بائیسویں وتیئیسویں بحث:

﴿ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۝۳ ﴾ لانے کی حکمت

آگے مزید ترقی کے لیے ارشاد فرمایا: ﴿ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۝۳ ﴾ حاصل یہ ہوا کہ جب آپ کو معلوم ہوگیا کہ حق تعالیٰ کی قدرت پر نظر رکھتے ہوئے قرأت کا معاملہ میرے لیے مشکل ومستبعد نہیں تو اب آپ پہلے کی طرح عذر نہ فرمائیں، بس پڑھنا شروع فرمادیں اور کیوں نہیں آپ کا رب تو بڑا کریم اور انتہائی شان کرم والا ہے۔

جس نے آپ کی تربیت اس شان کے ساتھ فرمائی ہے جس سے آپ نہایت عمدہ اخلاق وصفات، اعلیٰ جسمانیت اور خوبصورت شکل وصورت کے ساتھ ہوگئے، چنانچہ بفضلِ خدا حسن صورت اور حسن سیرت کے جامع ہوجانے سے آپ صاحب جمال اور صاحب کمال ہیں، آپ اپنے وطن مکہ شریف کے سب چھوٹوں بڑوں میں نہایت معزز ومحبوب بنے ہوئے ہیں، غرض خالقِ برتر کی شان تربیت اور اس کے آثار سے آپ کی استعداد اور قابلیت پورے طور پر کامل اور نمایاں ہے۔

تو جب ادھر قصورِ استعداد نہیں اور ادھر فیاضِ حقیقی میں بخل نہیں، بلکہ جود

وکرم بلکہ نہایت کرم ہے تو ان کا فیض آپ کو پہنچنے میں کوئی ادنیٰ سا بھی مانع وحائل نہیں۔

لٰہذا ضرور آپ کو قرأت کرا کر دولتِ علم سے مالا مال اور انتہائی کمال سے نوازیں گے، اس لیے آپ سے جس طرح پڑھوایا جائے، بس اسی طرح بلا خوف وخطر اور بے جھجک پڑھتے چلے جائیں۔

چنانچہ آپ (ﷺ) نے ایسا ہی کیا کہ اب عذر نہیں فرمایا بلکہ پڑھنا شروع فرما دیا اور جتنی آیتیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کے سامنے مسلسل تلاوت فرمائی تھیں، وہ سب آپ ﷺ بھی مسلسل بلا اٹک وکھٹک تلاوت فرماتے چلے گئے۔

بخاری شریف کی اس روایت میں تو یہی تین آیتیں اولِ نزولِ وحی کے سلسلے میں مذکور ہیں، لیکن یہ بات محقق وثابت ہے کہ غارِ حراء میں آغاز وحی کے وقت پانچ آیتوں کا نزول ہوا تھا، خود بخاری شریف ہی میں دوسری جگہ یہ پانچوں آیتیں آئی ہیں (۱)، اور دوسری صحاح مسلم شریف (۲) وغیرہ میں بھی پانچ آیتیں بیان فرمائی ہیں، اس لیے تتمیم وتکمیل کے لیے پانچوں آیتوں کی تشریح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

﴿الَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ فرمانے کی حکمت

سو ﴿الَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ کے ذریعہ آں حضرت ﷺ کے لیے اشارہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے لیے علوم وحی کا حاصل ہو جانا بعید ومشکل نہ خیال

(۱) صحیح البخاری، ۲/۷۳۹، کتاب التفسیر، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تعالی عَنْهَا، بَابُ قَوْلِهِ: {اقْرَأْ وَرَبُّكَ الأَكْرَمُ} [العلق: ۳]، رقم الحدیث: ۴۹۵۶.

(۲) صحیح مسلم، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تعالی عَنْهَا، بَابُ بَدْءِ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ، رقم الحدیث: ۲۵۲.

فرماویں، یہ نہ سوچیں کہ پڑھا لکھا آدمی ہی حاصل کرتا ہے، اور میں نے اب تک کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تو اب ایک دم ''میں'' پڑھنے اور علم حاصل کرنے کی قدرت کہاں سے لاؤں؟ ۔ ایسی حالت میں بھلا میں کیسے پڑھ سکتا ہوں، سو یہ کوئی بات نہیں۔

دیکھو! قلم کو بھی تو تعلیم کا ذریعہ ہم نے ہی بنایا ہے، تو اصل سکھانے پڑھانے والے تو ہم ہیں، پھر اپنی مخلوقات میں سے جس وقت جس کے لیے چاہیں، کسی بھی چیز کو ذریعۂ تعلیم بنالیں، جیسے ہم نے عام طور پر قلم کو ذریعہ تعلیم بنایا ہے، اسی طرح خاص آپ ﷺ کے لیے ہم نے ذریعۂ تعلیم جبرئیل کو بنا کر بھیجا ہے، ان کے ذریعہ ہم آپ کو پورے علوم سکھلا دیں گے، آپ مطمئن اور جمع خاطر رہیں، اس تردد وخلجان میں نہ پڑیں کہ آپ امی ہیں، کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تو اب مشکل ہے۔

اس امرِ تعلیم کی پوری ذمہ داری ہماری ہے اور ہمیں کچھ مشکل نہیں، **فان کل عسیر علینا یسیر۔**

تعلیم بالقلم کا بیان

تو تعلیم بالقلم کا ذکر اس لیے فرمایا کہ استعمالِ قلم اور لکھنا جاننا بھی ایک بہت بڑی نعمت اور غنیمت کبریٰ ہے، اسی کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے قلم کی قسم کھائی گئی ہے ارشاد ربانی ہے: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ①﴾ [سورة القلم] چنانچہ عالم میں ہر طرف، ہر کام، ہر کاروبار میں قلم کی کارفرمائیاں دخیل ہیں، انسان اپنی تمام دینیات ودنیویات میں، اپنی معاشیات میں، تجارت وسیاسیات میں باہمی تعاون وتعاضد کا محتاج ہے، چنانچہ معاشیات میں تجارت کے لیے حسابات ضروری ہیں، جو کہ قلم ہی کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

شریعت وسیاست

اسی طرح سیاسیات بھی لازم اور ضروری ہیں، دینی اور شرعی حیثیت سے بھی؛ چوں کہ وہ شریعت نہیں جس میں سیاست نہیں اور وہ سیاست نہیں جو شریعت کے تحت نہیں، گویا شریعت اور سیاست میں باہمی تلازم ہے، ہر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہے، اور سیاست کا شریعت کے تابع اور ماتحت ہونا ضروری ہے، شریعت سے الگ اور دائرۂ شریعت سے باہر سیاست نہیں ہوسکتی۔

معلوم ہوا کہ سیاست چالاکی، مکاری، دھوکہ دہی، فریب کاری اور دغابازی کا نام نہیں، بلکہ حسنِ تدبیر اور حسنِ انتظام کا نام سیاست ہے، غرض سیاست شرعاً ضروری چیز ہے، اسی طرح دنیوی لحاظ سے بھی ہر ذی عقل وفہم کے نزدیک اس کا ہونا بالکل ضروری ہے، چوں کہ بدانتظامی سے ہزاروں آفتیں پریشانیاں آتی ہیں، اس لیے سیاست ملک میں امن وسکون، درستئ انتظام کو مقتضی ہے، بغیر اس کے معاشِ انسانی کی تخریب ہے۔

لہٰذا درستئ معاش کے لیے انتظامیات اور ملکی سیاسیات شرطِ لازمی ہیں، اور ملکی انتظام سیاسی نظام میں ظاہر ہے کہ ہر طرف دفاتر ومحکمہ جات کثیر در کثیر تعداد میں قائم کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔

گاؤں، دیہات کے گلی کوچوں سے لے کر کھیت، باغات، جنگلات، نہروں، پہاڑوں، پُلوں، سڑکوں، قصبوں، شہروں اور چھوٹی بڑی کچہریوں، عدالتوں اور دفترِ صدارت، وزارت وسفارت وشاہی محل تک دیکھا جائے تو آپ کو نظر آئے گا کہ تمام محکمہ جات اور دفاتر قلم ہی کے ماتحت ومحتاج ہیں اور قلم ان سب کا سردار وسرتاج ہے، چنانچہ ہر ملک وحکومت اور دنیا کی ہر ملک وسلطنت اور کارخانۂ بادشاہت کا یہ دستور ہے کہ اپنی اندرونی بات کا اظہار اور اپنے نوکروں اور

رعیت کے لوگوں اور عام پبلک سے براہِ راست اور بہ صورتِ خطاب نہیں کرتے بلکہ بہ ذریعۂ قلم کرتے ہیں۔

چنانچہ محل شاہی کے اندر کی آسامیوں کی تعداد قلمِ سطارت سے، قلعوں، مکانوں، باغوں کی تعداد وشمار کا نظام قلمِ بیوتات سے، نوکروں، ملازموں اور ان کے مناصب ووظائف کو قلمِ بخشی گری سے۔

روزینہ خوروں اور زکوٰۃ وصدقات وخیرات کے مستحقوں کو قلمِ صدارت سے، اندرونِ ملک کے طول وعرض اور تعدادِ مراتب، آبادی وویرانی، دیہات اور تعدادِ انہار وبحار وغیرہ قلمِ تقسیمِ دفاتر سے، مقدار جاگیران قلم وزارت سے، حساب وکتاب کی باریکیوں اور حق داروں کے حقوق کی حفاظت کے لیے سجلات لکھنا، الگ الگ دفاتر سے، دیوانوں، پاگلوں، قیدیوں اور قتل وتعزیر کے مستحق لوگوں کی تفاصیل قیدخانہ وکوتوالی کے دفاتر سے۔

پھر ان اقسامِ دفاتر کے شعبہ جات اور ملحقات کو دیکھا جائے تو بے شمار کارخانے اور محکمے اور دفاتر ملیں گے، حیوانات کے کارخانے الگ ہیں، پھر اس کے شعبے اور مختلف قسمیں ہیں، مثلاً گھوڑوں کے لیے اصطبل، کارخانۂ مرغیاں جس کو آج کل مرغیوں کے فارم کہتے ہیں، کبوتر خانے الگ، مختلف قسم کے طیور اور پرندوں کا کارخانہ جسے آج کل چڑیا گھر کہتے ہیں، نباتات سے متعلق محکمے اور دفاتر الگ ہیں، مثلاً محکمۂ جنگلات، محکمۂ باغات، محکمۂ زراعات، جمادات کے متعلق کارخانے الگ ہیں، کارخانۂ روشنی جس کو پہلے مشعل کہتے تھے، آج کل اس کو محکمۂ بجلیات کہا جاتا ہے۔

دوائی خانے، شفاخانے جن کو آج کل ایجنسی، اسٹور اور ڈسپنسری کہتے ہیں، خزانۂ عامرہ، ٹکسال، محکمۂ معدنیات، جواہر خانۂ تیل جس کو پٹرول بنک کہتے ہیں۔

کارخانۂ رسل وترسیل جس کو ڈاک خانہ کہتے ہیں، کارخانۂ محکمہ تار، ٹیلی فون،

جوتار گھر کہلاتا ہے۔محکمۂ ہوائی اور فضائی جس کو وائرلیس کہتے ہیں۔

کارخانۂ عمارات، کارخانہائے معدنیات : سونا چاندی، لوہا، تانبا، پیتل، المونیم وغیرہ تمام دھاتوں کے الگ الگ کارخانے، ان سے زیورات، برتن، اوزار، ہتھیار اور آلاتِ جدیدہ: جہاز، موٹر، کار، سائیکلوں کے پرزے تیار ہونے کے کارخانے۔

روئی، سوت، اون کپڑوں کے کارخانے اور مِل، گنوں کے کارخانے مِل چینی وغیرہ کے کارخانے۔

ان تمام کارگاہوں اور کارخانوں ملوں کے انتظامات قلم ہی کے ذریعہ ہوتے ہیں، تو یہ سب کے سب انتظامی حیثیت سے قلم ہی کے محتاج ہیں، ان کا انتظام قلم کی کارروائی پر موقوف ہے۔

اور علمی فنی حیثیت سے بھی اور تدوین کتب اور سیکھنے سکھانے کی غرض سے بھی مختلف اور متکثر علوم وفنون بن گئے، مثلاً علمِ الٰہیات جس میں آسمانوں کی تعداد وترتیب اور ان کے احوال وکیفیات کا ذکر ہوتا ہے۔علم الجغرافیہ جس میں زمین کی ہیئت وکیفیت اور دریا، پہاڑ، اقالیم وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔علم المملک والمالک جس میں راستوں، سڑکوں، لائنوں اور ان کے ذریعہ ملکوں سے واقفیت مذکور ہوتی ہے۔علم الاجرا ملکوں کا زمینی، آسمانی طول وعرض بتلایا جاتا ہے۔علم المعاون والبحار، معدنیات وجواہرات کی تفصیلات اور ان کے نکلنے، دستیاب ہونے کے مقامات بتلائے جاتے ہیں۔

یہ دنیوی امور تھے جن کا ذکر کیا جارہا تھا، جیسے ان میں قلم کو دخل عظیم ہے، اسی طرح دینی امور میں غور فرمائیے:

مفتیوں کا قلم عقائد وعبادات ومعاملات وغیرہ میں احکامِ الٰہی بتلاتا ہے، تو قاضیوں ججوں کا قلم معاملات ومعاہدات وغیرہ میں احکام الٰہی کا نفاذ کرتا ہے۔

فرائض والوں کا قلم سہام وارثین بتلاتا ہے، علاوہ ازیں مصنفین، مؤلفین، مؤرخین کا قلم متقدمین کے علوم اوران کے حالات متأخرین کو پہنچاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ قلم صیادِ علوم، کاسِب ہر منطوق ومفہوم ہے اور نہایت فخیم، بہ غایت عظیم، نعمتِ بے بہا اور دولتِ بے انتہا ہے۔

اسی لیے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے: **الْقَلَم نعْمَة من الله عَظِيمَة لَوْ لَا الْقَلَم مَا قَامَ دين وَلم يصلح عَيْش وَالله أعلم بِمَا يصلح خلقه** کہ اگر قلم نہ ہوتا تو دین قائم نہ رہتا اور زندگی بھی صحیح اور درست نہ ہوتی (۱)۔

تو گویا اس جملہ میں یہ بھی اشارہ ہوا کہ علم کتابت سے اور لکھ کر مقید ومحفوظ کیا کرو، چنانچہ حدیث شریف **قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ** (۲) اسی کی تعبیر ہے یعنی اس اشارت کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

غرض بہ خوبی ثابت ہو گیا کہ تمام دفاتر اور محکمات قلم ہی کے ماتحت اور محتاج ہیں، قلم ہی ان سب کا سرتاج ہے، اور قلم تقدیر کو اور اس کے آہنی، آسمانی فیوض کو دیکھا جائے تو عقل حیران رہ جائے، اس آیت شریفہ میں قلمی احسانات اور انتظامی

---

(۱) الدر المنثور في التفسير بالماثور، ۶۲۱/۱۴، تحت قول الله تعالى: ﴿ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾۔

(۲) وبالجملة ففي الإذن في الكتابة أحاديث. منها ما عند الطبراني وأبي نُعيم في الحلية وغيرهما عن ابن عمرو مرفوعا، بلفظ :قيدوا العلم بالكتاب، وعند العسكري من حديث عبد الحميد بن سليمان حدثنا عبد الله بن المثنى عن ثمامة عن أنس مرفوعا :ما قيد العلم بمثل الكتابة، وقال لُوَين راويه عن عبد الحميد إنه لم يرفعه غيره، وقال العسكري :ما أحسبه من كلام النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وأحسب عبد الحميد وهم فيه، وإنه من قول أنس، فقد روى عبد الله بن المثنى عن ثمامة، قال :كان أنس يقول لبنيه :يا بني قيدوا العلم بالكتاب، قال: فهذا علة للحديث (المقاصد الحسنة في بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسنة للسخاوی، ص ۱۰۹، حرف الهمزة)

وعلمی انعامات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ قلم کے ذریعہ تعلیم وحی کے مشابہ ہے، چوں کہ اول معانی ذہن میں پھر الفاظ خیال میں، اس کے بعد تحریر ونقول میں، اسی طرح اول کلام نفسی خدا تعالیٰ کی ذات میں پھر لوح محفوظ میں الفاظی شکل ہوتی ہے، پھر حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ آں حضرت ﷺ کے متخیلہ پر آتے ہیں پھر آپ ﷺ کے ذریعے امت کو پہنچتے ہیں۔

غرض حضرت جبرئیلؑ مثلِ قلم ذریعۂ علم ہیں، اور ذریعۂ علم عالم سے افضل نہیں ہوتا تو جیسے قلم کو عالم پر فضیلت نہیں، ایسے ہی جبرئیلؑ مانندِ قلم اور ذریعۂ علم ہیں، ان کی بھی فوقیت وفضیلت لازم نہیں آتی، آپ ﷺ کے مقابلے میں ان کا افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

سورۂ اقرأ کی پانچویں آیت کی تشریح

اس کے بعد ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵﴾ میں گویا یوں ارشاد ہے کہ یہ بھی تو ملاحظہ فرمائیے کہ انسان کا بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، وہ بھی تو امی محض ہوتا ہے، اس کو دودھ کا چوسنا اور اس محل شیر پر منھ لگانا یہ کون سیکھاتا ہے؟ اسی پر بچہ کے دوسرے حالات کو قیاس کرلیا جائے، اس وقت علم سے مناسبت بھی بالکل نہیں ہوتی، علم سے کسی بھی قسم کا تعلق نہیں رکھتا، اس کو بھی تو رفتہ رفتہ ہم بہت سی چیزوں کا جاننے والا بنا دیتے ہیں۔

لہٰذا یہ خیال فرمائیے کہ جو خالق اور ربِ قدیر اپنی قدرت وربوبیت سے ایک بچے اور جاہل محض کو عالم بنا دیتا ہے وہی آپ ﷺ کو امی سے عارفِ کامل اور عالمِ وحی، تمام عارفوں اور عالموں کا سردار، علمِ اوّلین وآخرین کا علم بردار بنا دے گا۔

سورۂ علق یعنی سورہ اقرأ کی تفسیر وتشریح ختم ہوئی اور اسی کے ذیل میں بائیسویں اور تئیسویں بحث تھی کہ اقرأ کا تکرار کیوں فرمایا؟ اور رب کی صفت اکرم کیوں لائے؟۔ لہٰذا آپ اس طرف خیال فرمائیں اور اس کی اس عظیم شان وصفت کا استحضار فرمائیں تو آپ کو کچھ مشکل ودشوار نہیں رہے گا۔

کل زندگی بخیر رہی تو ان شاء اللہ چوبیسویں بحث حدیث شریف کے جملہ ''یَرْجُفُ فُؤَادُهُ'' سے متعلق ہوگی، بتوفیقہٖ تعالیٰ بیان کی جائے گی۔

حق تعالیٰ ہمیں احادیث کی صحیح فہم وبصیرت عطاء فرمائیں اور وحی جلی وخفی کے تقاضوں کے موافق زندہ رہنا اور انھیں کے موافق مرنا نصیب فرمائیں۔ (آمین)

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

وصلی اللہ علیٰ خیر خلقه سیدنا محمد وعلیٰ اٰله واصحابه اجمعین(آمین) یارب العالمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

فتاوی مفتاح العلوم المعروف بہ فتاویٰ نصیریہ
اہل خیرحضرات کی توجہات کا منتظر

سرزمینِ جلال آباد (جامعہ مفتاح العلوم) سے مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمہ اللہ کے زیر سایہ صادر ہونے والے فتاوی کا مجموعہ بنام: ''فتاوی مفتاح العلوم المعروف بہ فتاوی نصیریہ'' بحمد اللہ طباعت کے لیے تیار ہے، وابستگانِ مفتاح العلوم، تلامذۂ مسیح الامت اور متعلقینِ مفکر ملت، ان فتاوی کی اہمیت وعظمت اور ضرورت ومقبولیت سے بخوبی واقفیت وشناسائی رکھتے ہیں کہ یہ گنجینہ فقیہ وقت ،مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ سابق استاذ حدیث وفقہ وصدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد کے قلم سے نکلے ہوئے فتاوی کا مجموعہ ہے، ان فتاوی کو ملک وبیرونِ ملک اہل علم واصحابِ افتا اور کبار علما کا اعتبار واستناد حاصل رہا ہے، صدورِ فتاوی کے اس دور کے دار الافتاء جلال آباد کا وہ وقار اور عظمت کسی بھی اہل علم ودانش سے مخفی نہیں ہے، جو حضرت مسیح الامت اور جبال علم وفن کی وجہ سے حاصل رہا، فتاوی کا یہ مجموعہ تقریباً سات جلدوں میں منقسم ہو کر تخریج وتعلیق، تحشیہ وتحقیق کے معیاری منہج کے مکمل اہتمام کے ساتھ منظر پر آیا چاہتا ہے۔

اگرچہ فتاوی کی اشاعت کا سلسلہ پہلے سے شروع تھا (جیسا کہ دو جلدیں منظر عام پر بھی آچکی) ؛ مگر وہ محدود، اور اپنے مذکور عناوین کو محیط نہ تھا، جس کی وجہ سے بہت سا مواد اشاعت وطباعت سے رہ گیا، نیز یہ مطبوعہ حصہ تخریج وتعلیق کے اعتبار سے بھی ناتمام رہا۔

اس تعلق سے اہل علم کے مسلسل اصرار وفرمائش کی وجہ سے صاحب فتاوی کے فرزند ولخت جگر حضرت مولانا محمد کامل صاحب مدظلہ العالی ناظم اعلی ادارہ فیض مسیح الامت بڑوت نے اس طرف توجہ دی اور ماہر وجید مفتیان کرام کی خدمت سے یہ ایک اہم کام اپنے اختتام کو پہنچا دیا، (شائقین اس کی مکمل تفصیلات صاحبِ فتاوی کی سوانح ''تذکرۂ نصیر'' میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں) اس مجموعہ کو دار العلوم دیوبند ومظاہر علوم سہارن پور اور دیگر کبار اہل علم واصحاب افتا کی تحریرات وتقریظات سے بھی مزین کر دیا گیا ہے جس سے مجموعہ کی افادیت ونافعیت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

امید ہے کہ مخیرین اور اصحاب فضل، قدردانِ علم اور شائقین کتب ومعاونین حضرات اس طرف توجہ فرمائیں گے، کہ یہ عظیم کام اہل خیر کی توجہات سے ہی قارئین کی دست بوسی کر سکے گا، اللہ رب العزت اس کی طباعت واشاعت کو آسان بنائے، قبولیت عام وتام فرمائے، اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔! آمین ثم آمین یارب العالمین۔

تفصیلات کے لیے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔
+ 91 7078918086
+ 91 9927751027

زیر نظر جدید ترتیب حضرت کے خلیفہ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب لاجپوری — دامت فیوضہم — کی سرپرستی و نگرانی میں متعدد حضرات کی محنتوں اور عرق ریزیوں کا ثمرہ و نتیجہ ہے، جو آج ہمارے سامنے ایک خوب صورت و حسین گل دستے کی شکل میں موجود ہے اور اس میں ان حضرات نے ماشاء اللہ متعدد امور کا لحاظ واہتمام فرمایا ہے:

(۱) پوری کتاب کو از سر نو کمپیوٹر سے کتابت کرا کر اس کے ظاہری حسن کو بھی دوبالا کر دیا گیا ہے۔

(۲) احادیث کی تخریج کا اہتمام کر کے اس کے باطنی جمال کو مزید نکھار دیا ہے۔

(۳) احادیث کے علاوہ جہاں فنی موضوعات پر کلام ہے، اس کو بھی متعلقہ کتابوں سے مدلل کیا گیا ہے۔

(۴) کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ آیا ہے، ان کا مختصر و جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔

(۵) بعض جگہ علمی موضوعات پر مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ان امور کی وجہ سے کتاب کی افادیت دوبالا ہوگئی اور لوگوں کے لیے اس سے استفادے و انتفاع میں بھی سہولت ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم و مدت فیوضہم
(بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم بنگلور)

حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب کے قدم اٹھاتے ہی توفیق ایزدی شامل حال ہوئی اور رفقائے کار کی ایک جماعت مل گئی، جس نے اس کام کو خوب سے خوب تر بنانے میں جہد مسلسل اور محنتیں صرف کیں، رفقائے کار کی اس جماعت (مولانا خلیل احمد قاضی صاحب لاجپوری، مولانا محمد کلیم نعمانی نواسۂ گرامی حضرت مفکر ملتؒ، مولانا عظیم الدین صاحب تراج گجرات) کا یہ کام (جس کی مکمل تفصیل حضرت مولانا نے اپنے مقدمے میں بڑی جامعیت کے ساتھ رقم فرمائی ہے) حوصلہ افزا، قابل تحسین اور لائق مبارک باد ہے، خاص طور پر مسرت پر میں اضافہ کا باعث ہے کہ نوجوان فاضل عزیز گرامی مولانا محمد کلیم نعمانی حفظہ اللہ کی مساعی جمیلہ سے فضل الباری کا غیر مطبوعہ حصہ بھی اس میں شامل ہو گیا، جس سے اس کی افادیت میں یقیناً مزید اضافہ ہوگا ان شاء اللہ۔

حضرت مولانا محمد وصی اللہ خان صاحب (آرزو میاں) مدظلہ
ناظم جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد شاملی

ہماری اہم مطبوعات

